Bachelor of Arts Program (B.A. Urdu)

DCEUR-103 (N) Urdu Sahafat (VIth Semester)

**بلاک۱- ساتواں پرچہ: اردو صحافت**

اکائی۱: صحافت: تفہیم و تعریف اور خصوصیات

اکائی۲: صحافت کی اہمیت و ضرورت

اکائی۳ :اردو صحافت کا آغاز و ارتقا

اکائی۴: جنگ آزادی اور اردو صحافت

**بلاک۲-**

اکائی۵: خبر نویسی، اداریہ نگاری، رپوتاژ، کالم نویسی، فیچر نگاری

اکائی۶: پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا

اکائی۷: پریس کانفرنس اور رپوٹنگ

اکائی۸: صحافی کے اوصاف

**بلاک۳-**

اکائی۹: مولوی باقر بحیثیت صحافی

اکائی۱۰: مولانا محمد علی جوہر بحیثیت صحافی

اکائی۱۱: مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت صحافی

اکائی۱۲: حسرت موہانی بحیثیت صحافی

# اکائی-1: صحافت-تفہیم وتعریف،خصوصیات

ساخت


1.1 تمہید

1.2 صحافت-تفہیم وخصوصیات

1.3 قدیم طریقۂ خبر رسانی

1.4 صحافت کے اغراض ومقاصد اور کردار

1.5 صحافت کی تاریخ وارتقا

1.6 خلاصہ

1.7 فرہنگ

1.8 سفارش کردہ کتب


## 1.1 تمہید

صحافت کی حیثیت بدن کے اندر آنکھ جیسی ہے۔ جو جسم کے سارے اعضا کی دیکھ بھال کرتی ہے۔صحافت کا کام بھی سماج و معاشرے پر نظر رکھنا اور وقوع پذیر سانحات وواقعات کی خبر گیری اور عوام تک اس کے اثرات کو پہنچانا ہے، مزید عوام کو باخبر و بیدار رکھنا ہے، صحافت کے فروغ میں ملک وقوم کی ترقی و بہبود مضمر ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں صحافت کا آغاز اٹھارہویں صدی میں انگریزی صحافت سے ہوا۔اس کے بعد بنگالی صحافت کی داغ بیل پڑی۔تیسرے نمبر پر اردو صحافت کا آغاز ہوا۔سب سے پہلے اخبار کا آغاز میسور میں ٹیپو سلطان کے اخبار ''فوجی اخبار'' سے ہوا۔ جو 1794 میں جاری ہوا۔اس کا مقصد فوج کو تربیت دینا اور پل پل کی خبر پہنچا کر انھیں منظّم کرنا تھا۔ جو 1799 میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے ساتھ بند ہو گیا۔اس کی حیثیت مقامی تھی۔اس لیے صحافت کی تاریخ میں ''دہلی اردو اخبار'' کو اوّلیت حاصل ہے۔

اس اکائی میں صحافت اور اردو صحافت کی تعریف وخصوصیات سے بحث کے بعد صحافت کے ابتدائی وقدیم طریقے پر روشنی ڈالی گئی ہے اور صحافت کے اغراض ومقاصد سے بحث کی گئی ہے۔اس کے بعد باقاعدہ صحافت کی تاریخ کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ مجوزہ عنوانات کے تحت اُردو صحافت کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے اور اخبارات کے ابتدائی نقوش کی نشاندہی کی گئی ہے۔

## 1.2 صحافت-تفہیم وخصوصیات

صحافت کی حیثیت باقاعدہ ایک فن کی ہے۔صحافت کا اطلاق،علمی صحافت، ادبی صحافت اوراخباری صحافت پر ہوتا ہے۔ لفظ''صحافت'' عربی لفظ''صحف'' کامشتق ہے،جس کی واحد''صحیفہ'' آتی ہے۔فیروز اللغات میں صحیفہ کے معانی کتاب،رسالہ،ورق، لکھا ہوا،صفحہ نیز چھوٹی کتابیں جوبعض پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔اولاً تخلیق کائنات کے بعدنظام عالم کی تہذیب وتنقیح کے لیے انبیاو رسل پر نازل کتابوں کوصحیفے کا درجہ دیا گیا،جس میں توریت، زبور، انجیل ،قرآن وصحف ابرہیم نیز ہندو مذہب کے چار وید، پران وغیرہ۔بعدازاں صلحا،علما،فضلا واکابرین کے فرمودات وتعلیمات اور ہدایات ہیں جوملک وقوم کی اصلاح اورامن وآشتی کے لیے منصۂ شہود پر وقتاً فوقتاً آتی رہی ہیں۔ابتدا میں برگزیدہ بندوں کے اقوال برائے پندونصائح پتھروں، پتوں،لکڑیوں اور چمڑوں پرتحریر کیے جاتے تھے،جوقبل ازتاریخ رشدوہدایت کا ذریعہ تھے۔

لوح وقلم کا ذکرآسمانی صحیفوں میں بھی ملتا ہے جوعلوم وفنون کودستاویزی صورت میں محفوظ کرنے اوردوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ان ذرائع کا استعمال قدیم زمانے میں رضا کارانہ طور پر ہوتا تھا۔تاریخی دور میں اس کی نوعیت مختلف ہے۔ اخلاقی وسماجی فرائض کے علاوہ اس کا التزام سیاسی ،اقتصادی اورتعلیمی بھی ہے۔اب صحافت کواس کی خصوصیت کے باعث تین الگ الگ خانوں میں تقسیم کرکے ان کے نکات پرغوروفکر کی ضرورت ہے۔ ہردور کے تقاضے مختلف ومتنوع ہوتے ہیں۔انسانی زندگی کی تزئین کاری کے لیےعلمی صحافت ایک مربی ومرشد کی حیثیت کی حامل ہے،جبکہ عادات واطوار،طرز گفتاراورنشست وبرخاست کے انداز کوجاذب نظر بنانے میں ادبی صحافت نہایت اہم کردارا کرتی ہے۔اس کے علاوہ حالات دنیا اور ملک وقوم کی صورت حال سے واقفیت کےفرائض اخباری صحافت انجام دیتی ہے۔یہاں پرہمیں علمی صحافت اورادبی صحافت پرمختصراً گفتگو کے بعداخباری صحافت اور اس کے نکات سے بحث کرنی مقصود ہے۔علمی صحافت کا اطلاق تمام شعبہ ہائے زندگی پر ہوتا ہے۔معاشیات،عمرانیات اورسیاسیات اس کے خاص میدان ہیں۔یہ تینوں میدان ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں اوران پرمشتمل قدیم حکیموں اور باکمالوں کی ضخیم تصنیفات موجود ہیں جواپنے اپنے ذیلی متعلقات کومحیط ہیں۔قدیم فلسفیوں،حکیموں اوردانا ؤں نے زندگی کے سبھی شعبوں کی ضروریات پرغوروفکر کیا اوراپنی دانائی ورسائی کے نمونے برائے تکمیل حیات چھوڑ گئے۔ابن سینا، فارابی ، افلاطون، ارسطو،سقراط، ابن خلدون وغیرہ کے دانش ورانہ خیالات وتصورات اورنظریات زندگی کے تمام شعبوں کوفیض پہنچارہے ہیں۔رازی،غزالی، رومی،سعدی کی علم دانی نے علمی دنیا کوروشنی بخشی۔ان کی شاہکارتحریروں نے انفس وآفاق کے معاملات ومسائل وعقدہائے زیست کوحل کرنے کے لیے کلید کی حیثیت واہمیت اختیارکرلی ہے۔القانون،مقدمہ ابن خلدون،الغفران،اللزومات اورریاست جیسی تصنیفات علمی دنیاوعلمی صحافت کی آبیاری میں طاق ہیں۔سیرابی عقل ودماغ اورعلمی پیاس بجھانے میں اکسیرحیات کا کام کرتی ہیں۔

میرؔ، بیدلؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور ٹیگورؔ جیسے بلند پایہ نظریہ سازتخلیق کاروں نے حکمائے قدیم وفضلائے کریم کی دانش وبینش سے استفادہ کیا اوراپنے بعدآنے والی نسلوں کے لیے بیش بہاعلمی موتی اکتساب فیض کی غرض سے چھوڑ گئے۔میروغالب کی تخلیقات جہاں خارجی وباطنی مسائل سے نبردآزماہیں وہیں اقبال وٹیگور کے شاہکارنغمے روحانیت کوچھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جنھوں نے

اپنے اسلاف کی علمی میراث کو اپنے فن کے ذریعے آنے والی نسلوں تک منتقل کیا۔ جسے علمی فن صحافت کے زمرے میں رکھا جائے گا۔ صحافت کی یہ شاخ ہمیں اپنے اسلاف کے علمی خزینے تک پہنچاتی ہے۔ جن کا اثر براہ راست ہماری عمرانی وسماجی زندگی پر پڑتا ہے اور ذوق سلیم کی آبیاری ونشوونما ہوتی ہے۔ جس سے ایک بہتر، شائستہ، پروقار اور زندہ سماج کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔

ادبی صحافت اور اردو کی ادبی صحافت کا تعین قدرے آسان مرحلہ نہیں ہے۔ اردو کی ادبی صحافت کا ایک سرا عہد وسطیٰ کی فارسی صحافت سے جڑتا ہے۔ جس کی روایت غیر منقسم ہندوستان، بنگلہ دیش اور مغلیہ عہد سے ملتی ہے۔ ذرا سا غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان اور اردو زبان کی ادبی صحافت کے سفر کا آغاز خالص ہندوستانی اور قدیم ہے۔

دراصل اردو کی ادبی صحافت کا آغاز اور منشا فارسی کی قدیم ادبی صحافت کی تجدید وتوسیع تھا۔ مغل سلطنت پر انگریزی تسلط کے بعد مغربی علوم وفنون نیز مشنریوں نے اپنا جال پھیلانا شروع کیا۔ مغربی تہذیب وثقافت کی نمائش نے ہندوستانیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا تو ہندوستان کے نگہ بلند وجاں پرسوز واہل فکر ونظر نے ہم وطنوں کی بھلائی اور اصلاح کے لیے رسائل وجرائد اور کتب کا سہارا لیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ایک مخلوط تہذیب کی ابتدا ہو چکی تھی، یہاں کی قدیم تہذیب اور زبان پر عربی و فارسی کے اثرات کافی حد تک پڑ چکے تھے۔ لہٰذا ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑی، انگریزوں کی آمد نے اس نئی زبان کو مزید نشوونما کا موقع دیا۔ اس طرح اردو زبان وادب کی آبیاری ہوئی اور ملک وقوم کی اصلاح وفلاح کے لیے متعدد تحریکیں، ادارے اور رسائل جاری ہوئے۔ ان رسالوں میں مذہبی، علمی اور ادبی مضامین شائع ہوتے جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ بعض رسالے نظم ونثر اور دوسری اصناف کو بھی جگہ دیتے جو افکار وعقائد اور اخلاق واقدار کی پاسبانی وپرورش کرتے۔ مشرقی تہذیب وتمدن اور ان کی بقا ان کا مطمح نظر ہوتا۔ ان ادبی رسائل سے وابستہ صحافی ملک وقوم وسماج کی قیادت کرتے تھے۔ اپنے رسالوں کے ذریعے قومی بیداری ورائے عامہ کو ہموار کرتے۔ ان کا مقصد کسی گروہ نہیں بلکہ انفرادیت کے برعکس اجتماعیت کو برقرار رکھنا اور فکر وشعور کو پختہ کرنا تھا۔ حالانکہ طباعت کے ذرائع محدود تھے بعض رسالے قلمی ہوا کرتے تھے، تاہم پھر بھی باذوق صحافیوں نے اپنی جمالیاتی حس کا ثبوت دیتے ہوئے رسالوں کی آرائش وزیبائش کا اور حسن وتزئین کا مکمل خیال کرتے تھے۔ آزادی سے قبل شائع ہونے والے چند رسالے حسب ذیل ہیں جنھوں نے اخلاقیات پر اپنے اثرات ڈالے اور ذہن سازی کا کام انجام دیا۔

1. ''تہذیب الاخلاق'' سرسید احمد خاں کا رسالہ ہے۔ اس رسالے میں چھپنے والے مضامین علمی، ادبی اور مذہبی ہونے کے علاوہ معاشرتی بھی ہوا کرتے تھے، تہذیب الاخلاق آج بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع ہوتا ہے۔
2. ''الندوہ'' علامہ شبلی نعمانی کی سرپرستی میں لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ علامہ شبلی کے معاونین میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسی شخصیات تھیں، اس سے رسالے کے معیار ووقار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ الندوہ خالص ادبی صحافت کا نمونہ تھا، تاہم اس میں علماء، شعراء وادبا کے وقیع مضامین شائع ہوتے تھے جو بہ یک وقت علم وادب کی نمائندگی کرتا تھا۔
3. ''معارف'' اس کے مدیر مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔ یہ رسالہ اعظم گڑھ، دارالمصنّفین کا ترجمان تھا۔ یہ رسالہ آج بھی جاری ہے لیکن اب وہ بات نہیں جو ندوی صاحب کے زمانے اور ان سے قریب مدیران کے وقت میں تھی۔

5. ''صدق'' یہ رسالہ مفسر قرآن عبدالماجد دریابادی کی ادارت میں نکلتا تھا۔

6. ''مخزن'' یہ رسالہ اردو ادب کے فروغ کا ایک کامیاب رسالہ تھا۔ جو نہایت معروف ومقبول تھا۔ لاہور سے شائع ہونے والے اس رسالے کے مدیر سر عبدالقادر تھے۔

7. ''اردوئے معلیٰ'' علی گڑھ کا ترجمان رسالہ تھا، جو حسرت موہانی کی ادارت میں نکلتا تھا اور اردو زبان وادب کی ترویج وتبلیغ میں بڑی خدمت کر رہا تھا۔

8. ''نگار'' نیاز فتح پوری کی ادارت میں نکلنے والا معیاری جریدہ تھا جو علم وادب کی صحافت کا بڑے پیمانے پر فروغ کر رہا تھا۔

9. ''نیرنگ خیال'' حکیم یوسف حسن کا تاریخ ساز رسالہ تھا۔

10. ''نیا ادب''، ''ادب لطیف'' اور ''نیا سویرا'' جیسے رسالے ترقی پسند تحریک کی دین تھے۔ مذکورہ بالا رسائل کے علاوہ بھی رسائل تھے جو اپنے اپنے طور پر ادبی صحافت کا فریضہ انجام دے رہے تھے، مذکورہ رسائل ادبی صحافت کے ساتھ ساتھ، علمی مضامین اور معاشرتی کوائف پر مبنی تفصیلات بھی شائع کرتے تھے۔ نیز سیاسی حالات وواقعات کو اپنے ادبی انداز میں کبھی طنز ومزاح کی صورت میں پیش کیا کرتے تھے۔

تقسیم ہند وپاک کے بعد سرکار وعوام کا مزاج بدلا۔ حالات میں تبدیلی آئی ذہنی بٹوارہ ہوا تو رسائل بھی مشکوک ہوگئے۔ بے جا شک کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ تقسیم کے سبب پوری اردو کی ادبی صحافت پر انتشار وبحران کی کیفیت طاری ہوگئی۔ صحافتی ادارے زوال کا شکار ہوگئے۔ اردو زبان وادب اور تعلیم آہستہ آہستہ بے توجہی کا ہدف بن گئی۔ تاہم گنگا جمنی تہذیب، صدیوں کی مشترکہ ورنگارنگ ثقافت واقدار کی محافظ اردو زبان وادب کی بقا کے لیے سرکار واقتدار میں شامل ابوالکلام آزاد نے اپنے عالمانہ، ادیبانہ اور صحافیانہ کردار کی بھرپور انداز میں نمائندگی سے عظیم کام کیا اور ادبی صحافت کی متزلزل بنیاد کو گرنے سے بچایا اور اپنے نئے اسلوب خطابت وتحریر سے دلفریب چاشنی بھردی۔ حالات کی تاریخی تبدیلیوں نیز غیر اردو زبان کے چلن نے اردو کی مقبولیت عام کو نقصان پہنچایا۔ روزگار کی جستجو و تلاش نے اردو زبان وادب کو قوت بخشنے والی عربی وفارسی زبان سے عوامی تعلق منقطع ہونے لگے جس کے سبب اردو کی ادبی صحافت پر نہایت برا اثر پڑا۔ قدیم صحافت کی علمیت وادبیت اپنی تاثیر کھوتی چلی گئی۔ علمی وادبی معیار گرا۔ محاوروں ولفظوں کی عدم واقفیت نے جملوں کی ساخت ومعانی کو مثبت سے منفی معنی پہنائے جس سے سماج کے مذاق ومعیار میں سطحیت آئی۔ آزادی کی جنگ لڑنے والی اردو صحافت، عوام کو ایک سمت دینے والی یہ صحافت پستی میں چلی گئی، جس کی وجہ سے آج ثانوی درجے کی صحافت سمجھی جاتی ہے۔ قدیم علوم وادبیات سے تہی نئی نسل کے ادبا وشعرا اور صحافیوں کے گرتے معیار نے صحافت کے اصل مقصد ومدعا اور موقف سے بیگانہ کردیا۔ وہ مصلحت کے شکار ہوگئے۔ مصلحت کوشی نے انھیں متضاد خیالات ونظریات کا ترجمان بنادیا جو کسی خاص گروپ یا جماعت کے نمائندے بن گئے اور مفاد پرستی کی بیماری سماج میں عام ہونے لگی۔ بے رخی بڑھنے لگی۔ صارفیت کی فضا پیدا ہوئی۔ تاہم یہ خیال عام ہے کہ ہر صدی میں کچھ بہی خواہان ملک ومصلحین قوم پیدا ہوتے ہیں جو سماج کی بے لوث خدمت وترقی کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ جن کی سعی وجہد سے ادارے قائم ہوتے ہیں جن کی حیثیت سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی ہوتی ہے۔

آزادی کے بعد بے شمار رسالے جاری ہوئے جن کا تعلق کسی خاص شخصیت یا ادارے سے رہا ہے اور آج بھی نئے نئے رسالے متعارف ہو رہے ہے۔ بیسویں و اکیسویں صدی میں اردو کی ادبی صحافت کا رخ بدلا ہے۔ اردو زبان و ادب کو کہیں نہ کہیں مقبولیت ملی ہے۔ سرکاری سطح پر اردو کو فروغ دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جامعات میں اردو کے شعبے کھل رہے ہیں۔ نئے نئے کورسز متعارف ہو رہے ہے۔ آزادی کے بعد اردو رسالے جو میدان میں آئے ان میں چند کے نام یہ ہیں۔

1. ''آج کل'' یہ رسالہ جوش ملیح آبادی کی ادارت میں شروع ہوا تھا۔
2. دہلی اردو اکادمی کا رسالہ ''ایوان اردو'' ہے جس کا شمار اردو کے معیاری ماہناموں میں ہوتا ہے۔
3. نئی دہلی، مکتبہ جامعہ کا ماہنامہ ترجمان ''کتاب نما'' ہے۔
4. جدیدیت کا ترجمان رسالہ ''شب خوں'' الٰہ آباد سے جاری ہوا تھا۔
5. جامعہ اردو کا ترجمان ''ادیب'' بھی معیاری میگزین ہے۔
6. قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والے رسالے ''اردو دنیا''، ''فکر و تحقیق'' اور حال ہی میں بچوں کا رسالہ ''بچوں کی دنیا'' جاری ہوا ہے۔

اس کے علاوہ متعدد رسالے ''اردو ادب'' علی گڑھ، نوائے ادب، ممبئی، معیار پٹنہ، صبح نو پٹنہ، صنم پٹنہ، تہذیب پٹنہ، شاعر بمبئی، روح ادب، اردو اکادمی بنگال، زبان و ادب بہار اردو اکادمی پٹنہ، آئینہ بمبئی اور نقوش و فنون بھی بمبئی سے جاری ہوئے۔ سہیل گیا سے جاری ہو کر بند ہو گیا تھا۔ آج کل پھر کلکتہ سے شروع ہوا ہے۔

آزادی کے بعد یہ سارے رسالے اردو کی ادبی صحافت کی آبرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شمع اور بیسویں صدی، خاتون مشرق وغیرہ رسالے عوامی رائے عامہ و عوامی مقبولیت کے رسالے ہیں۔ جنہوں نے ادبی صحافت میں حصہ لیا۔ مندرجہ بالا رسالوں نے اردو ادب و صحافت کے لیے گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اب تو اردو صحافت ہندی اور انگریزی کے شانہ بشانہ چلنے کا دعویٰ کر رہی ہے جو خوش آئند بات ہے۔ جسے نیک فال سمجھنا چاہیے۔

''اخباری صحافت یا اخبار نویسی کے متعلق میتھو آرنلڈ کا خیال کچھ اس طرح ہے (Journalism is Literature But in Hurry) صحافت جلدی میں تیار کیا ہوا ادب ہے۔''

صحافت کسی بھی طرح کی ہو، اس کے ساتھ ''ادب'' کا جڑا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فن سماج کی حسن تعمیر کا ایک آلہ و ذریعہ ہے۔ اس آلے کے ذریعے معاشرے میں پیش آنے والے واقعات کو لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ انھیں باخبر کیا جاتا ہے۔ صحافت دراصل عمومی معنوں میں خبر، اطلاع اور واقعات کی ترسیل و ابلاغ کا نام ہے۔ کسی مملکت کو چلانے کے لیے تین ادارے ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ، انتظامیہ اور عدلیہ۔ کہا جاتا ہے کہ مملکت کا چوتھا ادارہ، صحافت ہے، لہٰذا صحافتی ادارے کی حیثیت ایک نقیب کی ہوتی ہے جو تینوں اداروں کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے اور عوام کو ان سے واقف کراتا ہے، نیز بیدار رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے تینوں

ادارے من مانی کرنے سے احتیاط برتتے ہیں۔

میتھو آرنلڈ کی تعریف میں ایک نکتہ یہ بھی پنہاں ہے کہ ایک صحافی کو وہی کچھ ضبط تحریر میں لانا ہے جو وہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ اس کی ذمے داری میں عوام تک دیانت داری و ایمان داری سے حاصل شدہ مواد کا پہنچانا ہے۔ اس میں افراط و تفریط کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ جلد بازی میں تیار کیا گیا مواد و ادب تخلیقی شہ پاروں کی خصوصیت سے عاری ہوگا۔ اس میں صرف اطلاع ہوگی۔ ایرک ہوجنز کا خیال ہے۔

''صحافت، معلومات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ دیانت، بصیرت اور رسائی سے ایسے انداز میں پہنچانے کا نام ہے جس میں سچ کی بالادستی ہو۔''

ایرک ہوجنز کا خیال درست ہے۔ عملی صحافت سماج میں رونما واقعات کے ساتھ عوامی تاثرات کی ترسیل و ابلاغ کا کام بھی کرتی ہے۔ کیونکہ ایک صحافی صرف، واقعات و سانحات ہی نہیں دیکھتا بلکہ عوام کا ردعمل بھی دیکھتا اور سنتا ہے۔ اس لیے عملی صحافت کی ذمے داری اطلاع و جانکاری کی فراہمی کے ساتھ رائے عامہ کی پیش کش بھی ہے۔ اخبار نویسی یا اخباری صحافت سانحات و واقعات کے بعد بدلتے ہوئے حالات اور اس کے دوررس اثرات پر تبصرہ بھی پیش کرتی ہے۔

صحافی اور صحافت کا فن سماج کا آئینہ بھی ہے اور گواہ بھی۔ گواہ کی گواہی سے بے قصور مجرم اور مجرم بے قصور ثابت ہوسکتا ہے جس سے سماج بے چینی کا شکار ہوجاتا ہے۔ حق تلفیوں و ناانصافیوں کے باعث سماج میں طوائف الملوکی و خلفشار پیدا ہونے کا ڈر رہتا ہے۔ جس سے سماجی نظام تہ و بالا ہوجاتا ہے۔ لندن سے نکلنے والا ٹائم اخبار جو 1841 سے 1877 تک جاری رہا۔ The Times کے مدیر جان تھیڈس ڈیلین نے لکھا ہے کہ ''پوری آزادی کے ساتھ کوئی اخبار اس وقت کام کرسکتا ہے جب وہ کسی سیاسی پارٹی یا حکمرانوں سے کسی مجبوری کی وجہ سے نہ منسلک ہو۔''

خبر رسانی و خبر نویسی کا مفہوم اس وقت بدل جاتا ہے اگر خبر رساں ادارے کو خبروں کے انتخاب و ترسیل میں آزادی نصیب نہ ہو، کوئی اخبار زیادہ دنوں تک اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا جب تک کہ وہ سچائی و دیانت داری سے کام نہ لے۔ جانب داری اخبار کے وجود کے لیے خطرہ ہے۔ صحافی کا مذہب سچ بولنا، پریس کو سچ چھاپنا ہے۔ صحافت میں سچ چھاپنا ہی پریس کی آزادی کہا جاتا ہے۔ یہ آزادی ملک کی طرف سے عطا کی گئی ہے۔ اسی لیے امریکہ میں امریکی کانگریس کو اخباروں کی آزادی پر پابندی لگانے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ آزادی اور ذمے داری، دو اہم فرائض ہیں، اگر پریس کو آزادی حاصل ہے تو اس آزادی کو صداقت کے ساتھ نبھانے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ سنی سنائی خبروں کو ''دروغ بر گردنِ راوی'' کہہ کر چھاپ دینا غیر ذمہ داری کی بات ہے۔ کیونکہ صحافی کا کردار ایک تاریخ نویس کا ہوتا ہے۔ جس کا فرض صرف حقیقت کی جستجو ہے۔ صحافیوں کے لیے غیر جانب دار ہونا بہت بڑا چیلنج ہے۔ آج کی اردو صحافت اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھا کر دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی ہے جہاں کے حالات سے واقف ہونا عام لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن میڈیا نے پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کردیا ہے۔ یہ صحافی کارکردگی کا اہم پہلو ہے۔ دنیا

کی تازہ ترین خبروں سے عوام کو واقف کرانا، صحافتی ذمے داری ہے۔ بسا اوقات ایک واقعہ کی خبر اخبار نے دیدی، لیکن اس کے اسباب وردعمل کا پتہ نہیں چلتا جس سے عوام میں بے چینی کا ماحول ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک صحافی کی ذمہ داری ہے کہ وہ سارے حقائق و اسباب کی تحقیق کرے اور صحیح نتائج سے عوام کو باخبر کرے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں جمہوریت ہے، جمہور بہ معنی عوام ہے۔ یعنی حکومت عوام کے ہاتھوں سے بنتی بگڑتی ہے۔ جب کوئی بدعنوان پارٹی یا لیڈر عوام کے مزاج کے خلاف کام کرتا ہے تو اخبارات اس کی کارکردگی کی اطلاع عوام تک پہنچاتے ہیں۔ جس کی پاداش میں انھیں عوام آنے والے انتخاب میں بے دخل کر دیتے ہیں۔ فرقہ پرستی و منافرت پھیلانے والی تنظیموں اور رہنماؤں کا کچا چٹھا سماج میں اخبارات کھول دیتے ہیں، گویا صحافت کا وجود اور اس کی ذمے داری و فرائض سماج و جمہور کی فلاح و بہبود ہے۔

صحافت و ترسیل اطلاع اور خبر رسانی کا فن و پیشہ ''وقت سے منسلک ہے، خبر کی اہمیت کے پیش نظر کبھی کبھی طے شدہ پروگرام و کالم کو ملتوی کرنا پڑتا ہے اور دور دراز علاقوں سے حاصل شدہ خبروں کو فوری طور پر جاری کرنا پڑتا ہے۔ اس میں ایک ایک لمحے کی اہمیت ہوتی ہے اور لوگوں کو شدت سے انتظار رہتا ہے۔ خبر رسانی میں امروز کو فردا پر نہیں بلکہ لمحے کو گھنٹے پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس میں مسلسل سعی و جہد اور عزم و استقلال درکار ہے۔ اس میدان میں کبھی کبھی صحافی کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اس میں ذہانت و حاضر دماغی کی اشد ضرورت پڑتی ہے۔ بحیثیت مجموعی صحافت شب و روز کے واقعات لفظوں میں ترتیب دے کر غیر جانب داری و دیانت داری سے لوگوں تک پہنچانا ہے۔ صحافت کا فن یا میدان صرف اطلاع یا خبر رسانی تک محدود نہیں ہے بلکہ غیر معمولی اور متنازعہ معاملات و مسائل پر تجزیہ کر کے عوام تک حقائق کی ترسیل و رائے عامہ کی ہمواری ہے۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. صحافت کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟
2. علمی، ادبی اور اخباری صحافت میں کیا فرق ہے؟
3. صحافت اور سماج میں کیا رشتہ ہے؟
4. صحافت کے حدود و فرائض کیا ہیں؟
5. صحافت و صحافی کی قدر و اہمیت کیا ہے؟
6. پریس کی آزادی سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

## 1.2 قدیم طریقۂ خبر رسانی

اطلاع بہم پہنچانا، حالات سے واقف کرانا اور معاملات ومسائل سے باخبر کرنا ایک فطری عمل ہے۔ انسانی سماج میں ایک دوسرے کے معاملات میں حصہ لینا تو سماجی فرض ہے ہی، حیوانوں کی دنیا میں بھی ناگفتہ بہ حالات میں چرند و پرند باہم دیگر اپنی اپنی بولیوں سے اظہار جذبات کرتے ہیں۔ آبادیوں یا جنگلوں میں جب کوئی ناگہانی صورت حال پیدا ہوتی ہے یا کوئی شکاری کسی پرندے کو اپنی غلیل کا نشانہ بناتا ہے یا کوئی شخص کسی پرندے کے گھونسلے تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنے ہم جنس پرندوں کو چیخ چیخ کر اکٹھا کر لیتا ہے۔ ایسی حالت میں خطرہ محسوس کرتے ہوئے سارے پرندے اپنے پنجوں، پروں اور چونچ کا استعمال کرتے ہوئے اپنی زندگی وہ بچوں کا دفاع کرتے ہیں۔ یہ عمل شعوری نہیں بلکہ عین فطری ہے۔ گویا آگاہی فطری وغیر شعوری جذبہ ہے۔ بے زبان و بے عقل جانور بھی کسی کے درد پر چیخ پڑتے ہیں۔ ان کی چیخ گویا خبر رسانی کی ایک صورت اور ذریعہ ہے۔

قدیم زمانے میں خبروں کو پہنچانے کے کئی ذرائع تھے، سدھائے ہوئے پالتو کبوتروں کے ذریعہ خطوط بھیجے جاتے تھے۔ آج بھی تصویروں میں ایسے کبوتر دیکھنے کو ملتے ہیں جو اپنی چونچ میں ایک لفافہ دبائے ہوئے ہوتے ہیں، وہ تربیت یافتہ کبوتر طے شدہ مقامات تک مرسل کے پیغامات بحسن وخوبی پہنچا دیا کرتے تھے۔

قدیم مملکتوں میں خبر رسانی کا کام سرکاری سپاہی یا جاسوس کیا کرتے تھے۔ یہ عسکری دور ہے۔ اس میں جاسوسی نظام اور منظّم طریقے سے انجام پا رہا ہے۔ ہر ملک کے جاسوس دوسرے ملکوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے اور اپنے ملک کو باخبر کرتے رہتے ہیں۔ ان کا انداز ترسیل خفیہ اور زبان مبہم ومعمہ کی طرح ہوتی ہے۔ عرب لوگ غیر عرب کو عجمی کہتے تھے، اپنے سامنے زبان وادب اور شعر میں غیر عرب کو ہیچ سمجھتے تھے۔ قدیم عرب میں خبر رسانی کا طریقہ شعر گوئی تھا۔ حج کے موقع پر اپنے خیالات وجذبات، جو سماج کی عکاسی کرتے تھے، قصیدے کی شکل وصورت میں خانۂ کعبہ میں پیش کرتے تھے جو پورے ملک میں پہنچ جاتا تھا۔ خبر عام کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ کوئی سرکاری آدمی سلطنت کے کسی اونچے مقام یا شارع عام پر کھڑا ہو جاتا اور سرکاری احکامات پڑھ کر سناتا۔ بعض تختیوں پر اعلانات تحریر کر کے عام گزرگاہوں پر آویزاں کر دیتے۔ اشوک اعظم کے زمانے میں پتھروں پر کندہ عبارتوں کی شکل میں اطلاعات وفرامین رعایا تک پہنچائے جاتے تھے۔ شہنشاہ اشوک کے فرامین واحکامات آج بھی کرناٹک اور افغانستان میں پتھروں پر کندہ ومحفوظ ہیں۔ بودھ مذہب کے پیروکاروں نے بودھ اصولوں کو سری لنکا تک پتھروں کے ذریعے پہنچایا۔ قدیم راجاؤں، مہاراجاؤں وشہنشاہوں نے اپنی اپنی سلطنت میں اپنے ہرکارے پھیلا رکھے جو سلطنت کے حالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ان کے ذریعہ رائے عامہ کا پتا چلتا تھا جن کی روشنی میں حکمراں لائحہ عمل ودستور تیار کرتے تھے اور درباری عوام تک درباری خبریں واحکامات پہنچاتے تھے۔ ہر کامیاب حکمراں موصول رپورٹوں کو بہت اہمیت دیتا تھا اور ملک وقوم کے درمیان امن وآشتی کے لیے موصولہ اطلاعات کو مشعل راہ بناتا تھا۔ مغل شہنشاہوں نے ترسیل اطلاعات کے لیے حسن انتظام قائم کر رکھا تھا۔ اس کے لیے باقاعدہ شعبے تھے۔ وہ شعبے اپنے اپنے خاص افراد بحیثیت خدمت گزار متعین کر رکھے تھے اور اپنے اپنے علاقے سے خبریں پہنچاتے تھے۔ سید اقبال قادری ''رہبر اخبار نویسی'' میں لکھتے ہیں۔

> ''مغلیہ دور میں خبریں، رائیں اور پوشیدہ معلومات حاصل کرنے کے لیے خصوصی نامہ نگار متعین تھے، جو وقائع نویس، سوانح نویس اور خفیہ نویس کہلاتے تھے۔ تقریباً ہر علاقے سے خبر نامہ دارالحکومت پہنچاتے تھے اور ہر شام محل کی بیگمات

یہ خبرنامے شہنشاہوں کو سنایا کرتی تھیں۔ جنگ اور امن دونوں حالات میں ایسے خبرناموں کی بڑی اہمیت تھی۔''

درج بالا تحریروں سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی کہ مختلف ملکوں کے اپنے اپنے طریقہ ترسیل ہوا کرتے تھے۔ جب کاغذ، قلم اور روشنائی کی ایجاد نہیں ہوئی تھی تب بھی خبروں کی اہمیت وقدر تھی، حالات کے مطابق میسر ذرائع کا استعمال ہوتا تھا جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ پرانے طریقوں میں ایک طریقہ ''منادی'' کا ہوتا تھا۔ علاقے کے سرکردہ حضرات اپنے اپنے علاقوں کے سردار ہوا کرتے تھے، جب کسی مہم کو سر کرنا ہوتا یا اجتماعی فلاح و بہبود کا کام ہوتا یا کثیر مقدار میں حاصل خوردنی اشیا کی تقسیم کا مرحلہ آتا تو آبادی کے ایک بلند آواز فرد کا انتخاب کیا جاتا اور اس سے اعلان کرا کے مقصد کی تکمیل کی جاتی تھی۔ اعلان کرنے والے کو ''نادی'' کہا جاتا تھا۔ جب سماج میں تھوڑی بہت تہذیب آئی تو ایک مخروطی شکل کا آلہ ایجاد ہوا۔ اس کی لمبائی تقریباً دو فٹ ہوا کرتی تھی، جیسے جیسے اس کی لمبائی بڑھتی تھی اس کا دوسرا حصہ چوڑا ہوتا جاتا تھا، پتلا حصہ منہ کی طرف ہوتا تھا جس میں اعلان کرنے والا منہ لگا کر بلند آواز میں اعلان کرتا تھا اور اس کی آواز دور تک پھیلتی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر اس کی ترقی یافتہ شکل ہے (جسے دیہی علاقوں میں بھوپو کہا جاتا تھا) یہ سب طریقے روزانہ خبر رسانی و اخبار نویسی کی ترقی یافتہ ایجاد سے قبل کے تھے۔ صحافت و اخبار کی تاریخی ایجاد کے بعد ذاتی خوشی وغم کے مواقع ہوں یا اجتماعی، ایسی صورت میں اخبارات یا الیکٹرانک میڈیا فوری ساتھ دینے سے قاصر تھا۔ ایسے موقعوں پر صرف افرادی قوت کام میں لائی جاتی تھی، دوری و فاصلے کے حساب سے وقت کی تعین کے ساتھ افراد کا انتخاب عمل میں آتا تھا اور خبر رسانی کے عمل کی تکمیل ہوتی تھی، جو خبریں طویل مسافت طلب ہوتی تھیں وہ کاغذ قلم کی ایجاد کے بعد خطوط کے ذریعہ پوری کی جاتی تھیں۔ لیکن فون کی ایجاد نے ذاتی خبروں کو لمحوں میں پورا کرنے کا کام کیا ہے۔

میڈیا و صحافت کی محدودیت کے سبب دنیا وسیع و پھیلی ہوئی تھی۔ اب میڈیا نے دنیا کو عالمی گاؤں (Global Village) میں تبدیل کر دیا ہے۔ قدیم زمانے میں نسل و ذات اور برادری نے بھی حد بندی قائم کر رکھی تھی جس کے سبب ایک آبادی دوسری آبادی کے معاملات و مسائل سے واقف نہ تھی، اگر واقف ہوتی تو انھیں دلچسپی لینے کا اختیار نہیں ہوتا۔ تاہم اب ایسا نہیں ہے۔ خواندگی نے انسانی حقوق کی تبلیغ و پیدائش و پیدائشی حق کو پہچاننے اور حاصل کرنے کی راہیں ہموار کی ہیں۔ بہت سارے حقوق حکومت فنڈ کی شکل میں دیتی ہے لیکن عوام کو اس کی خبر نہیں ملتی، لیکن میڈیا کی ترقی نے یہ کام بہتر طور پر انجام دیا ہے اور دور دراز کے علاقوں تک اپنی صحافتی ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے عوام کی ترقی و بہبود کا کام کیا ہے۔

خبر رسانی و صحافت کا التزام دراصل واقعات و سانحات یا کسی مقصد کی تکمیل سے ہے بسا اوقات خبر رسانی کا مقصد تفریح بھی ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم میں وادیوں و گھاٹیوں میں قبل از تہذیب اقوام خبر رسانی و اطلاعات بہم پہنچانے کے لیے چند علامتوں کا استعمال کرتے تھے جس سے ہم خیال افراد کو جمع کرنا مقصود ہوتا تھا جیسے آگ جلا کر دھواں پھیلانا یا کچھ مخصوص آواز بلند کرنا تاکہ اپنے ہم جنسوں یا قبیلوں کو اکٹھا کیا جائے۔

صحافت ایک غیر ادبی صنف ہے، اسی لیے اس کی زبان عام فہم و سریع الاثر ہوتی ہے۔ عوامی بہبود و ترقی کے ساتھ ساتھ عوامی آرزوؤں، امنگوں و تمناؤں اور تفنن طبع کے لیے بھی صحافت سامان فراہم کرتی ہے۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. زمانہ قدیم میں خبر رسانی کی نوعیت واہمیت کیا تھی؟
2. خبر رسانی کے قدیم ذرائع پر روشنی ڈالیے؟
3. قدیم خبر رسانی کے حدود کی تعیین کیجیے؟

## 1.4 صحافت کے اغراض ومقاصد اور کردار

صحافت عوام وسیاست کے درمیان ایک کڑی ہے۔ایوان سیاست میں جو کچھ واقع ہوتا ہے صحافت اسے عوام تک پہنچاتی ہے۔اس کے نشیب وفراز سے بھی واقف کراتی ہے۔ایک صحافی اپنے عام فہم وسادہ اور دلفریب انداز تحریر وتقریر سے حالات کا تجزیہ کرتا ہے اور بحیثیت مبصر سیاسی صورتحال ومسائل پر تبصرہ کرتا ہے نیز شہریوں کو اس کے انجام سے باخبر کرتا ہے۔صحافت کا دائرۂ کار اب صرف خبروں کی ترسیل ہی نہیں بلکہ سماج وانسانی زندگی سے متعلق تمام شعبوں کو محیط ہے۔اقتصادیات،عمرانیات،طبیعات،اخلاقیات و ادبیات اور جنگی میدان سے لے کر سرحدوں کی حرکات وسکنات صحافت کی گرفت میں آتے ہیں۔گویا صحافت ایک ایسا ذریعہ ہے جو عوامی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتا ہے۔صرف پیش آنے والے واقعات سے باخبر ہی نہیں کرتا بلکہ یہ ہدایت کا ذریعہ بھی ہے۔اس لیے صحافت کو ایک مقصدی فن کہا جاتا ہے۔جس کا مقصود ومنشا معاشرے کے ترقی وصحت ہے۔صحافت کا مقصد صرف خبر نگاری وترسیل اطلاع نہیں ہے بلکہ پیش آنے والے واقعات وسانحات کی صحیح تصویر پیش کرنا ہے اور اس کے فرائض میں اسباب ومحرکات نیز اثرات پر نظر رکھنا بھی ہے۔

مختلف المزاج سماج میں صحافت بسا اوقات گمراہ کن ثابت ہوتی ہے۔کچھ اخبارات اپنی پالیسی کے تحت فلاح عامہ وبہبود و ترقی کو نظر انداز کرتے ہوئے حکمراں طبقے کی ترجمانی کرتے ہیں،جن کا مقصد ایک خاص طبقے یا گروہ کی بھلائی ہوتی ہے اور اس بھلائی کے پیچھے خود ان کا مفاد چھپا ہوتا ہے۔اثنائے تحریک آزادی سبھی صحافتی ادارے بالکل ایک نہج پر نہیں سوچتے تھے۔مختلف ایجنسیاں مختلف نقطۂ نظر رکھتی تھیں۔ایک واقعہ کبھی عوام میں عزم وحوصلہ پیدا کرتا تھا تو وہی واقعہ بعض اوقات اداسی وحوصلہ شکنی کا باعث بنتا تھا۔ اس کے پیچھے صحافتی اداروں کی پالیسی میں اختلاف تھا۔حالانکہ صحافت ایک مقدس پیشہ ہے اس کے تقدس کی پاسداری ایک صحافی کا فرض ہے۔اس فن اور اس میدان سے جڑے ہونے کا مطلب ہے ایک عظیم ذمہ داری،جس کا تقاضا سچائی وصداقت اور وسعت قلب ودماغ کے ساتھ انصاف کرنا اور برملا اظہار تا کہ مظلوم ومجبور کو اس خاص یعنی صحافتی ادارے سے انصاف ملے اس کا درد دنیا محسوس کرے،عوام تک اس کا معاملہ پہنچے۔اگر صحافت ان ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتی ہے تو وہ معاشرے میں خوشحالی کا سبب بنتی

ہے۔سماج ومعاشرے کوترقی کی منزل تک پہنچانے میں کلیدی کردارادا کرتی ہے۔

صحافتی نقطہ نظر کے مطابق صحافت کا کام ایک شفاف اور بے لوث سماجی خدمت فراہم کرنا ہے۔ایک طاقت ورصحافت پر فرقہ پرست قوتوں کا اثر ورسوخ کام نہیں کرتا۔ذات پات فرقوں اورزبان کے جھگڑوں سے وہ کبھی متاثر نہیں ہوتی۔اس کا مقصد سماج کواستحکام بخشنا ہوتا ہے۔اس کام کے لیے آزادانہ سعی وجہد ہی اس کا فرض ہوتا ہے۔موجودہ صحافتی اداروں نے قوم کے اندر شعور پیدا کرنے ،تازہ حالات ومعاملات سے باخبر کرنے ،جدید علوم وفنون سے متعارف کرانے ، نیز ترقی وفروغ کے لیے نئے نئے اقدامات کیے ہیں۔جس کی وجہ سے ہمارا ملک ترقی پذیر ملکوں میں شامل ہے ،ان کے شانہ بشانہ چلتا ہے۔آج ہمارا شمار ترقی یافتہ ممالک کی نظروں میں باوقاروباعزت ہے۔

ملک کی ترقی اورملکی ٹیکنالوجی کی ترقی کے باعث ہماری مطبوعہ صحافت نے بھی ترقی کی ہےاور یہ مطبوعہ صحافت دیگر ترسیلی ذرائع کی فہرست میں آگئی ہے۔ٹیلی ویژن،فلم ،ریڈیو خاص ابلاغی ذرائع میں اہمیت کے حامل ہیں۔لیکن پرنٹ میڈیا نے جوکردارادا کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔پرنٹ میڈیا نے دروازے دروازے ملکی حالات ومنصوبے وآئندہ لائحہ عمل کی خبریں پہنچایا ہے جس سے ہمارے سماج میں بیداری پیدا ہوئی ہے۔ملک میں جگہ جگہ خیرسگالی کے پروگرام ،علمی وادبی سمینار و مذاکرات کالب لباب ہمارے اخبارات صبح صبح ہم وطنوں تک پہنچاتے ہیں جس سے ذہن سازی ہوتی ہے۔مثبت ماحول کی تشکیل ہوتی ہے۔

آزادی کے بعد ملک ابتری کا شکار تھا۔رفتہ رفتہ استحکام آیا۔اب ملک مستحکم ہونے کی راہ پرمزید کوشاں ہے۔ایسے عالم میں چندمفاد پرست قوتیں اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے تخریبی سرگرمیوں میں ملوث رہتی ہیں۔ایک مخصوص گروہ کوآگے بڑھانے میں ملک ودیگرلوگوں کوضرر پہنچاتے ہیں۔حدود کوتوڑ کر بدعنوانی کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ان حالات میں صحت مند صحافت کی ذمے داری مزید بڑھ جاتی ہے کہ ان کے ناپاک عزائم کوسمجھے۔ان کے دیرپا نقصانات سے ملک وقوم کو باخبر کرے تاکہ ان کے غلط اقدامات سے غلط اثرات مرتب نہ ہونے پائیں اوروہ شرپسند عناصر بے نقاب ہوں تاکہ آئندہ ایسی کچھ حرکتیں کرنے کی جرأت نہ کرسکیں۔یہ حقیقت ہے کہ ہمارا ملک مختلف مذاہب وعقائد کا مسکن ہے۔یہ قدیم مذہبی ملک ہے جس کے باعث سیکولرازم کی بقا کے لیے فضا سازگار ہے۔ رواداری یہاں کا خاص وصف ہے۔کثرت میں وحدت اس کی خوبی ہے۔اختلاف رنگ ونسل میں اتحاد ہے۔رنگ رنگ تہذیب ہمارے سماج کونئی نئی دلچسپیوں اور نئے نئے ذائقوں سے محظوظ کراتی ہے۔ہماری صحافت نے اس کا خاص خیال کیا ہے۔قومی یکجہتی و اتحاد باہمی کے فروغ میں نمایاں کردارادا کیا ہے جس سے خوداعتمادی میں اضافہ ہوا ہے۔

بعض اوقات مذہبی منافرت پھیلانے والے اپنے مقصد میں وقتی طور پر کامیاب نظر آتے ہیں لیکن ایسی حالت میں ہمارے صحافیوں کوگھبرانا نہیں چاہیےاورنہ ہی حالات کی سنگینی سے ہمت ہارنی چاہیے۔کیونکہ یہ وقتی وعارضی جذبات کوبھڑکانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔سطح آب پرکائی کی طرح ہوتے ہیں۔ان کی جڑیں انھیں تک محدود ہوتی ہیں، پانی کے ہلکے سے تموج کو برداشت نہیں کرسکتے۔ تہہ نشیں ہوجاتے ہیں۔ایسے میں صحافی کا کردارایک مصلح قوم وملک کا ہوتا ہے جوحالات پرکڑی نظر رکھتا ہےاورسماج میں اعتدال قائم

کرنے کے لیے حوصلہ بخش تحریروں کا سہارا لیتا ہے اور ہمت و جرأت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ واقعات کے تسلسل سے عوام کو باخبر کرتا رہتا ہے، تاکہ وہ کسی طرح کی غلط فہمی کا شکار نہ ہو کر گمراہی کی راہ پر چلے جائیں جس کی وجہ سے عوام کو بہت بڑے نقصان وصدمہ سے دوچار ہونا پڑے۔ حالات سے باخبری بیداری پیدا کرتی ہے اور شر پسند عناصر اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ کبھی کبھی سماج کو خراب کرنے، اس کی فضا کو مسموم کرنے کی لیے منصوبہ بند طریقے سے کوئی واقعہ انجام دیا جاتا ہے اور آگے بڑھ کر اشتعال انگیزی پیدا کر کے سماج میں التباس پیدا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں بسا اوقات صحافی صحیح نتیجے پر نہ پہنچ کر حالات وواقعات کی صحیح تصویر نہیں پیش کر پاتے۔ جس سے حالات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں صحافیوں کی ذمہ داری ہے کہ نہایت دانش مندانہ رویہ اپنائیں اور حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیں اور بلند نظری کا ثبوت پیش کریں تاکہ معاشرے کی اجتماعیت کو خطرہ نہ لاحق ہو اور سماج ٹوٹنے سے بچے نیز علاحدگی پسند عناصر ناکام ونامراد ہوں۔ ملک کی ترقی سماج میں اتحاد ویگانگت اور تحفظ وسلامتی سے ہی ممکن ہے۔ مانا کہ صحافت ایک کاروباری صورت اختیار کر چکی ہے۔ باوجود اس کے اچھے سماج کی تشکیل وتعمیر کا ایک بڑا ادارہ بھی ہے۔ اس ادارے میں بہت ساری اخلاقی پابندیاں ہوتی ہیں جن کا پاس ولحاظ بہر صورت لازم ہے۔

ہم جس صحافت کی بات کرتے ہیں وہ ایک عمومی صحافت ہے۔ اس کا اطلاق کسی خاص زبان پر نہیں ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم اردو صحافت کی گفتگو کرتے ہیں تو اردو صحافت کی ذمے داری ایک مخصوص اقلیت کی ہمنوائی ونگہداشت نہیں ہوتی ہے۔ اس کا فرض ہوتا ہے حکومت کے سارے منصوبے، فلاحی اسکیمیں، اور دیگر مراعات سے عوام کو باخبر کرے۔ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے طریقوں سے مطلع کرے تاکہ ملک کی ترقی وفروغ میں بہتر کردار ادا ہو سکے۔ خواندگی میں اضافہ ہو، جہالت میں کمی آئے تاکہ ہمارا سماج امن وامان کا گہوارہ بن سکے۔ قوم وملک کی ترقی میں تعلیم اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ لہٰذا تعلیم کے فوائد کا احساس دلانا صحافت کا ایک مقصد بھی ہے۔

میدان صحافت میں اترنے کے بعد ایک صحافی کا فرض اولین ہے کہ وہ اپنی ذاتی آرا نیز اپنی ذات کو بالائے طاق رکھ کر سوچے، وہ عوام کی آنکھ سے دیکھے، عوام کے دماغ سے سوچے، عوام کے دل سے محسوس کرے اور پھر عوام کی زبان سے بولے ولکھے۔ اس لیے کہ فن صحافت قلم وزبان کی حرمت وآبرو پر آنچ نہ آنے کا فن ہے۔ ہر حال میں ایک صحافی کو سچ بولنا ہے، سچ ہی لکھنا ہے۔ تکثیری سماج کا اس میں مفاد مضمر ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں سیکولرازم ورواداری، ملک کے اندر سلامتی واتحاد وتحفظ کو برقرار رکھنا، قومی بھائی چارے کو باہم مضبوط کرنا، اخلاقی اقدار کی بحالی اور مثبت طرز فکر کی تشکیل وتعمیر صحافت کا عظیم کردار ہے۔ اس کے قلم سے کئی ایسی تحریر اخبار ورسائل کے کسی صفحے پر نہ آئیں جس کے اثرات منفی ہوں۔ جو سماج کو جوڑنے کے بجائے توڑنے کا کام کرے۔ سماجی استحکام فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر منحصر ہے۔ اس لیے صحافیوں اور اخبار نویسوں کی ذمہ داری وفرائض میں داخل ہے کہ وہ منفی مواد کی اشاعت سے حتی المقدور گریز کریں تاکہ معاشرے کی بنیاد میں تزلزل نہ آئے۔

اس کے برعکس کچھ اخبارات کا مزاج جانب دارانہ ہوتا ہے۔ جب سماج میں کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو ان کی رپورٹنگ عجب انداز کی ہوتی ہے۔ دو گروپوں میں کسی معاملے کو لے کر کوئی بات ہوئی تو وہ فوراً فرقہ وارانہ رنگ دے کر پورے سماج کو ملوث کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ سماج کی بیخ کنی وخلفشار اور بے چینی ہوتی ہے۔ ایسے میں شر پسند عناصر اور خود ساختہ لیڈر اپنی خدمات بڑھ چڑھ کر پیش کرتے

ہیں اور اپنا مفاد حاصل کرتے ہیں، ایک خاص طبقے کے لوگوں کو اکسا کر غیر قانونی حرکتیں کراوتے ہیں نیز انتظامیہ پر اپنا دبدبہ ورعب جتاتے ہیں۔ ایسی صورت میں صحافت کو نبرد آزما ہونے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ تاہم ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے نہایت چابکدستی وخردمندی کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ تاکہ رائے عامہ بگڑنے نہ پائے اور معاملات ومسائل کا تصفیہ بحسن وخوبی ہوجائے تاکہ اخبار کی سرخیوں میں آنے کی خواہش غیر سماجی عناصر کے مقاصد تکمیل کا جامہ نہ پہن سکیں۔ گویا صحافت کی اہمیت وحیثیت سماج میں ایک جج و منصف کی بھی ہوتی ہے۔ اس کے ان فرائض وکردار سے ایک بہتر و پرامن سماج پیدا ہوتا ہے جو ملک وقوم کی ترقی کا ضامن ہے۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. صحافت کے مقاصد کیا ہیں؟
2. سنگین حالات میں صحافت طرز عمل کیسا ہونا چاہیے؟
3. صحافت سے عوام وسیاست کا رشتہ کیا ہے؟
4. ایک صحافی کو خود کیسا ہونا چاہیے؟
5. مختلف المزاج سماج میں سیکولرازم کی بحالی کیسے ممکن ہے؟

## 1.5 صحافت کی تاریخ وارتقا

صحافت کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جب کاغذ اور چھاپہ خانے ایجاد نہیں ہوئے تھے تب بھی خبروں کی ترسیل ہوتی تھی جن کا ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے، جس میں قدرے تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ یہاں پر صحافت سے مراد، کاغذ، قلم، روشنائی نیز طباعت کی سہولیات اور باقاعدہ اخبار نویسی سے ہے، ایک غیر مصدقہ روایت کے مطابق سب سے پہلا اخبار تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح چین میں شائع ہوا۔ لیکن اس کا کوئی تاریخی یا تحریری ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ 'ورلڈ کمیونی کیشنز: (یونیسکو پبلی کیشنز 1956) کے حوالے سے محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں۔

> ''حضرت مسیح سے کوئی 751 برس پہلے رومن راج میں روزانہ ایک قلمی خبر نامہ جاری کیا گیا تھا، جس میں سرکاری اطلاعات نیز میدان جنگ کی خبریں ہوتی تھیں۔ اس قلمی خبر نامے کو ''اکٹا ڈیورنا'' کہتے تھے۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ جو ACTA اور DURNA سے مرکب ہے۔ اول الزکر کے معنی ہیں کارروائی اور موخر الذکر کے معنی ہیں روزانہ''
>
> (محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1957، صفحہ 19)

یوروپ کے شہر وینس (Vanis) میں 1566 میں حکومت کی جانب سے ایک قلمی خبر نامہ نکلتا تھا۔ اس کے نام کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔ اس خبر نامے میں عوام کی پسند و دلچسپی کی خبریں چوبی خامے سے تیار کی جاتیں۔ ایک آدمی، جو حکومت کا نقیب ہوتا، عوام الناس میں بہ آواز بلند پڑھ کر سناتا اور سننے والوں سے ایک گزیٹا وصول کرتا۔ گزیٹا اس وقت کا سکہ تھا۔ اسی سے گزٹ نکلا جو اخبار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد وینس کی طرز پر دوسرے مغربی ملکوں میں قلمی اخبار نویسی کا چلن عام ہوا۔ سولہویں صدی میں عوام کے متعلق جب کوئی واقعہ پیش آتا تو حکومت ایک قلمی خبر نامہ نیوز شیٹ کے نام سے جاری کرتی۔ انھیں ابتدائی اخبار نویسی کے نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مطبوعہ صحافت کی ابتدا یوروپ میں چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں ہوئی۔ جن کے ذریعے اہم واقعات عوام تک پہنچائے جتے تھے۔ یہ کتابچے مذہبی امور کو بھی محیط ہوتے۔ مذہب کے اختلافی مسائل پر ان میں بحث ہوتی اور عوام کو ان سے واقف کرایا جاتا۔ انسان فطرتاً مذہبی پیدا ہوتا ہے۔ سماجی اختلافات بیشتر نظریات و مذہب کے سبب ہوتے ہیں، اس لیے اولین تحریروں کا مواد زیادہ تر مذہبی امور پر ہی مبنی ہوتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے آبادی میں اضافہ ہوا نئی نئی ضروریات پیدا ہوئیں جن کے سبب نئے نئے تجربے ہوئے، نئی نئی ایجادات وانکشافات ہوئے۔ جنھوں نے انسانی زندگی میں آسانیاں بہم پہنچائی تو انسان مذہبی اختلافات سے نکل کر سماجی مسائل اور سماج کی تعمیر و ترقی کے بارے میں بھی سوچنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے رسم ورواج اور روایات کا آغاز ہوا۔ ایک دوسرے کی ضروریات کی تکمیل کے لیے خبر رسانی واطلاعات کے فن کی ایجاد ہوئی۔ لہٰذا خبر رسانی کے نئے نئے طریقے عمل میں آئے۔ خبر رسانی کا تحریری طریقہ دستاویز و تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔

اولاً جو کتابچے شائع ہوتے تھے وہ بیشتر مسیحی خیالات ونظریات اور امور و معاملات کی تبلیغ وتفسیر کے لیے خاص ہوا کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا خیالات میں وسعت آتی گئی۔ ان کتابچوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، حتیٰ کہ سیاسی معاملات سے لے کر اقتصادی، سماجی نیز دیگر امور دنیا کو اپنے دائرہ کار میں لے لیا اور جانب دارانہ رویے میں تبدیلی آئی۔ غیر جانب داری اور معاملہ فہمی پیدا ہوئی اور علمی وثقافتی امور بھی زیر بحث آنے لگے۔ ان میں معاشرتی معاملات کے دونوں رخ پیش کیے جانے لگے۔ لہٰذا 1609 میں Avisa Relation Oderzeiting نام کا پہلا مطبوعہ خبر نامہ جرمنی سے جاری ہوا اور دوسرا خبر نامہ 1611 میں برطانیہ سے شائع ہوا جس کا نام ''نیوز فرام اسپین'' تھا جو اخبار سے قدرے مختلف تھا۔ نیوز فرام اسپین اپنے گٹ اَپ و ہیئت کے سبب سو فیصد اخباری پہچان نہیں بنا سکا۔ تاہم برطانیہ کا اول اخبار ہونے کا سہرا ''ویکلی نیوز'' کے سر جاتا ہے جو 1620 میں انگریزی زبان میں چھپا۔ بعد ازاں ''گزٹ ڈی فرانس'' 1631 میں فرانس سے جاری ہوا۔ اس کے بعد Public Occurences نامی امریکہ کا پہلا اخبار بوسٹن سے 1690 میں جاری ہوا۔

مذکورہ بالا اخبارات میں محض خبریں ہوا کرتی تھیں جنہیں دلچسپ تحریروں میں تیار کیا جاتا تھا تاکہ قاری یا سامع ان اخبارات کی طرف متوجہ ہوں۔ ان میں نئی پرانی ہر طرح کی خبریں ہوا کرتی تھیں۔ سائنسی ترقی اور علمی بیداری نے دنیا کے معاملات سے آگاہ کیا اور سترہویں صدی میں ذاتی خبر رساں ادارے وجود میں آئے۔ ایک بات قابل غور ہے کہ اولین خبر نامے آج کے

اخبارات کی صورت سے مختلف ہوا کرتے تھے۔ جو ترقی کر کے آج نکلنے والے اخبار ہوئے، اس صورت میں انگریزی کا پہلا روزنامہ 1702 میں لندن سے نکلا جس کا نام ''لندن ڈیلی کورانٹ'' تھا۔ خبر ناموں اور اخبارات کا باقاعدہ آغاز تو ہوا لیکن ان پر سرکاری اور مذہبی قدغن زیادہ تھی جس کی وجہ سے اخبارات زیادہ ترقی نہیں کر سکے۔ فرانس میں صحافت پر سخت پابندی عائد تھی۔ انقلاب فرانس کے بعد جب جمہوریت کی ابتدا ہوئی تب ساری پابندیاں ختم ہوئیں اور عوام کو اخبار اور تحریر و تقریر کی صورت میں مکمل اظہار رائے کی آزادی حاصل ہوئی۔ اس سے قبل جلسوں و جلوسوں اور تقریروں پر سخت پہرے لگے تھے۔ محمد عتیق صدیقی تحریر کرتے ہیں۔

> ''1971 میں فرانس کی نیشنل اسمبلی نے جو جمہوری دستور مرتب کیا اس کی گیارہویں دفعہ کے مطابق فرانس کے شہریوں کو تقریر کے ساتھ ساتھ اخبار نویسی کی بھی قانوناً آزادی نصیب ہوئی۔ یہ واقعہ صرف فرانس ہی کی اخباری و سیاسی تاریخ کا نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ اور دنیا میں انسان کے سنہری حقوق کی پہلی فتح تھی۔ جس کے بعد ہی اخبار نویسی کے ایک نئے تصور نے جنم لیا۔ جس کو بجا طور پر جدید اخبار نویسی کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔'' (محمد عتیق صدیقی ہندوستانی اخبار نویسی، صفحہ 21)

لیکن عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے۔ جمہوری دستور مرتب ہو گیا۔ شہریوں کو اظہار رائے کے طریقے کو اختیار کرنے کی آزادی مل گئی، لیکن کاغذ پر یہ آزادی ملی، عملاً انھیں دوسرے طریقوں سے پابند کر دیا گیا۔ کیونکہ حکمراں طبقہ اخبارات کی آزادی سے خوش نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کے سارے کارنامے عوام تک پہنچیں۔ اس لیے کہ اخبارات کے ذریعہ بہت ساری باتیں عوام تک جاتی تھیں جنھیں محدود دائرے میں رہنے سے حکمرانوں کا مفاد تھا تاکہ پروپیگنڈہ سے ان کی حکمرانی خطرے میں نہ پڑے۔ اس لیے وہ طرح طرح کے طریقے اپنانے لگے جس سے اخبار و خبریں محدود ہو گئے۔ اخبار نویسوں کو رشوت کی پیش کش کی جانے لگی۔ انکار کی صورت میں پس زندان قید و بند کی اذیت جھیلنی پڑتی اور طرح طرح و نت نئے طریقوں سے انھیں ستایا جانے لگا۔ ٹیکس اس قدر زیادہ کر دیے جاتے کہ عام انسان کی رسائی اخبار تک ممکن نہ ہو پاتی۔ بغیر اجازت نامہ حاصل کیے اخبار نہیں نکال سکتے۔ اجازت نامہ حاصل کرنے میں کڑی شرطیں لگا دی جاتیں۔ وغیرہ

عوامی بیداری اور سیاسی آزادی میں تبدیلی آئی۔ عوامی مطالبے نے شدت اختیار تو صحافت کے لیے راستہ ہموار ہوا، بہتر و خوشگوار ماحول پیدا ہوا اخبارات کو ٹیکس سے آزادی ملی، تو اخبارات کا مطالبہ بھی زیادہ ہوا۔ خبریں شہروں سے دیہاتوں تک پہنچنے لگیں۔ اخباروں کی اشاعت بڑھی، کاغذ کی طلب نے کارخانوں میں اضافہ کیا۔ مطالعہ کی کثرت ہوئی نقل و حمل کے ذرائع کی ترقی کے سبب روزانہ خبروں کی ترسیل میں مدد ملی اور تازہ تازہ خبروں سے آگاہی میں اضافہ ہوا۔ ملک و قوم کے حالات سے واقفیت بڑھی۔ لہٰذا اخبار عوام کی ضرورت بن کر ابھرے جس کی وجہ سے صحافت نے باقاعدہ ایک صنعت کی شکل اختیار کر لی۔ اب اخبار کے مالکوں نے اس کی طرف پوری توجہ صرف کی جس کی وجہ سے آمدنی بڑھی۔ ان کے عملے میں اضافہ ہوا اور اخبار کو ترقی کرنے کا پورا موقع ملا، آزادی، آمدنی اور دیگر سہولیات کے باعث اخبار مالکوں کو ذہنی کشادگی نصیب ہوئی تو انھوں نے اخباروں کو مزید بہتر بنانے، ان کی سرخیوں کو جاذب نظر بنانے نیز ہر طرح سے اخبارات کی تزئین کاری میں اپنے جمالیاتی ذوق کا ثبوت دیا۔ اس کے علاوہ خبروں کے انتخاب میں کیفت و کمیت کا مکمل خیال رکھا۔

اب یہ احساس عام ہو چکا ہے کہ اخبار بینی سے علم و معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ سماج میں جب مختلف ذہن کے لوگ رہتے بستے ہیں تو اخبارات میں سب کے لیے مواد کا جمع کرنا بھی ایک فن ہے۔ اس لیے اخبارات میں مختلف کالم بنائے جاتے ہیں۔ کھیل کی دنیا سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے سبھی کھیلوں کی دلچسپ خبریں ہوتی ہیں۔ ادب و سماج اور ثقافت کے متعلق خبریں بھی مخصوص انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ سرکاری و سیاسی خبریں الگ ذائقہ رکھتی ہیں، اس لیے ان کا بالخصوص اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہنگامی خبریں اور جرائم کی خبریں اخبارات فوری طور پر دیتے ہیں تا کہ اس کے اچھے برے نتائج سے سماج کو باخبر کیا جائے۔ ایسی خبروں کو اخبارات دلچسپ سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں، انداز پیش کش توجہ طلب ہوتا ہے۔ اس سے قاری کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ جذباتی و ہنگامہ خیز خبروں کو نامہ نگار و رپورٹر ترجیحی صورت میں اخباری دفتروں کو روانہ کرتے ہیں تا کہ جلد از جلد قارئین و سامعین تک خبریں پہنچ جائیں۔ تیز خبروں کی اہمیت کے پیش نظر مطبوعہ صحافت کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا کی ایجاد ہوئی۔ جس نے آن کی آن میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خبروں کو لمحوں میں پہنچا دیا۔ ٹیلی گرام، ٹیلی فون، ریڈیو کے علاوہ ٹیلی ویژن کی ایجاد نے خبروں کو سنانے کے ساتھ ساتھ دکھانے کے فن کو بھی ترقی دی۔ مطبوعہ صحافت نے تصویری صحافت سے واقعات کی وضاحت آسان و دلچسپ بنائی تاہم پھر بھی مطبوعہ تصویری صحافت جامد ہونے کے سبب سو فیصد ابلاغی صفت سے مزین نہیں تھی، ٹیلی ویژن کی ایجاد نے سو فیصد خبر رسانی کو یقینی بنایا اور کلامیہ و متحرک خبروں کو دیدہ و شنیدہ بنا دیا۔ ملک کے ایک گوشے میں ہونے والے واقعے کو ایک ساتھ پوری دنیا کے لوگ بیک وقت دیکھ و سن سکتے ہیں۔ اب تو ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھنے، مناظر دکھانے کے ساتھ ساتھ نیچے پڑھنے کے لیے بھی خبریں چلتی رہتی ہیں جو پرنٹ میڈیا کا کام بھی ٹیلی ویژن کے ذریعے کسی حد تک ممکن ہوتا ہے۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. صحافت کا باضابطہ آغاز کب ہوا؟
2. مطبوعہ صحافت کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟
3. صحافت کے اوّلین مواد و مضامین کیسے ہوتے تھے؟
4. صحافتی موضوعات میں وسعت کیوں کر ہوتی؟
5. موجودہ صحافتی حدود پر روشنی ڈالیے؟

## 1.6 خلاصہ

صحافت کی حیثیت دراصل وہی ہوتی ہے جو ایک سنتری و نگہبان کی ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے ملکوں و قوموں کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ صحافت سماج میں واقع ہونے والے ہر طرح کے اعمال و افعال پر نظر رکھتی ہے۔ اس اکائی میں صحافت

کی تفہیم وتعریف نیز جملہ خصوصیات پر گفتگو کی گئی ہے۔مع تمہید اس کے کل پانچ نکات بیان کیے گئے ہیں۔ ہر نکتہ صحافت کے الگ الگ سمت وجہت سے متعلق ہے۔''تفہیم وخصوصیات'' کے تحت صحافت کو بالاستیعاب سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز صحافت کی اولین نقوش کی نشاندہی کی گئی ہے۔آخر میں اپنی معلومات کے ضمن میں چھ سوالات دیے گئے ہیں جو امتحانی نوعیت بھی رکھتے ہیں۔

دوسرا نکتہ ''قدیم طریقہ خبر رسانی'' ہے۔ یہ مختصر بحث قبل از تاریخ ترسیلی نمونے وطریقے سے واقفیت بہم پہنچاتی ہے۔اپنی معلومات کی جانچ کے تحت صرف تین سوالات دیے گئے ہیں۔اس کے بعد''صحافت کے اغراض ومقاصد اور کردار'' ہے۔اس نکتے کے تحت صحافت کی ضرورت اور اس کے مقاصد کو زیر بحث لایا گیا ہے۔سماج میں صحافت کی نوعیت اجاگر کی گئی ہے۔اس کے تحت اپنی معلومات کی جانچ کے لیے پانچ سوالات اٹھائے گئے۔اگلا نکتہ''صحافت کی تاریخ'' ہے۔اس میں صحافت کے آغاز وارتقا سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں اور کاغذ،قلم، روشنائی نیز چھاپہ خانے کی ایجاد پر مع تاریخ روشنی ڈالی گئی ہے۔صحافت کے اثرات وردعمل پر گفتگو ہے۔جدید صحافت اور اس کے دائرے وامکانات کی وضاحت کی گئی ہے۔

مذکورہ مباحث کے علاوہ طلبہ کی سہولت کے مدنظر فرہنگ کے طور پر مشکل الفاظ ومعانی درج کیے گئے ہیں تاکہ مباحث کو پڑھتے وقت ترسیل وتفہیم میں رکاوٹ نہ ہو۔ بعد ازاں ''سفارش کردہ کتب'' کے عنوان سے معلومات میں اضافے کی غرض سے چند کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

## 1.7 فرہنگ

| الفاظ | معانی |
|---|---|
| صحف | صحیفہ کی جمع کتاب،رسالہ،صفحہ،ورق |
| نہج | ڈھنگ،سلیقہ،طریقہ،راستہ |
| فرہنگ | لفظوں کا مجموعہ،لغت |
| رشدوہدایت | رہنمائی،رہبری |
| دانائی | عقل مندی،سمجھ بوجھ |
| رسائی | پہنچ |
| ذوق سلیم | اچھا ذوق |
| الغفران واللزومات | شیخ ابوالعلاٰ معری کے دو رسائل |
| دانش وبینش | عقل مندی،فہم وفراست |

| | |
|---|---|
| بحران | قلت، کمی |
| بہی خواہ | بھلا چاہنے والا |
| مصلحین | مصلح کی جمع، اصلاح پسند لوگ |
| ترسیل وابلاغ | پہنچانا، لے جانا (خبر) |
| شہ پارے | ماسٹر پیس، بہترین تخلیق |
| جمہور | عوام الناس، لوگ |
| بہبود | ترقی، فروغ |
| استقلال | دلجمعی، ثابت قدمی |
| ناگفتہ بہ | ناقابل گفتگو |
| منادی | اعلان |
| نادی | اعلان کرنے والا، پکار لگانے والا |
| سریع الاثر | تیز اثر کرنے والا |
| نشیب وفراز | نیچے اوپر، اچھے برے حالات |
| تموج | موج، لہر |
| مسموم | زہر آلود |
| التباس | غلط فہمی، گڑبڑی، گڈمڈ |
| تکثیری سماج | مختلف ذات براری پر مشتمل آبادی |
| بیخ کنی | استیصال، جڑ کھودنا |
| تصفیہ | حل، صفائی |
| استحکام | پختگی، مضبوطی |
| نقیب | خبر دینے والا، تشہیر کرنے والا |
| قدغن | پابندی، دباؤ، پہرا |

| | |
|---|---|
| نقل وحمل | لانا لے جانا، پہنچانا |
| کیفیت وکمیت | معیار ومقدار |
| کلامیہ | بولنے والی |
| دیدہ وشنیدہ | دیکھی وسنی ہوئی |

## 1.8 سفارش کردہ کردہ کتب

| | | | |
|---|---|---|---|
| .1 | رہبر اخبار نویسی | سید اقبال قادری | ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1989 |
| .2 | تاریخ صحافت | محمد افتخار کھوکھر | مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1995 |
| .3 | ابلاغیات | ڈاکٹر محمد شاہد حسین | ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2003 |
| .4 | ابلاغ وترسیل | ڈاکٹر محمد یوسف خورشید | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1993 |
| .5 | صحافت پاکستان وہند میں | ڈاکٹر عبدالسلام خورشید | لاہور، 1980 |
| .6 | عوامی ذرائع ترسیل وابلاغ اور تعمیر وترقی | ڈاکٹر شاہد پرویز | این سی پی یو ایل، دہلی 2002 |

# اکائی-2: صحافت کی اہمیت وضرورت

ساخت


2.1 تمہید

2.2 صحافت کی اہمیت وضرورت

2.3 صحافت میں درپیش مسائل اور امکانات

2.4 صحافت کا فروغ اور جدید وسائل

2.5 خلاصہ

2.6 فرہنگ

2.7 سفارش کردہ کتب


## 2.1 تمہید

جس طرح زندگی کی بقا روٹی، کپڑا اور مکان پر منحصر ہے، اسی طرح قومی زندگی اور سماج کی بقا اور تشکیل وتعمیر نیز فلاح و بہبود کا انحصار مضبوط صحافت پر ہے۔ سماج کو صحافت سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ صحافت ایک پہرے دار ہے، نگراں ہے، سنتری ہے، پاسبان ملک وقوم ہے۔ معاشرے کے افراد اور تنظیم وتحریک پر اس کی نظر ہمہ آن رہتی ہے۔ گویا صحافت سماج کی آنکھ ہے جو سماج میں واقع ہونے والے واقعات وسانحات اور حادثات کا تجزیہ کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر اس کی اطلاع سماج وعوام کو دیتی ہے جس کا ایک مثبت یا منفی اثر مرتب ہوتا ہے۔ بسا اوقات ردعمل کے طور پر معاشرہ تخریب و بے چینی کا شکار ہوتا ہے۔ غیر جانب دار صحافت اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اس کی اطلاع اپنی تحریروں کے ذریعے حکومتی عملہ اور انتظامیہ کو دیتی ہے تاکہ امن وامان قائم کرنے اور معاملے کا تصفیہ کرنے کے لیے اپنے اختیارات کا استعمال کرے۔

اس نقطۂ نظر سے صحافت کی اہمیت وضرورت بڑھ جاتی ہے۔ کبھی کبھی صحافت کو اپنی ذمے داریاں نبھانے میں دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات صحافت مصلحت کا شکار بھی ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے مخصوص گروہ کو فائدہ پہنچتا ہے اور دوسرے کو بڑے نقصان سے گزرنا پڑتا ہے۔ تاہم پھر بھی صحافتی مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے مثبت امکانات بھی ہیں، کیونکہ آج کی صحافت کے فروغ میں نئے نئے ذرائع استعمال ہو رہے ہیں۔ نئی نئی ٹیکنالوجی اُردو صحافت میں بڑھتی جا رہی ہے۔

اس اکائی میں صحافت کی اہمیت وضرورت پر گفتگو کے ساتھ درپیش مسائل، ان کا حل اور صحافت کی ترقی وامکانات نیز جدید صحافتی ذرائع ابلاغ پر بھی گفتگو کی جائے گی۔ اپنی صلاحیت اور معلومات کی جانچ کے لیے چند سوالات بھی ہوں گے۔ ایک فرہنگ بھی ہوگی جس میں مشکل الفاظ ومعنی درج ہوں گے۔ مزید مطالعے کی غرض سے صحافت پر مبنی کتابوں کی چھوٹی سی فہرست رہے گی۔

## 2.2 صحافت کی اہمیت وضرورت

صحافت جذبات کی ترسیل کا بھی ذریعہ ہے جبکہ اس کی حدود دائرہ میں قومی وملکی حالات سے آگہی دینا ہے دوسروں کے احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کرنا خود اپنے حالات سے باخبر کرنا انسانی فطرت ہے، یہی سبب ہے کہ ہماری ذاتی وانفرادی زندگی کے ساتھ قومی زندگی کے لیے صحافت اور رسائل واخبارات جز ولاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان ہماری بنیادی ضرورت ہے۔ لیکن آج صحافت سماجی ترقی کے لیے نہایت اہم ضرورت بن گئی ہے۔ صحافت کی قوت وطاقت کا اعتراف تاریخ نے ہمیشہ کیا ہے۔ صحافت نے تخت وتاج سے محروم بھی کیا ہے اور تاج پوشی بھی کی ہے، صحافت نے انسانی سماج کو تازیانے لگائے ہیں، انھیں خواب وغفلت سے بیدار کیا ہے۔ ولولہ وجوش پیدا کر کے انقلابات وفتوحات کی نوید سنائی ہے۔ اخبار ایک ایسا اسلحہ ہے جس نے خفتہ جذبات کو برانگیختہ کر دیا ہے۔ نحیف ونزار انسان کو قوت ارادی بخشی ہے، صحافتی طاقت کو نپولین نے تسلیم کیا ہے اس کا قول ہے۔

''ہزار سنگینوں سے زیادہ چار مخالف اخباروں سے ڈرنا چاہیے۔''

ان الفاظ کے پیچھے نپولین کا صحافت کی قوت وعظمت اور اہمیت کا اعتراف ہے۔ صحافت عوام الناس کی طاقت وآلات حرب وضرب ہے۔ لمحہ لمحہ ظالم وجابر کی کارکردگی کو اس کے سامنے لانا، اس کی کرتوتوں کا آئینہ دکھانا مثل خلیل، آتش نمرود میں بے خطر جست لگانا ہے۔ حکومتوں کا عتاب ہمیشہ قوم کے اہم ارکان وافراد پر نازل ہوا ہے۔ تاریخ ساز شخصیات ہدف ونشانہ بنی ہیں۔ حساس حکمراں ہمیشہ محتاط رہے ہیں لیکن بے حسوں اور ضمیر فروشوں کی سیہ کاریوں سے تاریخ کے صفحات کالے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ایک تاریخ ہے کہ جہاں صحافت وصحافتی ادارے اور اخبارات ورسائل کمزور ہوئے یا مصلحت کے شکار ہوئے وہاں ظالم حکومت مضبوط ہوئی ہے۔ اخباری آزادی کو کچلنے کے پیچھے حکمرانوں کا خوف ہے۔ پریس کی آزادی سلب کرنا حکومت کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔ ''ہندوستانی اخبار نویسی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں جو برطانوی حکومت کے تھامنرو کے الفاظ ہیں:

> ''ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں ان کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی ہے اور نہ کبھی دی جائے گی... اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن ہوتی تو میں اخباروں کی انتہائی آزادی کو ترجیح دیتا۔ لیکن چونکہ وہ ہماری ہم وطن نہیں ہے اس لیے اس سے زیادہ خطرناک اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی... اخباروں کی آزادی اور اجنبیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جو نہ تو ایک جگہ جمع ہوسکتی ہیں اور نہ مل کر ایک ساتھ چل سکتی ہیں۔ آزاد اخبار نویسی کا پہلا فرض کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ ملک کو بدیسی حکمرانوں سے نجات دلائی جائے۔ اگر یورپین اور ہندوستانی اخباروں کو آزادی دی گئی تو اس کا بھی یہی نتیجہ ہوگا۔''

رائٹ آنریبل ہنری ڈنڈاس اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے:

''معزز لارڈ کی یہ خواہش معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے اخبارون پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ اگر واقعی ان کا یہی مطلب ہے تو کہنا پڑے گا کہ اس سے زیادہ وحشیانہ منصوبہ کسی انسان کے ذہن میں نہ آیا ہوگا کہ انگلستان اور ہندوستان کے اخباروں کے ساتھ یکساں قاعدے برتے جائیں۔ براعظم ہندوستان میں اگر بلا اجازت اخبار نکالنے کی اجازت دے دی جائے تو سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔''

(ہندوستانی اخبار نویسی، صفحہ 97)

صحافت کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر درج بالا اقتباسات نہایت اہم ہیں۔ جن سے صحافت کی اہمیت وضرورت پر صراحت کے ساتھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ ایسا قومی وسیلہ ہے جس سے دنیا کی بڑی سے بڑی عسکری وغیر عسکری قوت خوف زدہ رہی ہے۔ اس سے حکومتیں بنتی بگڑتی رہی ہیں۔ گویا صحافت واخبار نویسی نے ملک وقوم اور سماج میں اپنی اہمیت وضرورت اور صلاحیت وطاقت کا احساس ہمیشہ دلایا ہے۔ ملک پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں کے روز بہ روز بڑھتے ظلم و جور سے اخبارات ہندوستانیوں کو مطلع کیا کرتے تھے، جس کے باعث ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت بڑھتی گئی۔ یہ نفرت اس قدر بڑھی کہ 1857 کا واقعہ پیش آیا۔ 1857 کی جنگ ہماری قوم ہار گئی۔ ملک وقوم پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ ہندوستانی قوم ذلت ورسوائی اور پستی و انحطاط میں پژمردہ وزبوں حال ہوگئی۔ ایسی صورت سے نجات حاصل کرنے کے لیے کسی معجزے کی ضرورت تھی۔ تاہم اردو صحافت ایک ایسا وسیلہ ثابت ہوئی جس نے امید کی کرن اور بیداری کی روح پھونکی۔ اخبارات ورسائل میں چھپنے والے مضامین اور نظموں نے خون میں جولانی اور جوش وولولہ پیدا کیا۔ اس اعتبار سے 1857 کا تجزیہ کیا جائے تو برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی ذمے داری اخبارات پر ہی آتی ہے۔ اس وقت کے تمام اخبارات تحریک آزادی میں حصہ لے رہے تھے۔ لیکن کچھ مخصوص اخباروں نے تاریخ ساز کردار ادا کیا اور ان کے نقوش آج بھی دلوں پر ثبت ہیں۔ ان میں سے کئی ایک پر قدغن و پہرے لگائے گئے۔ لیکن ہمت نہیں ہارے۔ تہذیب الاخلاق، الہلال، البلاغ، اودھ پنچ، زمیندار، ہمدرد، صادق الاخبار اور دہلی اردو اخبار خاص طور پر اپنی اپنی ذمے داریاں جرأت وہمت سے نبھا رہے تھے۔ ان میں سے کئی اخباروں کے مدیروں کو قید و بند کی سزا سے دوچار ہونا پڑا۔ حکومت کے غیظ وغضب کا شکار بھی ہوئے۔ تختہ دار پر لٹکائے گئے لیکن ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ وہ حکومت کی عقوبت کے سزاوار اس لیے ٹھہرے کہ انھوں نے گوروں کی انسان دشمن ذہنیت کا پردہ مکمل طور پر فاش کیا تھا۔

صحافت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ قدامت پرستی، اوہام پرستی اور نفس پرستی سے نکال کر قوم کو جدید دور سے آشنا کیا۔ دلوں میں علم وادب، تہذیب وثقافت اور جدید سائنسی علوم کے فوائد جاگزیں کیے، انفرادیت پسندی کی نقصانات نیز اجتماعیت وتکثیریت کی منفعت کا احساس پیدا کیا۔ ادب برائے ادب کے طلسم کو توڑ کر ادب برائے زندگی کا سکہ رائج کیا۔ افادیت، قومی بیداری، خیر خواہی اور دین کی صحیح صورت پیش کرنے کے لیے سرسید نے تہذیب الاخلاق جیسا رسالہ جاری کیا۔ اودھ پنچ کے مدیر سجاد حسین اپنی جرأت وبے باکی، سیاسی سوجھ بوجھ اور جذبۂ قومی کی وجہ سے مشہور تھے۔ یہ اخبار سامراج سے سخت نفرت کرتا۔ اس کے تیرو

نشتر کی تیزی دشمن کو بسمل کر دیتی۔اس میں چھپنے والے کارٹون گہرے طنز اور اعلیٰ ظرافت کے نمونے ہوا کرتے تھے۔ابوالکلام آزاد کے الہلال کی اہمیت کا اندازہ، اس پر لگئی گئی پابندی، تبدیلی نام و دفتر اور ضبطی سے لگایا جاسکتا ہے۔اس اخبار نے قوم کے اندر پیدا جمود و تعطل کو توڑا، فکری و سیاسی بصیرت پیدا کی۔ ولولہ خیز اسلوب تحریر سے عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی اور بجلی کی لہر دوڑا دی۔تہذیب و معاشرت کی کایا پلٹ دی۔ ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے۔فطری طور پر وہ کسی پابندی کا قائل نہیں۔شخصی حکومت ہو یا جمہوری۔ وہ آزاد فضا میں سانس لینا اور جینا چاہتا ہے۔بعض افراد یا بعض حکومتیں اس فطری حق کا ناجائز استعمال کر کے من مانی کرنے پر اتر جاتے ہیں۔ ایسے ماحول میں انھیں آزادی کے صحیح مفہوم سے واقف کرانے کے لیے مختلف رسائل و جرائد کا سہارا لیا جاتا ہے اور ادبی و علمی مضامین کے ذریعہ مذہبی احکامات و فرامین کی اہمیت و ضرورت بتائی جاتی ہے۔زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے فرق کی وضاحت کی جاتی ہے۔

اخبارات تہذیبی، ادبی اور سیاسی تاریخ ترتیب دیتے ہیں۔ بہ لحاظ زمانہ اخبارات کی حیثیت دستاویزی ہوتی ہے۔جس کے مطالعے کے لیے قدیم فائلیں محفوظ کی جاتی ہیں۔ان سے قوموں کے عروج و زوال کی داستان معلوم ہوتی۔آئندہ زندگی گزارنے کے لیے ہدایت و رہنمائی اور دستور حیات و لائحہ عمل تیار کرنے میں مدد ملتی ہے۔شکست و فتح کے اسرار و رموز کھلتے ہیں۔ذلت و عزت کے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔قوموں کے عروج و زوال میں صحافت و اخبارات کی اہمیت و حصے داری کے ضمن میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی تحریر قابل قدر ہے۔موصوف رقمطراز ہیں:

> ''اگر ہم پچھلی صدی میں ذہنی سفر کریں تو قوم کی زندگی اور ذہن کا ہر گوشہ ان تبدیلیوں کا عکس پیش کرے گا۔ لیکن اخبارات و رسائل کے اوراق میں اس ''جہان گزراں'' کا بدلتی ہوئی زندگی کی اس دھوپ چھاؤں کا جو نقشہ مل جائے گا وہ شاید ہی کہیں مل سکے اور ان تمام جزئیات کے ساتھ مل سکے جو ہمارے لیے ان اخبارات نے ریکارڈ کی ہیں، جو کچھ ان اخبارات میں ہمیں مل جاتا ہے اور بہت کچھ اور بجنل حالت میں مل جاتا ہے اتنا کسی اور ذریعے سے نہیں ملتا اور جوں جوں وقت آگے بڑھتا چلا جائے گا پچھلی صدی کے اخبارات کی اہمیت اور افادیت بھی بڑھتی جائے گی اور ہم اپنے ذوق مطالعہ کی تسکین اور علمی، ادبی، تہذیبی اور تاریخی معلومات کے حصول کے لیے ان کی طرف خصوصی توجہ دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' (روح صحافت، دیباچہ)

بیدار مغز مورخ کے نزدیک اخبارات اہم دستاویزی اہمیت و حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔تاریخی معلومات اور تہذیب و ثقافت کا صحیح سراغ اخبارات ہی فراہم کرتے ہیں۔اخبارات کی خدمت ہمہ جہت ہوتی ہے۔ ہر مزاج و ہر پسند کا مواد ان کے صفحات سے وافر مقدار میں مل سکتا ہے۔صرف ذوق مطالعہ و جستجو و تلاش کی ضرورت ہے۔ درج بالا اقتباس فن صحافت کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔اس اہمیت کے پیش نظر ہر دور میں صحافت کی ضرورت باقی رہے گی۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. سماجی ترقی کے لیے صحافت کیوں ضروری ہے؟
2. صحافت کی اہمیت کے پیش نظر نپولین کا قول کیا ہے؟
3. اخبارات کو دستاویزی حیثیت کیوں حاصل ہے؟
4. حکمران طبقہ صحافتی آزادی کو سلب کرنا چاہتا ہے، کیوں؟
5. کمزور صحافت کا انجام کیا ہے؟

## 2.3 صحافت میں درپیش مسائل اور امکانات

ہندوستان میں انگریزی، ہندی، تمل اور بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کی عظیم خدمات رہی ہیں۔ برطانوی اقتدار سے پہلے اردو صحافت اور شعر و ادب کی پرورش درباروں، خانقاہوں اور بلاتفریق مذہب وملت سبھی اداروں نے کی۔ انگریزی حکومت کے عہد میں بھی اردو صحافت نے دوسری زبانوں کے ساتھ ترقی کی۔ تحریک آزادی میں بھی اس کا کردار نمایاں تھا۔ اردو صحافیوں نے حصول آزادی میں بڑے پیمانے پر قربانیاں دیں۔ ملک آزاد ہوا۔ آزادی کی سوغات نفرت و کدورت اور خوں ریزی کی شکل میں ملی۔ جانی و مالی اتلاف کا شمار ممکن نہیں تھا۔ ایک سب سے بڑا نقصان جو زبان کی سطح پر ہوا وہ یہ کہ جو زبان سارے ہندوستانیوں کا قومی سرمایہ و وسیلہ تھی، اچانک ایک خاص طبقے سے منسلک کر دی گئی اور اسے ایک مخصوص مذہب سے جوڑ دیا گیا۔ نتیجتاً یہ زبان اردو گھٹتی سمٹتی چلی گئی۔ اپنا اثر و رسوخ اور تاثیر کھوتی چلی گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ مغلیہ عہد میں بڑے بڑے غیر مسلم ادبا، شعرا، مورخین اور زبان داں پیدا ہوئے اور اردو ادب و صحافت کا خزینہ چھوڑ گئے۔ آزادی کے بعد ان میں اضافہ نہیں ہوا۔ پرانے اردو ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی نسل نے اردو سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا۔ جو گزرتے گئے، ان کی جگہ خالی ہوتی گئی۔ ان کے وارثوں نے ہندی اور انگریزی کو ذریعہ معاش و ابلاغ بنایا۔ جس کے سبب اردو زبان کا دائرہ محدود ہوتا گیا۔

آزادی کی جنگ سارے ہندوستانیوں نے مل کر لڑی تھی۔ چھینا ہوا اقتدار واپس ملا تو اس کی صورت مسخ ہو چکی تھی۔ نظام الملک بدل چکا تھا۔ نیت بدل چکی تھی، جس کا حاصل تقسیم کی کربناک داستان سامنے آئی، جو نہ پڑھی جائے، نہ سنی جائے اور بغیر پڑھے سنے چھوڑی بھی نہ جائے۔ المیہ افسانے ضرور لکھے گئے، حزنیہ نظمیں ضرور تخلیق ہوئیں لیکن کس کے لیے۔ آپ ہی کہنے اور آپ ہی سننے کے لیے۔

بادشاہت ختم ہوئی جمہوریت آئی۔ ہندی کو دستوری و سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ ملا۔ مگر اردو سرکاری سرپرستی سے محروم ہوگئی۔ روٹی روزی کا ذریعہ ہونے والی زبان ماضی کی کہانی بن گئی۔ اس کی جگہ دوسری زبانوں نے لے لی۔ صرف تسکینِ ذوق کی خاطر اردو کو پڑھنا تضیع اوقات سمجھا جانے لگا۔ جس کی وجہ سے اردو حلقوں میں اردو سے بے اعتنائی بڑھتی گئی، خواہ وہ کسی بھی طبقے، ذات و نسل سے تعلق رکھنے والے ہوں، سب نے اردو سے دامن بچانے میں عافیت محسوس کی۔ اس طرح اردو قارئین کی تعداد گھٹنے لگی اور اردو کے اخبارات بند ہونے لگے۔ سرکاری اداروں میں جو دستاویزات اردو میں محفوظ کی جاتی تھیں، اب انگریزی اور ہندی نے اس کی جگہ لے

لی۔ان شعبوں میں اردو کی جگہ انگریزی و ہندی نیز دیگر صوبائی زبانوں کے خواندہ افراد کی طلب بڑھی۔ان وجوہات کی بنا پر روز بہ روز اردو کا دائرہ محدود ہوتا گیا۔اردو کے وسائل سے اردو حلقہ محروم ہوتا گیا۔اخبارات کے علاوہ دیگر ذرائع ابلاغ،جن پر اردو کے پروگرام نشر ہوتے تھے ان کا ہندی پروگرام نام دیا جانے لگا۔فلم،ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش کیے جانے والے معیاری تہذیبی وثقافتی اور دیگر سماجی پروگرام،جن کی زبان تو اردو ہوتی تخلیق کار اردو حلقے کے ہوتے،لیکن اسے ہندی کا نام دیا جاتا۔سندیں ہندی کے نام پر جاری کی جاتیں۔یہ سب اسباب وذرائع ہیں جن سے اردو ختم ہونے کے قریب پہنچائی گئی۔لیکن آج پھر اس بات کو دہرانے کی ضرورت ہے کہ اردو زبان صحیح معنوں میں ایک جاندار اور قومی زبان ہے۔تحریک آزادی سے لے کر اب تک اردو پر کتنی افتاد پڑی،کتنے حوادث کا شکار ہوئی،طرح طرح کے نشیب وفراز سے دوچار ہوئی،تقسیم اور اس کے بھیانک انجام سے گزری تاہم انھیں مراحل اور سخت لمحوں نے اس کی آبیاری کی۔انھیں کے دیے زخموں نے اسے بیدار کیا۔اس کے دامن سے طرح طرح کے پرتاثیر نعرے پیدا ہوئے۔احتجاجی مکالمے تحریر ہوئے۔رگوں میں لہو کو گرمانے والے نغموں وگیتوں کی تخلیق ہوئی جو اخبارات ورسائل کی زینت بن کر عوام تک پہنچتے۔رفتہ رفتہ یہ زبان دوبارہ دلوں میں اپنی جگہ بناتی گئی۔اردو جذبوں کے اظہار کا وسیلہ ہے۔محبت کی زبان ہے،نرمی میں ریشم اور سختی میں فولاد ہے۔اردو زبان صلح بھی ہے پیکار بھی،گل بھی ہے تلوار بھی۔اس کی خوبیوں کی وجہ سے اسے دشمنوں نے بھی اختیار کیا۔

آج صورت حال بدل چکی ہے،اردو ہر ایک شعبے میں اپنی جگہ بنا چکی ہے۔سرکاری سطح پر بھی اس کو آگے بڑھانے کے لیے مواقع مل رہے ہیں،اکادمیوں کو فعال بنایا جارہا ہے،جگہ جگہ سرکاری،نیم سرکاری اور رضا کارانہ طور پر غیر سرکاری ادارے کھولے جارہے ہیں۔جن کے ذریعہ جگہ جگہ سمینار،سمپوزیم،مشاعرے اور طرح طرح کے پروگرام منعقد ہورہے ہیں۔نئے نئے جرائد و رسائل اور اخبارات کا اجراء عمل میں آرہا ہے۔بڑی تعداد میں کتابوں کی اشاعت ہورہی ہے۔صوبائی وریاستی سطح سے لے کر قومی و ملکی سطح کے پروگرام ومنصوبے بنائے جارہے ہیں۔اردو زبان اب ملک کی سرحدوں کو عبور کر کے غیر ممالک میں اپنی جڑیں مضبوط کررہی ہے،نئی نئی اردو آبادیاں بس رہی ہیں۔مغربی اقوام وعوام میں اردو زبان مقبول ہورہی ہے۔ان کے وفود ہندوستانی اردو اداروں کی تعلیمی سیاحت پر آرہے ہیں۔نئی مغربی نسل اردو میں تحقیق سے دلچسپی لے رہی ہے۔اردو شاعر ہر سال ہندوستان کے مشاعروں میں شرکت کرتا ہے۔اردو زبان کے عرب شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق کئی شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ہندوستان و پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک کے مشاعروں میں شرکت اردو زبان وصحافت کے لیے نیک فال ہے۔آئے دن ہندوستانی اخبارات دیگر مشرقی و مغربی ممالک میں ہونے والے اردو پروگرام کی تفصیلات انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا رہے،اپنی تعداد اشاعت کے اعتبار سے اردو صحافت دوسرے نمبر پر ہے۔اردو اخبارات کے مراکز،بنگلور،حیدرآباد،ممبئی،دلی اور کولکاتہ کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی ہیں جہاں سے اردو اخبار پابندی سے نکل رہے ہیں۔

اب اردو صحافت کی توسیع ہورہی ہے،اردو صحافت پرنٹ میڈیا سے باہر الیکٹرانک میڈیا میں بھی قدم جمارہی ہے۔ریڈیو کے علاوہ نئے نئے ٹیلی ویژن چینل اردو کے لیے خاص ہورہے ہیں۔ای ٹی وی،عالمی سہارا،زی سلام،دوردرشن،اے آروائی،کیوٹی وی،اردو ٹی وی،پیس ٹی وی،منصف ٹی وی،پیغام ٹی وی وغیرہ ایسے چینل شروع ہوچکے ہیں جو اردو کی خبریں اور پروگرام اردو سامعین

کی دلچسپی کے لیے اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں، اردو مبطوعہ صحافت سے الیکٹرانک صحافت کی طرف بڑھ کر اچھی پوزیشن اختیار کررہی ہے۔ اردو قارئین وسامعین کے لیے یہ ایک حوصلہ افزا قدم ہے۔ ہر سال اردو کو خاص مضمون بنا کر سول سروسز میں منتخب ہونے کے مواقع مل رہے ہیں، اب اردو دوسری زبانوں کی طرح آئی اے ایس آفیسر پیدا کررہی ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے نئے نئے کورسس متعارف ہورہے ہیں، جن اسکولوں میں اردو نہیں تھی ان میں اردو کو بطور مضمون شامل کیا جارہا ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے حال ہی میں ایک نئی یونیورسٹی، اردو عربی فارسی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے جس کے پہلے شیخ الجامعہ انیس انصاری ہیں۔ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی نے بھی اردو کے لیے اپنے دروازے کھول دیے ہیں۔ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی بطور خاص اردو زبان وصحافت کے لیے وقف ہے۔ گوتم بدھ یونیورسٹی نوئیڈا میں اردو شعبہ زبان وصحافت کی ترقی اور اردو آبادی کے لیے اپنی خدمات دے رہا ہے۔ گویا اردو زبان اور اردو قاری کے لیے اردو تعلیم اور روٹی روزی کی سہولت کے اب بہتر سے بہتر مواقع ہیں۔ اردو آبادی کو مین اسٹریم میں لانے اور ملک وقوم کی ترقی وفلاح کے لیے سرکاری سطح پر کوشش جاری ہے۔ ہمارے رہنما وحکمراں اردو کے لیے خاص مد مختص کررہے ہیں اور موقع بہ موقع یقین دہانی کی جاتی ہے۔ مذکورہ یونیورسٹی کے علاوہ بھی کئی اوپن جامعات ہیں جن میں اردو کے شعبے اور مضامین کی طرف دھیان دیا جارہا ہے۔

اردو فارغین کی تقرری کے زیادہ سے زیادہ مواقع مل رہے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے اردو ادارے اردو کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلانے کے لیے کوشاں ہیں۔ این سی پی یو ایل اردو کو الیکٹرانک میڈیا سے جوڑنے کے لیے کئی طریقے اپنا چکی ہے۔ اس کے کمپیوٹر مراکز ملک کے کونے کونے میں کھولے گئے ہیں۔ اردو خطاطی کے فروغ کے لیے مراکز کا اہتمام کیا ہے۔ اردو چینل سے اس کے رشتے ہموار ہورہے ہیں، این سی یو پی یو ایل کے ذریعے کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی تعاون دیا جارہا ہے۔ اس ادارے سے رسالہ ''اردو دنیا'' اور ''فکر وتحقیق'' کے علاوہ بچوں کے لیے ایک ماہنامہ ''بچوں کی دنیا'' کا اہتمام ہو چکا ہے۔ مزید تخلیقی ادب کے لیے ایک رسالہ شائع ہونے والا ہے۔

اردو زبان وصحافت کے لیے ہر چہار جانب سے مواقع کی فراہمی کے لیے راستہ ہموار ہے۔ پہلے سے زیادہ اردو اخبارات کو اشتہارات مل رہے ہیں اور اخبارات کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو حلقہ زیادہ سے زیادہ اردو کی طرف متوجہ ہو۔ اپنے گھروں میں اردو کی تعلیم وتدریس کا ماحول بنائے اور اردو کو ایک عصری ضرورت کے طور پر اپنائے۔ جب تک اردو قارئین میں اضافہ خاطر خواہ نہیں ہوگا ساری سہولت اور سارے مواقع بے کار رہوں گے۔ اس لیے ہم اردو والوں کی ذمہ داری ہے کہ نئی نسل کو اردو پڑھانے، سکھانے اور اردو کا ذوق وشوق پیدا کرنے میں وقت صرف کریں۔ تاکہ آئندہ نسل اردو کی بات کرنے میں اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے میں عار نہ محسوس کرے۔ بلکہ فخر محسوس کرے۔ اس وقت سارے جہاں میں دھوم اردو زبان کی ہے۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. آزادی سے قبل اردو صحافت کا کیا کردار رہا؟
2. تقسیم ملک کے بعد اردو کی حیثیت پر روشنی ڈالیے؟
3. اردو صحافت کی ترقی میں رکاوٹ کے اسباب کیا ہیں؟
4. اردو زبان و صحافت کی کسی ایک خوبی پر روشنی ڈالیے؟
5. عصر حاضر میں اردو صحافت کے فروغ کی کیا صورتیں ہیں؟
6. موجودہ دور اردو زبان و صحافت کے لیے کیسا ہے؟
7. اردو کے بہتر نتائج پر روشنی ڈالیے؟

## 2.4 صحافت کا فروغ اور جدید وسائل

ابلاغ و ترسیل کا عمل غیر شعوری اور فطری ہے۔ محسوسات و جذبات کو ایک دوسرے تک پہنچانے کا عمل ارادی سے زیادہ غیر ارادی ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ابلاغ شعوری عمل ہو گیا کیونکہ اس سے بہت ساری سماجی حصولیابی منسلک ہے۔ تجارتی فائدے، سیاسی فائدے کے علاوہ ترسیل ایک تفریح کا ذریعہ بھی ہے۔ وقت گزاری کے لیے دلچسپ پروگرام کی ترسیل انسانی زندگی میں خوش گواری پیدا کرتی ہے۔ موجودہ زمانے میں ابلاغ و ترسیل کا ذریعہ نئی تکنالوجی اور سائنس کی مدد سے نہایت ترقی یافتہ ہو چکی ہے۔ اب خبروں کو جاننے کے لیے مارننگ پیپر کا انتظار کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اپنے بیڈ روم میں بیٹھے سوئے پوری دنیا کی خبر لمحوں میں جان اور سن سکتے ہیں۔ انسانوں اور جانوروں کے ذریعے پہنچائی جانے والی خبریں، ریلوے اور پھر جہاز کے ذریعے کم وقت میں پہنچنے لگیں۔ جس کا شمار تہذیبی ارتقا میں ہوا۔ آج سائنس اور جدید ٹیکنالوجی نے دنیا کو نیا نام ''عالمی گاؤں'' دیا۔ یہ ساری برکتیں انسانی دماغ کی ایجاد کردہ جدید برقی رو کے ذریعے ملی ہیں۔

آج علوم و فنون اور خبر و اطلاعات کے سب سے تیز ذریعے پر انسان قابو پا چکا ہے۔ ہر انکشاف، ہر تخلیق آن کی آن میں دنیا کے گوشے گوشے سے فراہم کر دی جاتی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی ایجاد ریڈیو نے دوسری جنگ عظیم میں شہرت حاصل کی۔ گاؤں اور قصبوں میں جہاں اخبارات کی رسائی نہیں ہو پاتی تھی ریڈیو ایسے دور دراز علاقوں کے لیے ایک بہت بڑی نعمت تھی۔ جنگی میدان کی خبروں کے علاوہ دیگر ترقی یافتہ ملکوں کی پیش رفت سے جانکاری ملتی تھی۔ بی بی سی، آل انڈیا ریڈیو، جرمنی ریڈیو وغیرہ نے اپنی اردو نشریات کے ذریعے اردو صحافت میں چار چاند لگا دیے۔ مذہبی پروگرام، صبح سویرے تلاوت و تقریر، نعت خوانی، مشاعرے کی نشریات، ڈرامے، کھیل کود کی خبریں اور دوسری ظرافت پر مبنی پروگرام کی پیش کش نے اردو اور اردو صحافت کو بہت مقبول بنایا۔ ابتدا میں اکا دکا ریڈیو کی موجودگی پورے گاؤں و قصبے کی ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ کام کاج سے فرصت پا کر آبادی کے لوگ ایک خاص جگہ پر جمع ہوتے جہاں ایک آدمی

کے پاس ریڈیو ہوتا اور ساری دنیا کی خبروں سے آگہی ہوتی۔ جو کام اخبارات چوبیس گھنٹے میں کرتے وہاں ریڈیو سے پوری دنیا تک کم وقت میں انجام پاتے۔ ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو کی بنیاد یکم جنوری 1936 کو دہلی میں پڑی۔ اولاً برطانوی حکومت نے آل انڈیا ریڈیو کو اپنی جنگی کارروائیوں اور اپنے کارناموں کی تشہیر کا ذریعہ بنایا تھا۔ اسی زمانے میں اردو کے بڑے بڑے شعرا و ادبا ریڈیو سے جڑے تھے۔ پطرس بخاری اور ذوالفقار بخاری کے علاوہ میراجی، ن م راشد، کرشن چندر، اپیندر ناتھ اشک، مختار صدیقی، مجاز، اختر الایمان، بہزاد لکھنوی، سلطانہ جعفری، سلام مچھلی شہری، رفعت سروش اور پروفیسر مسعود حسین خان نے اردو نوازی اور اپنی اپنی ادبی صحافتی خدمات سے اردو اصناف کو مقبول خاص و عام بنایا۔ ان شخصیات نے ریڈیو نشریات کے ذریعے علم و فن، شعر و ادب، نغمہ و موسیقی اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کو عام کیا۔ جس سے ایک معاشرے کی حسن تعمیر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

جب ریڈیو نے ترقی کی تو اس کے انداز پیش کش کو مزید بہتر اور قابل التفات بنانے کے لیے ریڈیو نشریات کی حسن ترتیب و تنظیم کا خاص خیال رکھا جانے لگا۔ ریڈیائی ڈرامے و تقاریر کی پیش کش میں آواز، لب و لہجہ اور زبان کا پورا خیال کیا گیا۔ لہجے و آواز کے ذریعے شائستگی و متانت کا بھرپور مظاہرہ ہوتا۔ لکھنوی زبان و اسلوب اور تہذیب، بمبیا اردو نیز پنجابی طرز گفتار کے نمونے سے سامعین کو محظوظ کیا جاتا۔ ریڈیو دراصل قومی و حکومتی منصوبوں اور کارکردگیوں کو عوام تک پہنچانے کا بہترین و باعمل ذریعہ تھا۔ اس کی اچھی کارکردگی کے ساتھ ساتھ اس کے منفی نتائج بھی برآمد ہوئے۔ آزادی سے قبل یہ تہذیبی و ثقافتی ادارہ جمہوری تھا۔ مگر آزادی کے بعد رفتہ رفتہ تجارتی مرکز بن گیا اور اس کا بڑا مقصد دولت حاصل کرنا ٹھہرا۔ اب دیگر پروگراموں کے ساتھ ریڈیو پر بڑے بڑے اشتہارات نشر کیے جاتے ہیں۔ جن کا مقصد پیسہ کمانا ہے۔ ابتدائی دنوں میں ریڈیائی تخلیقات معیاری اعلیٰ اقدار کی نمائندگی کرتی تھیں۔ فحش و مخرب اخلاق ادب کے لیے ریڈیو پر کوئی جگہ نہیں تھی۔ ان سبب معیاری اصولوں سے قطع نظر اب ریڈیو تک رسائی کے لیے اثر و رسوخ کا استعمال ہوتا ہے۔ تحریروں اور فن پاروں کو نظر انداز کر کے سیاسی اختیارات و طاقت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جس سے ریڈیو کی اہمیت ہوتے ہوئے بھی اس کے معیار سے منفی خیال پیدا ہوا۔

الیکٹرانک میڈیا و برقی آلات کی ایجاد سے قبل اس کے افعال و اعمال سے مذہبی طور پر انسان اعتقاداً واقف تھا۔ لیکن فی زمانہ سائنس نے اسے سچ ثابت کر دیا۔ مذہبی پیغامات میں یہ باتیں بتائی جاتی تھیں کہ آج انسان جو کچھ کرتا ہے، بولتا اور کہتا ہے۔ ایک دن اسے اپنے کانوں سے سنے گا، آنکھوں سے دیکھے گا، خود بھی اپنے مکالمے و حرکات و سکنات سے انکار کرنا چاہے تو اس کے لیے ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ایک ایک بول ایک ایک حرکت و عمل کی ایک غیبی طاقت عکس گیر ہے۔ روشن دماغ، ترقی پسند اور مذہب سے بیزار انسان آج بھی اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ لیکن سائنسی ترقی نے جدید تکنیک کے ذریعے انجام پذیر واقعات و منصوبوں کو بعینہٖ محفوظ کر لینے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور خود انسان کا کچا چٹھا اس کے سامنے ہوتے ہوئے پیش کر دیتی ہے۔ یہ ہماری فلمی ایجاد و انکشاف اور اس کی ترقی سے ہوا ہے۔ آج انسان کچھ بھی کرتا ہے۔ دوسرے لمحے میں خود اپنی آنکھوں سے پردۂ سیمیں پر دیکھ لیتا ہے۔ یہ ہماری ابلاغی و ترسیلی اور صحافتی قوت و فتح کی اگلی منزل ہے۔ جہاں لفظوں اور جامد تصویری صحافت سے بڑھ کر متحرک تصویروں سے صحافتی خدمات نے سماج و معاشرے کو یقین و اعتماد کی دولت عطا کی۔ اس کے ذریعے ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے عظیم رہنماؤں، بڑے

بڑے بہادروں کے بلند حوصلہ اقدامات کو دکھایا جاتا ہے تاکہ آئندہ نسل کے اندر جذبہ وعزم پیدا ہو۔ تحصیل علم وفن کا جذبہ پروان چڑھے۔

ہمارا ملک جمہوری ہے۔ یہاں کے سبھی ادارے پاس جمہوریت کے پابند ہیں۔ فلمی دنیا میں بننے والی فلمیں ریلیز ہونے سے قبل ایک خاص ادارے کے ذریعے دیکھی اور جانچ کی جاتی ہیں تاکہ اس کے مثبت ومنفی نتائج واثرات سے واقف ہوا جائے اور قابل اعتراض حصے کو حذف کر دیا جائے۔ اس کے لیے ''سنسر بورڈ'' کی کوتاہ فہمی یا بعض ارکان کی تخریبی ذہنیت کے باعث ایسے منظر نامے ومکالمے بھی دکھا دیے جاتے ہیں جن سے کسی خاص طبقے میں بے چینی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ یہ عمل ایماندار اور سچی صحافت کے منافی ہے۔ اس کا غلط استعمال ہے۔ جو صحافتی ذمے داری وروح کے خلاف ہے۔ صحافت کا مقصد سماجی خدمت اور عوامی فلاح وبہبود ہے نہ کہ تخریب کاری۔ ہماری فلمی صحافت نے اعلیٰ اقدار، معیاری طرز گفتگو، سلیقہ مندی، قابل دید وقابل تقلید طرز حیات کو فلمی پردوں پر دکھا کر معاشرے میں سنجیدگی وشائستگی کے فروغ میں بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی کہانیاں، نغمے وگیت جہاں پیار ومحبت کا پیغام دیتے ہیں وہیں حب الوطنی پر مشتمل فلمیں بھی بنتی ہیں۔ پرانی فلموں کے نغمے ومنظر نامے اور مکالمے اپنی کشش وتاثیر میں آج کی فلموں سے بہت آگے تھیں۔ ان میں استعمال ہونے والی اردو زبان فصاحت وبلاغت کی تاثیر سے مملو ہوتی تھی۔ اس کے نغمے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیتے تھے۔ ان کے مکالموں میں ایک خاص پیغام ہوتا تھا جو کسی مخصوص منظر نامے سے پیوست ہوتے تھے۔ پرانی فلموں کے گیت آج بھی ماحول وفضا میں سکوت طاری کر دیتے ہیں، جس کا اثر دیر تک دل ودماغ پر رہتا ہے۔ یہ سب اردو زبان کی فلمی صحافت وابلاغ کا اعجاز ہے۔ فلمی دنیا میں آج بہت سارے مسلم وغیر مسلم ستارے اور تخلیق کار موجود ہیں جو اردو کی ترقی کے ہمنوا وحامی ہیں۔ آج بھی اردو میں لکھتے ہیں، اردو میں سوچتے ہیں اور اردو ہی بولتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اردو صحافت وادب کو دوبارہ اپنے قدم جمانے کا موقع مل رہا ہے۔ حالانکہ اب فلمی دنیا صد فیصد صارفیت وتجارت کی صنعت ومنڈی بن چکی ہے۔ تاہم اس کا میڈیم اردو زبان ہی ہے۔ کیوں کہ اُردو جذبوں کی ترسیل کی زبان ہے۔ اس کے بغیر تصور وخیال کی صحیح ترجمانی ممکن ہی نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ سنگین حالات میں بھی اکثر وبیشتر پارلیمنٹ میں ہونے والی بحثوں کے درمیان جانب دار رہنماؤں کی زبان سے بھی بے ساختہ ایسے اشعار ادا ہوتے ہیں جن کی ادائیگی کے بعد وہ رہنما خود تسکین قلب محسوس کرتے ہیں اور فاتحانہ انداز میں اپنی نشستوں پر بیٹھتے ہیں۔ آئے دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ سب اردو زبان کی غیر محسوس وغیر شعوری مقبولیت وتاثیر کا نتیجہ ہے۔

ریڈیو اور فلم صنعت کی بڑے پیمانے پر توسیع ٹیلی ویژن چینل ہیں۔ جو پل پل خبروں ومنظروں سے آگاہ کرتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر پیش کردہ پروگرام جہاں آگہی فراہم کرتے ہیں وہیں تفریح طبع اور علم وہنر کی تحصیل کا ذریعہ بھی ہیں۔ یہ دیگر صحافتی وسائل کی بہ نسبت زیادہ تیز اور پر تاثیر ہے۔ اس کی نشریات ہمہ وقت جاری رہتی ہیں اور پل پل بدلتے ہوئے منظر نامے کو دیکھاتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں کچھ ہوا ہو، ٹیلی ویژن چینل فوراً اسے اپنے چھوٹے پردے پر دکھاتے اور اس کی تفصیل سے مطلع کرتے ہیں۔

بسا اوقات اخبارات اور ریڈیو کی خبریں مشکوک ہونے اور من گھڑت ہونے کے خیال سے دوچار ہوتی ہیں۔ جبکہ ٹیلی ویژن پر ایسا امکان نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس پر پیش کردہ پروگرام پڑھنے اور سننے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں شبہات نہیں کے برابر ہوتے ہیں۔ اس لیے ٹیلی ویژن کی بصری اور صوری صحافت کا دائرہ وسیع تر ہوا ہے۔ گھر گھر، دروازے دروازے ٹیلی ویژن کی

رسائی سے ترسیلی عمل میں سرعت پیدا ہوتی ہے۔ زبان کی ادائیگی اور طرز ادا سے اردو صحافت میں دن بہ دن کشش پیدا ہوئی ہے۔ جرائم اور تشدد کی خبریں پیش کرنے میں کبھی کبھی غلو سے کام لیا جاتا ہے جس کے سبب بچوں پر اس کے منفی اثرات پڑتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر خبر پڑھنے والا اور ناظرین میں ایک طرح کی ذہنی قربت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیلی ویژن کی اہمیت ریڈیو اور اخبارات سے بڑھ جاتی ہے۔ ٹیلی ویژن کے انکشاف و فروغ سے ریڈیو و اخبارات کا قدرے نقصان بھی ہوا ہے، حالانکہ ریڈیو اور اخبارات کی قدر و منزلت اپنی جگہ مسلم ہے۔

ان جدید برقی وسائل کی وجہ سے اردو صحافت کو بہت فروغ ملا ہے۔ ان کے عملے میں اردو قارئین و فارغین کی طلب بڑھی ہے۔ جس کی وجہ سے آج اردو تعلیم کی تحصیل میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اردو صحافیوں کے لیے نئے نئے پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں اور انھیں صحافت کے جدید طریقوں سے آشنا کیا جا رہا ہے۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت نے اردو صحافت کو مزید توانائی عطا کی ہے۔ علم و فن کے سارے خزانے انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔ اخبارات و رسائل سے لے کر علم و ادب کی قدیم و جدید ضخیم کتابیں آج انٹرنیٹ کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہیں، ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ راستہ چلتے، سفر کرتے، اپنے موبائل فون پر انٹرنیٹ کے ذریعے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا میں انٹرنیٹ کو اہم مقام حاصل ہے انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے تقریباً سبھی بڑے شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات انٹرنیٹ سے پڑھے اور ڈاؤن لوڈ کیے جا سکتے ہیں۔ یہ عمل دنیا کے کسی بھی کونے میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کی اہم و بیشتر کتابیں، مصنّفین و شعرا اور ادبا کے حالات زندگی تصویروں کے ساتھ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اخبار کے دفتروں تک خبر بھیجنے و شائع کرنے کے لیے انٹرنیٹ نہایت کارآمد ذریعہ ہے۔ انٹرنیٹ نے اردو صحافت کو حد درجہ آسانی فراہم کر دی ہے۔ ای میل، فیس بک، بلاگ، ویب سائٹ، یوٹیوب اور ٹوئیٹر کے ذریعے آسانی سے اپنی بات اپنوں و غیروں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ روبہ رو ہو کر اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر شکوہ و شکایت اور ذوق کی تسکین کی جا سکتی ہے۔ تاہم یہ ذہن نشیں رہے کہ اس کے ضرر رساں و منفی اثرات بھی پڑ سکتے ہیں۔ اس کے غلط استعمال سے حد درجہ نقصان کا امکان بھی ہے۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. صحافت کے جدید و مسائل سے کیا مراد ہے؟
2. برقی صحافت (الیکٹرانک میڈیا) کون کون سی ہیں؟
3. برقی صحافت نے مطبوعہ صحافت کو کس حد تک متاثر کیا؟
4. انٹرنیٹ کا دائرۂ کار کیا ہے؟

5. انٹرنیٹ کے منفی پہلو پر روشنی ڈالیے؟

6. صحافت کے نقصانات اور اس کے تجارتی پہلو کو اجاگر کریے؟

7. موجودہ برقی صحافت کے معیار و قدر کی وضاحت کیجیے؟

## 2.5 خلاصہ

جب صحافت کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن میں ایک سوال اٹھتا ہے کہ کیا سماج کے لیے صحافت کا وجود لازم ہے۔ اگر صحافت نہ ہوتی تو کیا سماج ترقی نہیں کرتا۔ دراصل سماج کی ترقی کا انحصار صحافت پر ہی ہے بلکہ بہتر سماج اور پرامن معاشرے کے لیے صحافت کا ہونا از حد ضروری ہے۔ ارکان سلطنت ہوں یا سماج کا طاقتور گروہ جو سماج و ملک کے مستقبل کو بہتر بنانے میں مصروف رہتے ہیں اور ہر آن اپنی موجودگی کا احساس سماج کو دلاتے رہتے ہیں۔ ان کے حرکات وسکنات اور افعال و اعمال کا جائزہ لینے کے لیے صحافت ایک ضروری عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس اکائی میں صحافت کی اہمیت وضرورت پر بحث کی گئی ہے۔ آیا صحافت کیوں اتنی اہم اور ضروری شے ہے۔ صحافت کی موجودگی میں۔ صحافت کو اپنے طور پر کام کرنے میں کیوں مسائل سامنے آتے ہیں ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے اور صحافت کے امکانات کس حد تک ہیں۔ ان سارے نکات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مزید صحافت کے فروغ میں کن کن وسائل کا استعمال ہوتا ہے اور جدید وسائل اردو صحافت میں کہاں تک بروئے کار آتے ہیں۔ ان کی تفصیل اس اکائی میں بیان کی گئی ہے۔ یہ سارے مباحث تین ذیلی عنوانات ونکات کے ذریعے گفتگو میں لائے گئے ہیں۔ مشکل الفاظ و معانی کی ایک فرہنگ دی گئی ہے۔ نیز مزید مطالعے کے مقصد سے چند کتب کی فہرست درج ہے۔

## 2.6 فرہنگ

| الفاظ | معانی |
|---|---|
| سنتری | نگہبان |
| برانگیختہ کرنا | ابھارنا، جگانا |
| سنگین | ایک خاص طرح کا اسلحہ |
| عسکری قوت | سامانِ جنگ، جنگی آلات |
| انحطاط | گراوٹ، ذلت |

| | |
|---|---|
| عقوبت | سزا، عذاب |
| طلسم | جادو |
| لبمل | زخمی، مجروح |
| جمود و تعطل | ناکارہ پن، قوت کارکردگی سے محروم |
| اتلاف | نقصان |
| افتاد | پریشانی، مصیبت |
| مکالمے | ڈائیلاگ |
| تشہیر | تبلیغ، پھیلاؤ |
| متانت | سنجیدگی |
| برقی صحافت | الیکٹرانک میڈیا |
| غلو | حد سے زیادہ |

## 2.7 سفارش کردہ کتب

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1. | اردو صحافت کا سفر | گربچن چندن | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ستمبر 2007 |
| 2. | آل انڈیا ریڈیو اور اردو | رفعت سروش | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2008 |
| 3. | اردو صحافت، مسائل اور امکانات | ڈاکٹر ہمایوں اشرف | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2006 |
| 4. | مغربی میڈیا اور اس کے اثرات | نذر الحفیظ ندوی | دار العلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ 2001 |
| 5. | جدید ابلاغ عام | مہدی حسن | مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1990 |
| 6. | اردو: ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان | کمال احمد صدیقی | قومی اردو کونسل، نئی دہلی 1998 |
| 7. | ریڈیائی صحافت | سجاد حیدر | مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1981 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| .8 | نشریات اور آل انڈیا ریڈیو | اخلاق اثر | مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1982 |
| .9 | ٹیلی ویژن نشریات | انجم عثمانی | مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1994 |
| .10 | آف دی ریکارڈ | ڈاکٹر شاہد پرویز | آئیڈیا پبلی کیشن، دہلی 2002 |

# اکائی-3: اُردو صحافت کا آغاز وارتقا

ساخت


3.1 تمہید

3.2 ہندوستان میں اخبارنویسی کا آغاز

3.3 میں اُردو اخبارنویسی کا آغاز

34 ہندوستان میں اُردو صحافت کا ارتقا

3.5 خلاصہ

3.6 فرہنگ

3.7 سفارش کردہ کتب


## 3.1 تمہید

اس بحث سے قبل صحافت کے آغاز وارتقا سے متعلق بات کی گئی ہے۔جس کی رو سے بحیثیت مجموعی ہندوستان میں صحافت پر گفتگو ہوئی اور پتا چلا کہ ہندوستان میں باعتبار تاریخ اولاً انگریزی صحافت کا آغاز ہوا،اس کے بعد بنگالی صحافت کا جنم ہوا۔ان دونوں زبانوں کی صحافت نے اردو زبان کی صحافت کے لیے راہ ہموار کی۔اور اردو صحافت کا آغاز ہوا۔اس اکائی میں اردو زبان کے پہلے اخبار''دہلی اردو اخبار'' سے گفتگو کا آغاز ہوتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز کس اخبار سے ہوا۔اس کے بانی کون تھے،شمالی ہند دہلی میں سب سے پہلے اخبار کا اجرا کہاں سے ہوا۔اس ضمن میں چند اقتباسات بھی نقل کیے گئے ہیں اور محققین کی آرا کے مطابق''دہلی اردو اخبار'' کو پہلا اخبار ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

تیسری اور آخری بحث ہندوستان میں اردو صحافت کا ارتقا ہے۔جس میں جنگ آزادی میں فعال اخباروں وصحافیوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔مثلاً 'زمیندار'، 'پیسہ اخبار'، 'سید الاخبار'، 'صادق الاخبار'، 'کوہ نور'، 'لکھنؤ اخبار'، 'جام جمشید'، 'مدینہ'، 'الہلال'، 'البلاغ'، 'لسان الصدق'، 'ہمدرد'، 'اردوئے معلیٰ'، اور 'سرسید' کے تہذیب الاخلاق اور سائنٹی فک سوسائٹی کا ذکر بطور خاص ہوا ہے۔آخر میں الفاظ ومعانی کی فرہنگ اور چند کتب کی فہرست درج کی گئی ہے۔

## 3.2 ہندوستان میں اخبارنویسی کا آغاز

ضرورت بے شک ایجاد کی ماں ہے، تاہم ایجاد بھی وسائل پر منحصر ہے۔ بعض اوقات وسائل کی عدم فراہمی کے سبب بڑی ضروریات کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔ جتنی بڑی ضرورت ہوتی ہے اسی قدر وسائل وسرمایہ درکا ہوتا ہے۔ ہندوستان قدیم تکثیری ملک ہے۔ اس لحاظ سے اس کی ضروریات بھی مختلف ہیں۔ یہاں کی آب وہوا اور مٹی میں رواداری ہے۔ یہاں کارواں آتے رہے، جاتے رہے۔ اپنی پسند کے مطابق علاقوں وخطوں کا انتخاب کرتے رہے۔ اور بستے رہے۔

ہندوستان بے شمار بولیوں اور زبانوں کا ملک ہے۔ بہت ساری بولیاں قبل از تاریخ پیدا ہوئیں اور ختم ہوگئیں۔ لیکن سب کے اپنے اپنے ترسیلی وسائل تھے۔ بعد التواریخ ہندوستانی عوام اپنے ذرائع کے مطابق اپنی ترسیلی وابلاغی ضرورت کی تکمیل کرتے رہے۔ عہد سلاطین میں مراسلہ نگاروں کے ذریعے ترسیلی کام انجام پاتے تھے۔ اس دور میں انھیں 'برید' کہا جاتا تھا۔ جو عربی کا لفظ ہے۔ مغلوں کے عہد میں 'وقائع نگار' اور خفیہ نویس نیز سوانح نگار ہوا کرتے تھے۔ یہ طریقہ فارسی کی قلمی صحافت اور انگریزی کی صحافت سے تقریباً تین سو سال پہلے سے ہندوستان میں رائج تھا۔ ہندوستان میں اردو صحافت کے لیے بہت پہلے سے راستہ ہموار ہو رہا تھا۔ لیکن ذرائع اور وسیلے کے فقدان سے یہ تاریخی قدم اٹھنا محال تھا۔

لہٰذا مطبوعہ صحافت کا یہ اہم اور دستاویزی قدم انگریزی زبان سے اٹھا اور 29 جنوری 1780 میں جیمس آگسٹس ہکی (James Augustus Hicky) کے کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر یا (Hicky's Bengal Gozette) سے ہندوستان میں مطبوعہ صحافت شروع ہوئی۔ فارسی کی قلمی صحافت اپنی خدمات ادا کر رہی تھی۔ اس بنگالی گزٹ کے بعد کئی انگریزی کے اخبارات شائع ہوئے ۔مثلاً 1780 میں 'انڈی گزٹ' بنگال پریسڈنسی سے جاری ہوا۔ 1784 میں 'کلکتہ گزٹ' جاری ہوا۔ اس طرح بنگال گزٹ 1785 میں 'انڈین ورلڈ' 1791، بنگال ہرکارو 1795 اور 1799 میں چار اخبار جاری ہوئے۔ ایشیاٹک مرر، ٹیلی گراف، مارننگ پوسٹ اور اورینٹل اسٹا۔ 1785 میں 'مدراس کوریئر' مدراس پریسڈنسی سے نکلا۔ اس کے علاوہ 1795 میں 'مدراس گزٹ' نکلا اور اسی سال میں 'انڈیا ہیرالڈ' جاری ہوا۔ 'بامبے ہیرالڈ' بمبئی پریسڈنسی کی دین ہے جو 1789 میں جاری ہوا۔ اس کے علاوہ بمبئی سے 'بمبئی گزٹ' اور 'بامبے کوریئر نکلے۔ یہ ہندوستان میں مطبوعہ صحافت کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس کے بعد سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے بدلنے سے ہندوستان کی عام فضا میں ایک نئی تبدیلی آئی اور یہاں کے قدیم باشندوں کو اپنی بولی وزبان میں اخبار جاری کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور 1821 میں راجہ رام موہن رائے نے 'سمباد کومدی' نام کا اخبار جاری کیا۔ ہندوستان میں مطبوعہ انگریزی صحافت کے بعد یہ پہلا بنگالی اخبار ہے۔ راجہ رام موہن رائے نے 1822 میں 'مراۃ الاخبار' فارسی میں شائع کیا۔ ان دونوں اخباروں کے مالک و مدیر خود راجہ رام موہن رائے تھے۔ اس کے علاوہ 1822 ہی میں 'سماچار چندریکا' بنگالی میں اور 'جام جہاں نما' فارسی میں جاری ہوا۔ درج بالا چاروں اخبارات ہفت روزہ تھے۔

باعتبار زمانہ وتعداد تجزیہ کیا جائے تو ہندوستان میں بنگالی صحافت کو دوسرے نمبر پر رکھا جائے گا اور تیسرے نمبر پر فارسی صحافت آئے گی۔ جبکہ اولیت کا سہرا انگریزی صحافت کے سر جاتا ہے، جو ہندوستان کی مطبوعہ صحافت کی بنیاد بنی۔

'جام جہاں نما' کی تاریخ اشاعت پر اختلاف ہے اور ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ اس کا فارسی شماہ پہلے شائع ہوا یا اردو اور اس کی حیثیت پر بھی اختلاف ہے۔ بیشتر مورخین کے نزدیک 'جام جہاں نما' ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایما پر شائع کیا گیا اور یہ مغربی کمپنی کا ترجمان تھا۔ کیونکہ اس کی اشاعت کے وقت اس کے سرورق پر دو عکس تھے۔ ساری تفصیلات سے قطع نظر 'جام جہاں نما' کی اشاعت سے ایک عظیم نکتے کا انکشاف یہ ہوتا ہے کہ فارسی یا اردو ایک سیکولر، جمہوری اور قدیم زبان ہے جو صحافتی عہد سے قبل ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے کہ انگریزی ایک خاص طبقے کے لیے تھی، بنگالی بھی مخصوص خطے کی زبان تھی۔ رہی فارسی اور اردو تو، اس کو سب نے اپنایا تھا۔ اس کا ثبوت 'جام جہاں نما' کی اشاعت ہے۔ جو سب کے اظہار کا ذریعہ تھی اور اس کے مالک ہری ہردت اور مدیر منشی لالہ سدا سکھ تھے اور فارسی اخبار 'مرآۃ الاخبار' کے مالک و مدیر راجہ رام موہن رائے تھے۔ گویا فارسی اور اردو زبان کی صحافت کے اولین نقوش ہندو خاندانوں سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ہری ہردت 'جام جہاں نما' کے مالک اور 'مرآۃ الاخبار' کے مالک و مدیر راجہ رام موہن رائے کے علمی معاون تارا چند دت کے بیٹے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے شعبۂ مالیات میں ملازم تھے۔ اخبار 'جام جہاں نما' کی مزید تفصیلات اردو صحافت کے ضمن میں آگے آئیں گی۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. ہندوستان میں پہلا اخبار کس زبان میں کب اور کہاں سے شائع ہوا؟
2. ہندوستان میں پہلے فارسی اخبار کے سنہ اشاعت، مقام، مالک اور مدیر کا نام بتاؤ؟
3. 'جام جہاں نما' کے متعلق مورخین کا کیا خیال ہے۔ وضاحت کیجیے؟

## 3.3 اردو اخبار نویسی کا آغاز

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں باقاعدہ صحافت و اخبار نویسی کے آغاز کا سہرا مغربی کمپنی کے سر جاتا ہے۔ ہندوستان میں مغربی کمپنی کی زبان گرچہ انگریزی تھی اور ان کی صحافتی زبان بھی انگریزی تھی اور اس کا فائدہ صرف مخصوص طبقے ہی کو پہنچتا تھا۔ لیکن اس کے دفتری کام کاج کی زبان فارسی تھی جو اس وقت پورے ہندوستان میں رائج تھی اور تاہم بول چال کی زبان ہندوستانی یا اردو ترقی کر رہی تھی۔ فارسی زبان و ادب مغلوں کی برتری و غلبے کی علامت تھی اور یہی زبان ایسٹ انڈیا کمپنی کی مغلوبیت اور احساس پستی کی نشانی تھی۔ عوام میں رسائی حاصل کرنے کے لیے کمپنی فارسی کی جگہ اردو کو فروغ دینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی گئی۔ جس میں قدیم فارسی علم و ادب کو اردو میں منتقل کیا جاتا تھا جس سے اردو پروان چڑھ رہی تھی۔ لیکن ہندوستان میں اردو کو ابھی ترسیلی و صحافتی زبان ہونے کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ انگریزی زبان کی صحافت ہندوستان میں قدم جما چکی تھی لیکن اس تک عوام کی رسائی نہیں تھی۔ انگریزی صحافت سے حوصلہ پا کر فورٹ ولیم کالج کے چند افراد کے ذہن و دل میں اردو زبان میں صحافت کا خیال پیدا ہوا۔ لہٰذا اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فورٹ ولیم کالج کے شعبہ مالیات کے محرر ہری ہردت ہنگو نے کمپنی کے سربراہوں کو

ایک درخواست دی جس میں اردو اور فارسی صحافت کے آغاز کی منظوری مانگی گئی تھی۔ اجازت مل گئی۔

27 مارچ 1822 کو اردو کا پہلا اخبار ہری ہردت کی نگرانی میں 'جام جہاں نما' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ اخبار چھ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے مدیر مرزا پور کے منشی سدا سکھ لال تھے۔ 19 مئی 1822 کو اردو 'جام جہاں نما' کا فارسی ضمیمہ نکلنا شروع ہوا۔ جو چار صفحات پر مشتمل تھا۔ اردو یا ہندوستانی بول چال کی زبان تو تھی اور ترقی کر رہی تھی، لیکن ابھی صحافت کے فرائض انجام دینے سے قاصر تھی۔ تاہم اردو اخبار 'جام جہاں نما' کا فارسی ضمیمہ مقبول ہوتا گیا اردو 'جام جہاں نما' کا صرف چھ شمارہ نکل سکا۔ اس کے بعد اردو اخبار کی زبان مکمل طور پر فارسی ہوگئی۔ چونکہ اخبار نکلنے کی اجازت دونوں زبان میں لی گئی تھی اس لیے فارسی میں نکالنے میں کوئی تردد نہیں ہوا۔ لیکن اب فارسی 'جام جہاں نما' کا ضمیمہ ایک سال بعد 1823 میں بصورت اردو نکلنا شروع ہوا اور چار سال آٹھ ماہ کے بعد 23 جنوری 1828 کو بند ہوگیا۔

اس اخبار کی تاریخ اشاعت میں محققین کے نزدیک اختلاف رائے بھی پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک اولاً فارسی شمارہ جاری ہوا تھا۔ جب کہ بعض کے نزدیک اردو 'جام جہاں نما' کو اولیت کا مقام حاصل ہے۔ ہندوستان میں دیسی صحافت یا دیسی اخبار نویسی کی ابتدا 1818 میں ہو چکی تھی۔ سیرام پور کلکتہ میں عیسائیت کی تبلیغ و ترویج کے لیے ایک مشن قائم ہوا جس کا مقصد بنگالیوں میں عیسائیت کی تبلیغ تھا۔ 1800 میں قیام مشن کے بعد عیسائیوں نے انگریزی، فارسی اور بنگلہ زبان میں رسائل و اخبارات جاری کیے۔ اس مدت میں انھوں نے فن طباعت کو ترقی دی اور 'ڈگ درشن' نام کا ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ جس کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا۔ اس رسالے کے بعد ان کا حوصلہ بڑھا تو ایک ہفتہ وار 'سماچار درپن' 23 مئی 1818 میں بنگلہ زبان میں جاری کیا۔ یہ اخبار حکومت کا ترجمان تھا۔ اس لیے اسے حکومت کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس سے عوام کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

دراصل ہندوستان میں دیسی صحافت یا دیسی اخبار نویسی کا آغاز راجہ رام موہن رائے نے کیا۔ جو ایک عربی، فارسی، بنگلہ اور انگریزی کے باوقار عالم تھے، جن کا شمار مصلحین میں ہوتا تھا۔ راجہ رام موہن رائے نے پہلا اخبار بنگلہ زبان میں ''سمباد کا مودی'' نکالا۔ یہ ہفت روزہ اخبار دسمبر 1821 میں نکلا۔ اس کے بعد فارسی ہفتہ وار ''مراۃ الاخبار'' 20 اپریل 1822 کو راجہ رام موہن رائے نے نکالا جو فارسی کا پہلا اخبار تھا۔ اس اخبار سے قبل اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' 27 مارچ 1822 کو شائع ہو چکا تھا۔ جو تین اوراق (چھ صفحات) پر مبنی تھا اور اسی اردو ''جام جہاں نما'' کا فارسی ضمیمہ 19 مئی 1822 سے نکلنا شروع ہوا۔

''جام جہاں نما'' اردو اور فارسی کی تاریخ اشاعت پر جو محققین کا اختلاف ہے وہ ''مرأۃ الاخبار'' کے ایڈیٹر کے ایک اعلان نامے سے کافی حد تک حل ہوتا نظر آتا ہے۔ جو کلکتہ جنرل'' میں چھپا تھا۔

> ''ایڈیٹر لوگوں کو مطلع کرتا ہے کہ اس ملک میں بہت سے اخبار چھپتے ہیں۔ لیکن فارسی کا کوئی اخبار ابھی تک نہیں جس سے ان لوگوں کو عموماً جو انگریزی سے ناواقف ہیں اور شمالی ہند کے رہنے والوں کو خصوصاً خبریں معلوم ہوسکیں۔ چنانچہ وہ ایک فارسی اخبار جاری کرنے کا کام شروع کر رہا ہے۔''
>
> (کلکتہ جنرل، جلد دوم 98، 22 اپریل، 1822، صفحہ 583)

درج بالا اعلان کی تحریر 22 اپریل 1822 کی ہے، جب کہ ''جام جہاں نما'' 27 مارچ 1822 کو نکل چکا تھا۔ اگر 'جام جہاں نما' کا اولین شمارہ فارسی میں ہوتا تو 22 اپریل 1822 کے اعلان کی یہ تحریر ''لیکن فارسی کا کوئی اخبار ابھی تک نہیں نکلا'' نہ ہوتی جو ''کلکتہ جنرل'' میں چھپی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ 27 مارچ 1822 کو شائع ہونے والا اخبار ''جام جہاں نما'' اردو کا ہی شمارہ ہے۔ تاہم محمد عتیق صدیقی کی تحقیق اس کے برعکس ہے۔ ان کے نزدیک مارچ 1822 کے بجائے۔ مئی 1822 سے ''جام جہاں نما'' کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور یہ اردو میں نہیں بلکہ فارسی زبان میں تھا۔ البتہ اردو کا شمارہ بطور ضمیمہ اس کے ساتھ ہی نکلنا شروع ہوا۔ جو اپنے مواد ومضامین کے لحاظ سے خود ایک علاحدہ اخبار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر نادر علی خان کی تحقیق بالکل مختلف ہے۔ تحریر ملاحظہ ہو:

> ''ابتداً 'جام جہاں نما' صرف اردو میں ہی شائع ہوتا تھا۔ اور بقول جان بل اخبار مذکورہ میں مالک و مدیر اور طابع کے اسمائے گرامی درج نہیں ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ شمارہ نمبر کا بھی اہتمام نہیں تھا۔ آٹھویں شمارے (مورخہ 15 مئی 1822 بروز بدھ) سے فارسی کا ایک کالم شروع کیا گیا جو اس درجہ مقبول ہوا کہ دو شماروں کے بعد اخبار اردو کے بجائے فارسی ہی میں شائع ہونے لگا۔ اور اسی اشاعت کے ساتھ شمارہ نمبر کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اس طرح گویا 29 مئی 1822 سے فارسی کے دور کا آغاز ہوا۔''
>
> (نادر علی خاں، اردو صحافت کی تاریخ، صفحہ 36، 1987، ایجوکیشن ہاؤس علی گڑھ)

اگر جام جہاں نما کی تاریخ اشاعت پر غور کیا جائے تو ڈاکٹر نادر علی خان کی تحقیق سب سے مختلف ہے۔ اور دیر آید ہے۔ اس لیے استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ اردو جام جہاں نما کی تاریخ اشاعت امداد صابری کے مطابق 27 مارچ 1822 ہی ہے، جو بعد میں فارسی زبان میں نکلنا شروع ہوا۔ اس کا اردو ضمیمہ 23 مئی 1823 سے نکلا۔ تاہم تمام اختلاف کے باوجود سبھی محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اردو کی مطبوعہ صحافت کا آغاز 'جام جہاں نما' ہی سے ہوا۔ اب تک کی تحقیق سے یہی ثابت ہو سکا ہے۔ ایک روایت کے مطابق جو مصدقہ نہیں ہے اردو کا سب سے پہلا اخبار ٹیپو سلطان نے ''فوجی اخبار'' کے نام سے 1794 میں میسور سے نکالا تھا، جو ٹیپو سلطان کی شہادت کے ساتھ 1799 میں بند ہو گا۔ اس کی مزید تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔

جام جہاں نما اپنے مواد ومشمولات کے انتخاب وترتیب اور اسلوب تحریر کے اعتبار سے اپنے فارسی شمارے سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے بیشتر مواد انگریزی کے اخبار سے اخذ کیے جاتے اور ترجمہ کے بعد اردو میں شامل ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ قلمی دیسی اخبارات سے خبریں حاصل کی جاتی تھیں جو فارسی سے اردو میں ترجمہ کے بعد شامل ہوتی تھیں۔ یہ خبریں تعداد کے اعتبار سے فارسی شمارے سے بہت کم ہوا کرتی تھیں اور نوعیت بھی الگ ہوتی تھی۔ فارسی شمارے کی خبریں زیادہ تر حکومت کی پالیسی وحسن کارکردگی پر مشتمل ہوتی تھیں اردو شمارے میں اس کا خاص اہتمام نہیں تھا۔ اردو جام جہاں نما میں مضامین، نظمیں اور غزلیں بھی چھپتی تھیں۔ اس لیے کہ دوبارہ جام جہاں نما کی اشاعت کا ایک مقصد نو وارد انگریزوں کو اردو زبان وادب سے واقف کرانا بھی تھا اور اس کے پیچھے ریاستی حکومتوں اور عوام سے متعلق جانکاری حاصل کرنا بھی تھا۔ اس عمل سے کمپنی کو کتنا فائدہ ہوا یہ الگ بات ہے تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اردو

زبان وصحافت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ اولاً اس اخبار کو کمپنی کی سرپرستی حاصل رہی۔ بعد میں حکومت پر نکتہ چینی کے سبب اس کا مواخذہ بھی ہوا۔ 1830 تک تمام سرکاری دفاتر وشعبہ جات میں فارسی کا رواج رہا اور 1830 میں کمپنی کی حکومت نے اپنے اثر ورسوخ اور غلبے کو ثابت کرنے کے لیے فارسی کی جگہ اردو زبان کو سرکاری درجہ دیا جس کے سبب اردو زبان وادب اور اردو صحافت کو بھی شعبوں میں آگے بڑھنے کا موقع ملا اور اردو زبان میں تدریسی عمل بڑھ گیا۔ دفتروں اور عدالتوں میں کام کاج کی زبان اردو ہوگئی۔ آج بھی عدالتوں، تحصیلوں نیز دیگر سرکاری شعبوں میں فارسی، عربی اور اردو کی اصطلاحات رائج ہیں، جو مشترکہ تہذیب و ثقافت کی علامت ہے۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. پہلا اردو اخبار ہندوستان کے کس شہر سے نکلا؟
2. ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز کس نے کیا؟
3. جام جہاں نما کی اشاعت کا مقصد کیا تھا؟
4. ہندوستانی صحافت کا اردو صحافت پر کیا اثر مرتب ہوا؟
5. جام جہاں نما میں خبروں کی فراہمی کے کیا ذرائع تھے؟

## 3.4 ہندوستان میں اردو صحافت کا ارتقا

'جام جہاں نما' کو اردو کا پہلا اخبار تسلیم کیا گیا ہے۔ جس کی تاریخ اشاعت 27 مارچ 1822 ہے۔ صحافت کی تاریخی ارتقا کے مطابق 'دہلی اخبار' کو، جو بعد میں ''دہلی اردو دنیا'' ہوگیا تھا، جام جہاں نما کے بعد شمالی ہند دہلی کا پہلا اور اردو کا دوسرا اخبار مانا جاتا ہے۔ جس کا اجرا 1837 میں محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے کیا۔ لیکن علی جواد زیدی کے مطابق 'جام جہاں نما' کی اشاعت کے ایک سال بعد ایک اخبار ''شمس الاخبار'' کے نام سے شائع ہوا۔ اور پانچ سال تک جاری رہا۔ علی جواد زیدی نے اپنی تحریروں میں ''شمس الاخبار'' کی تاریخ اشاعت درج نہیں کی ہے۔ تاہم ان کے اسلوب تحریر سے ''شمس الاخبار'' اردو کا دوسرا اخبار ثابت ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''کلکتہ پہلا صحافتی مرکز تھا۔ ''جام جہاں نما'' کے بعد دوسرے مرکز سے بھی اخبارات و رسائل نکلنا شروع ہوئے۔ اردو اخبارات نے تمام ملک کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ سال بھر کے بعد منی رام ٹھاکر نے ''شمس الاخبار'' نکالا جو پانچ سال چل کے بند ہوا۔''
>
> (رسالہ 'عصری ادب' دہلی، جولائی-اکتوبر 1976)

درج بالا حوالے سے ''دہلی اخبار'' کے بجائے ''شمس الاخبار'' کو دوسرا اخبار ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔لیکن آفتاب عالم بیگ کے مطابق 1834 میں اخبار ''آئینہ سکندری'' جاری ہو چکا تھا۔آفتاب عالم بیگ تحریر کرتے ہیں:

''انیسویں صدی کے نصف حصے یا پہلی جنگ آزادی 1857 سے قبل تک ہندوستان کے مختلف شہروں سے متعدد اخبارات جاری ہو چکے تھے۔ چنانچہ 1834 میں بمبئی سے ''آئینہ سکندری'' اردو میں جاری ہوا۔حالانکہ فارسی زبان میں یہ اخبار 26 اپریل 1822 ہی سے جاری تھا۔ یہ ایک نیم سرکاری اخبار تھا اور بمبئی کے گورنر کی ایما پر جاری ہوا تھا۔ یہ اخبار ٹائپ میں چھپتا تھا۔انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جو سب سے بڑا اخبار سامنے آیا وہ ہے ''دہلی اردو اخبار'' جسے اردو کے مشہور انشا پرداز مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے 1836 میں جاری کیا تھا۔''

(ترجمہ نگاری اور ابلاغیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ص 225)

آفتاب عالم بیگ کی تحقیق کے لحاظ سے ''دہلی اردو اخبار'' کی اجرا کی نوعیت چوتھے نمبر پر ہے۔لیکن مشمولات و مندرجات کے اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل اخبار ہے۔جبکہ ''آئینہ سکندری'' نیم سرکاری تھا۔اہمیت و مقبولیت اور شہرت کے لحاظ سے ''دہلی اردو اخبار'' اردو کا دوسرا اخبار ہی سمجھا جاتا ہے۔دہلی اردو اخبار کا اجرا 1836 میں پریس کو آزادی ملنے کے بعد ہوا۔''دہلی اردو اخبار'' کا نام تیسری مرتبہ بدل کر 1857 میں اخبار الظفر'' رکھا گیا۔جو 13 ستمبر 1857 تک جاری رہا اور 20 ستمبر کا نکلنے والا شمارہ 1857 میں دہلی کے ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ جو کبھی طباعت کا جامہ نہیں پہن سکا۔ 1857 میں مولوی محمد باقر انگریزوں کی گولی سے شہید ہو گئے۔مولوی محمد باقر کو جنگ آزادی کا پہلا شہید صحافی مانا جاتا ہے۔

''جام جہاں نما'' کی طرح یہ اخبار بھی ہفت روزہ تھا۔ جام جہاں نما کے بعد نکلنے والے بیشتر اخباروں نے اس کے انداز طباعت کو اختیار کیا۔محمد باقر کو صحافت سے فطری وابستگی تھی۔انھوں نے بھی جام جہاں نما کے انداز کو اپنایا مگر اپنی تخلیقی اختراع سے اسے جدید صحافت سے روشناس کیا۔اپنے مندرجات کو جاذب و دلچسپ بناتے اور قابل توجہ عنوانات سے کالم کو سجاتے۔حالات حاضرہ اور خبریں ان کی توجہ کا مرکز ہوتی تھیں۔خبروں کی ترتیب تاریخ اور دن کے اعتبار سے ہوتی جس سے ہفت روزہ اخبار میں روزنامے کی خصوصیت پیدا ہو گئی تھی۔ 1841 میں سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے ایک اخبار ''سیدالاخبار'' کے نام سے جاری کیا۔ جس کے مدیر سید عبدالغفور تھے۔ان دنوں سید محمد خاں سرکاری ملازم تھے۔ان اخبارات کے بعد کئی اخبار منظر عام پر یکے بعد دیگرے آئے۔ایک فعال و متحرک صحافی سید اولاد علی کی ادارت میں 1841 ہی میں اخبار ''آئینہ گیتی نما'' شائع ہوا۔اس کے فوراً ایک سال کے بعد 1842 میں سید رحمت اللہ کی ادارت میں مدراس سے ''جامع الاخبار'' شائع ہوا۔جنوبی ہند کا یہ پہلا اردو اخبار مانا جاتا ہے۔ یہ اخبار سولہ صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ انگریزی اخبارات کے نہج کو محیط تھا۔اپنے دور کا بہترین ترجمان سمجھا جاتا تھا۔جس کی زبان خالص اردو کے بجائے علاقائی الفاظ و محاورات سے مزین تھی۔

ملک کی ترقی اور اردو صحافت کے ارتقا میں دلی کالج کا بڑا حصہ ہے۔اس کالج سے ایک اخبار اور ایک رسالہ 1845 میں

جاری ہوا۔ ہفتہ وار اخبار ''قران السعدین'' کے پہلے مدیر پنڈت دھرم نارائن بھاسکر تھے۔ دلی کالج سے ہفتہ وار اخبار ''قران السعدین'' میں ادب وسائنس کے علاوہ سیاسی اور علمی مضامین اپنے تنوع کے باعث ہندوستان سے چند اہم اخباروں میں شمار کیا جاتا۔ دلی کالج سے 1845 میں شائع ہونے والا باتصویر رسالہ ''فوائدالناظرین'' تھا۔اس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر ایک باکمال علمی شخصیت کے مالک تھے۔مغربی علوم وفنون کے ترویج واشاعت کے لیے انھوں نے اس رسالے کا انتخاب واجرا کیا۔ ماسٹر رام چندر نے 1847 میں ایک اور اخبار جاری کیا جس کا نام ''محبّ ہند'' تھا۔جس کا دوشمارہ ''خیرخواہ ہند'' کے نام شائع ہوا۔مرزاپور سے ''خیرخواہ ہند'' نام کا ایک اخبار پہلے ہی سے شائع ہوتا تھا۔اس لیے ماسٹر رام چندر نے اس کا نام بدل کر ''محبّ ہند'' کر دیا اور اس اخبار میں بھی موضوعات کا تنوع تھا۔ادبی، سائنسی، سوانحی، سماجی اور سیاسی موضوعات پر محیط تھا۔ ماسٹر رام چندر کا رسالہ ''محبّ ہند'' کی ضخامت اولا پچاس صفحات پر مشتمل تھی۔ جو بعد میں 56 صفحات کر دی گئی۔مرزاپور سے نکلنے والے رسالے خیرخواہ ہند کے صفحات صرف بارہ ہوا کرتے تھے۔لیکن اس کا شمار رسالے میں ہی ہوتا تھا۔اس کے مدیر عیسائی پادری آرسی ماتھر تھے۔

1857 میں تین اخبارات شائع ہوئے۔لکھنؤ سے پہلا اخبار ''لکھنؤ اخبار'' جس کے مدیر لال جی تھے۔بریلی سے ''عمدۃ الاخبار'' مولوی عبدالرحمٰن کی ادارت میں نکلا اور ''جام جمشید'' میرٹھ سے جاری ہوا۔اس کے مدیر بابو شیو چندر ناتھ تھے۔1850 کا معروف اخبار ''کوہ نور'' تھا۔اسے انگریزوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ یہ اخبار ابتدا میں ہفت روزہ تھا۔ پھر سہ روزہ ہوا اور جلد ہی ایک دن ناغہ کر کے شائع ہونے لگا۔1854 میں اس کی تعداد اشاعت 349 تھی۔جبکہ ''دلی اردو اخبار'' کی تعداد اپنے آخری ایام میں 79 تک پہنچ پائی تھی۔ حالانکہ یہ اخبار بہت مقبول تھا۔1857 کی شورش دبنے کے بعد ''کوہ نور'' انگریزوں کے ظلم واستبداد کی کہانی سے عوام کو باخبر کرتا رہا۔ یہ اخبار لاہور سے جاری ہوا۔اس کے ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے تھے۔منشی ہرسکھ رائے اخبار ''جام جمشید'' کے مدیر رہ چکے تھے۔اسی سال ہربنس لال نے اپنے ذاتی مطبع سے بنارس سے اخبار ''زائرینِ ہند'' جاری کیا۔اردو صحافت نے انیسویں صدی کے وسط میں اس قدر ترقی کی کہ ہر سال کئی کئی اخبار نکلنے شروع ہوئے۔ 1851 میں چار اخبار نکلے۔سیالکوٹ سے ''ریاض نور'' جاری ہوا جو بعد میں ملتان سے نکلنے لگا تھا۔امرتسر سے ''باغ نور'' اور لدھیانہ سے اخبار ''نور علیٰ نور'' نکلا۔اس کے علاوہ بنارس ''بنارس ہرکارہ'' شائع ہوا جس کے مدیر سید احمد علی تھے۔اردو صحافت کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو شہر بنارس نے تعداد کے لحاظ سے بڑی بیداری کا ثبوت دیا ہے۔ یہاں سے ہر سال نئے اخبار کا اجرا ہوتا تھا۔آٹھ صفحات پر مشتمل بابو کاشی داس مشر کی ادارت میں بنارس کے کاشی پریس سے 1852 میں ''آفتاب ہند'' شائع ہوا۔دیگر اخباروں کے بہ نسبت اس کا اثر زیادہ تھا۔1853 میں ہندوستان سے بہت سارے اخبار جاری ہوئے اور 1857 تک شائع ہوتے رہے۔ملتان سے ''شعاع الشّمس'' سیالکوٹ سے ''چشمہ فیض اور دلی سے ''صادق الاخبار'' شائع ہوا۔اس وقت شائع ہونے والے اخباروں میں ''صادق الاخبار'' بہت بے باک اور جری اخبار تھا۔اس نام کے دہلی سے کئی اخبار جاری ہوئے۔جن کے مدیر الگ الگ تھے۔ایک ''صادق الاخبار'' کا چرچا بہت تھا۔اٹھارہ سو ستاون میں اس کے مدیر کو تین سال کی سزا بھی ہوئی تھی۔جس کے مدیر جمال الدین یا جمیل الدین خاں ہجر تھے۔یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں دو اخبار کے مدیر رہے ہوں اور ایک ہی نام ''صادق الاخبار'' سے مشہور ہوئے ہوں۔''گلشن نو بہار'' اور ''ریاض الاخبار'' پر مقدمے چلے اور بند بھی ہوگئے۔ 1857 سے قبل ریاستی سطح پر اخبارات کی ایک طویل فہرست

ہے۔جس کے مدیران بیشتر ہندو تھے اور جنگ آزادی میں اردو کا سہارا لے کر بڑے پیانے پر قربانیاں دی گئیں۔''بنارس گزٹ''، مالوہ اخبار''مطلع الانوار''، ''اخبار مرتضائی''، ''نیراعظم''، اور ''محتشم الاخبار'' کی اپنے اپنے علاقوں میں قدر تھی۔1855 میں ممبئی اور مدراس سے دو اخبار جاری ہوئے جو اپنے مندرجات سے اہم تھے۔''صبح صادق'' مدراس سے شاہ محمد صادق شریف چشتی کی ادارت میں جاری ہوا جبکہ بمبئی سے نکلنے والے اخبار'' کشف الاخبار کاشف الاسرار'' کے مدیر منشی امان علی لکھنوی تھے۔

''اعجاز لکھنؤ، طلسم لکھنؤ، سحر سامری، ورمخزن الاخبار'' لکھنؤ کی خدمات ہیں۔جن کی اشاعت 1856 میں عمل میں آئی۔اس کے ایک سال بعد 1857 میں مختصر مدت کے لیے دو اخبار''معدن الاخبار'' اور''عیار الاخبار'' جاری ہوئے۔

ان اخباروں کے علاوہ چند اخبار ایسے تھے جن کو انفرادیت کا درجہ حاصل تھا۔ان میں کچھ رسالے بھی تھے۔1866 میں اردو صحافت کے مزاج میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔اشتعال و جارحیت سے آہستہ آہستہ اردو صحافت نے سنجیدگی، دوراندیشی، نرم روی اور تعمیری فکر کی طرف قدم بڑھائے۔اس میں سرسید احمد خاں کا اہم کردار رہا ہے۔سید محمد خاں کے انتقال کے بعد''سید الاخبار'' کی ذمے داری سرسید احمد خاں نے سنبھالی تھی اس لیے انھیں کافی تجربہ حاصل تھا۔مزید وہ پہلے ہی سے''سید الاخبار'' میں علمی و سماجی اور تاریخی نوعیت کے مضامین لکھا کرتے تھے۔''سید الاخبار'' کے بند ہونے کے بعد سرسید احمد خاں نے 1966 میں''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' کے ذریعے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔یہ اخبار ہفت روزہ تھا جو بعد میں سہ روزہ ہو گیا تھا۔اخبار سائنٹفک سوسائٹی کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا جس کا نام''دی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' تھا۔اس اخبار کے ذریعے سرسید ہندوستانیوں کی فکری تبدیلی کرنا چاہتے تھے۔بیجا پرشور و ہنگامہ، اشتعال و احتجاج کے برعکس شائستگی و متانت اور حکمت و دانائی کی تعلیم دینا چاہتے تھے۔سماجی برائیوں اور توہمات سے اجتناب نیز صحیح مذہبی شعور پیدا کرنا چاہتے تھے۔سرسید احمد خاں سچے مصلح قوم و ملک تھے۔اپنی مقصد براری کے لیے انھوں نے ایک اور رسالہ''تہذیب الاخلاق'' 1879 میں شروع کیا۔اس رسالے کا مقصد بھی روشن دماغی، علوم وفنون کی افادیت کا احساس اور بیجا روایتی فرسودہ نظام زندگی سے پرہیز تھا جو ترقی کی راہ میں حائل تھے۔

مذکورہ اخبارات کے علاوہ جن اخباروں نے ہندوستان میں شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ان میں''اودھ اخبار'' اور''ہندوستانی'' تھے۔اودھ اخبار لکھنؤ سے 1874 میں منشی نول کشور نے جاری کیا۔یہ ہفت روزہ تھا۔اودھ اخبار اور اودھ پنچ طویل العمر اخبار ہیں۔اودھ پنچ کے مالک و مدیر منشی سجاد حسین تھے۔اس کی اشاعت 1877 سے شروع ہوئی۔منشی سجاد حسین نے کبھی مصلحت کا رویہ نہیں اختیار کیا۔وہ ہمیشہ ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔منشی سجاد حسین نے''اودھ پنچ'' کو''لندن پنچ'' کے طریقے پر شروع کیا تھا۔اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے''پنچ'' کے نام سے متعدد اخبارات نکلے۔کلکتہ پنچ، انڈین پنچ، پنجاب پنچ، سرپنچ، کشمیر پنچ، اودھ اخبار کی شہرت و مقبولیت اس کی عظیم خدمات کی وجہ سے تھی۔پورے ہندوستان میں منشی نول کشور کے نمائندے پھیلے تھے۔اس کے قلمی معاونین میں شعرا، ادبا، دوسرے بلند پایہ مضمون نگاروں کا نام اس اخبار سے جڑا ہوا تھا۔شوکت تھانوی، عبدالحلیم شرر، یاس یگانہ چنگیزی، پنڈت رتن ناتھ سرشار وغیرہ شامل تھے۔''اودھ اخبار'' ہفت روزہ سے شروع ہو کر سہ روزہ اور پھر بعد میں روزنامہ ہو گیا تھا۔اپنے دور کا پہلا روزنامہ کلکتہ سے نکلنے والا''اردو گائیڈ'' تھا لیکن اردو کا پہلا بڑا اخبار''اودھ اخبار'' ہی تھا۔

صحافت کی دنیا میں ایک نام منشی محبوب عالم کا ہے۔ جو جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ منشی محبوب عالم نے پے بہ پے کئی اخبار جاری کیے۔ خود اپنا مطبع ''خادم التعلیم'' کے نام سے قائم کیا۔ اور ایک ماہنامہ ''زمیندرا'' جاری کیا۔ اور اس کے ایک سال بعد ''ہمت'' نام سے ہفت روزہ شروع کیا۔ ''ہمت'' کے بعد ''اسکول ماسٹر'' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ انھیں دنوں ایک اخبار ''اخبار عام'' کے نام سے نکلنا تھا۔ جس کی قیمت صرف ایک پیسہ ہوا کرتی تھی۔ محبوب عالم نے اپنے ہفت روزہ ''ہمت'' کو 1887 میں گوجرنوالہ سے ''پیسہ اخبار'' کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ اور دو سال بعد 1889 میں گوجرنوالہ سے لاہور منتقل کر دیا۔ اس انتقال مکانی کے پیچھے مزید ترقی کا تصور تھا۔ لاہور سے انھوں نے ''پیسہ اخبار'' کا الگ سے ایک روزنامہ 1897 میں شروع کیا جو 1899 میں بند ہو گیا۔ لیکن 1904 میں دوبارہ شروع کیا۔ اس کے علاوہ ''انتخاب لاجواب''، ''بچوں کا اخبار'' کسانوں کے لیے ''باغبان'' طلبہ کے لیے ''کلیدی امتحان'' اور عورتوں کے لیے خاص طور پر ''شریف بی بی'' کے نام سے اخبار جاری کیا۔

ہفتہ وار ''پیسہ اخبار'' کی تعداد اشاعت 1897 میں گیارہ ہزار تھی جبکہ روزانہ نکلنے والے ''پیسہ اخبار'' کی شرح خریداری تین ہزار تھی۔ دیگر اخبارات کی بہ نسبت ''پیسہ اخبار'' 28 سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔

اردو صحافت میں مولانا حسرت موہانی اور ان کے بھائی محمد علی جوہر کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ حسرت موہانی نے ایک جولائی 1903 میں ''اردوئے معلیٰ'' علی گڑھ سے جاری کیا۔ اس رسالے کے ذریعہ حسرت موہانی نے پرزور انداز میں آزادی کا مطالبہ کیا ۔ برطانوی حکمرانوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ 1908 میں حکومت برطانیہ کے خلاف ایک مضمون لکھا جس کی وجہ سے انھیں دو سال کی قید بامشقت جھیلنی پڑی۔ مولانا محمد علی جوہر اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر وسیع پیمانے پر خدمت قوم و ملک کی غرض سے ملازمت ترک کر دی اور 14 جنوری 1911 کو کلکتہ سے انگریزی اخبار ''کامریڈ'' شروع کیا۔ جو 1913 میں برطانوی حکومت کے دارالسلطنت کلکتہ سے دہلی منتقلی کے ساتھ ''کامریڈ'' بھی دہلی منتقل ہو گیا اور 1914 میں برطانوی حکومت کے دباؤ سے بند ہو گیا اور اس کی دو ہزار کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی ۔ دوبارہ 1924 میں جاری ہوا مگر ایک سال کے بعد جنوری 1926 میں پھر بند ہوا۔ 14 جنوری 1911 کو ''کامریڈ کا اجرا ہوا تھا اور 23 فروری 1913 کو اردو روزنامہ ''ہمدرد'' دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ ہمدرد کو بھی کئی بار بند ہونا پڑا۔ اس کی تعداد اشاعت دس ہزار تک پہنچ گئی تھی جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے مندرجات میں پہلے صفحے پر اسلامی ممالک کی خبریں اور اندر کے صفحے میں ہندوستان کی اور دوسرے ملکوں کی خبریں ہوا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ نظمیں اور افسانے بھی ہوا کرتے تھے۔

جون 1903 میں جاری ہونے والا ''زمیندار'' 5 اکتوبر کو ''روزنامہ ہو گیا۔ اس کے بانی ایڈیٹر ظفر علی خاں کے والد مولوی سراج الدین احمد تھے۔ جون 1903 میں لاہور سے شروع ہونے والا ہفت روزہ اخبار اور اس کے مدیر ظفر علی خاں کی اہمیت و مقبولیت کا پتا اس سے چلتا ہے کہ انھیں اپنی صحافتی خدمات کے بدلے چودہ سال قید و بند کی زندگی گزارنی پڑی۔ تین لاکھ روپے سے زیادہ جرمانہ دینا پڑا اور ان کا اخبار پندرہ بار ضبطی کا شکار ہوا۔ ظفر علی خاں کی بے باک صحافت کا اندازہ جلیانوالا باغ کے مقتولوں کا سفاک قاتل مائیکل ایڈوائر کے تبصرے سے ہوتا ہے:

''ظفر علی خاں اور محمد علی جوہر ماں کے پیٹ سے بغاوت کا قلم لے کر نکلے ہیں۔ انگریز دشمنی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ کوئی عام منصوبہ شروع کرنے سے پہلے ان کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔'' (محمد افتخار کھوکھر، تاریخ صحافت، ص 98، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1995)

اردو صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد اپنے نئے صحافتی انداز اور اسلوب و زبان کے ساتھ وارد ہوئے۔ علوم و فنون کو خطیبانہ طرز عطا کی۔ ان کا ہفت روزہ اخبار بھی تین مرحلوں سے گزرا۔ 13 جولائی 1912 میں الہلال کا اجرا عمل میں آیا اور 18 نومبر 1914 کو بند ہو گیا۔ دوبارہ ایک سال بعد نومبر 1915 سے البلاغ کے نام سے جاری ہوا اور مارچ 1916 میں پھر بند ہو گیا۔ آخری بار پھر الہلال کے نام سے شروع ہوا اور صرف سات ماہ چل کر آخری بار بند ہو گیا۔ یہ مدت جون 1927 سے دسمبر 1927 کو محیط ہے۔ الہلال زبان کی علمیت، فصاحت و بلاغت کا ایک منفرد نمونہ تھا۔ الہلال اور البلاغ کے علاوہ بھی ابوالکلام آزاد نے دوسرے اخبار جاری کیے۔ کلکتہ میں الہلال کی اشاعت سے قبل آزاد نے ''نیرنگ عالم''، ''المصباح'' اور ''لسان الصدق'' جاری کیا تھا۔ ''لسان الصدق'' سے مولانا کو شہرت ملنی شروع ہو گئی تھی اور ان کی حیثیت ایک صحافی کے طور پر تھی۔ انھیں کئی بار ریاست بدری کا حکم ملا۔ قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کرنی پڑی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی اسیری میں تخلیق ادب و صحافت کا نمونہ ''غبار خاطر'' کے خطوط اور ترجمان القرآن ہیں۔ مولانا اخباری صحافت کے ذریعے اپنے علم و ادب کا ثبوت بھی فراہم کرتے رہے۔ جو ادبی صحافت کے شاہکار ہیں۔ مولانا آزاد کی زندانی زندگی 16 برس پر محیط ہے۔

اردو صحافت میں ایک اور نام محمد مجید حسن کا ہے۔ انھوں نے یکم مئی 1912 میں اپنا ہفت روزہ اخبار بجنور سے جاری کیا۔ جس کا نام ''مدینہ'' تھا۔ اولاً یہ اخبار رواداری کا نمونہ تھا مگر رفتہ رفتہ ملکی حالات سے متاثر ہو کر برطانیہ مخالف ہو گیا۔ اس کے مواد و مندرجات میں خبروں کے علاوہ سیاسی موضوعات پر مضامین نظمیں، غزلیں ہوا کرتی تھیں اس کے قلمی معاونین میں حسرت موہانی، ظفر علی خاں، اکبرالہ آبادی اور علامہ اقبال جیسے بلند پایہ شعرا و شخصیات تھیں۔ یہ اخبار بھی حکومت کے عتاب کا شکار ہوا۔ مدینہ اخبار بھی پابندیوں سے دوچار ہوا۔ 17 اگست 1919 میں ''یثرب'' کے نام سے نکلا۔ جب ''یثرب'' پر پابندی لگی تو پھر ''مدینہ'' کے نام سے شروع ہوا۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. ''اخبار الظفر'' کا پہلا نام کیا تھا اور اس کا ایڈیٹر کون تھا؟
2. اردو کے دو اولین اخبار کا نام اور ایڈیٹر کا نام بتائیے؟
3. پہلا اردو روزنامہ کہاں سے نکلا تھا؟
4. اردو صحافت میں ''کوہ نور'' کا کیا مقام تھا؟
5. ''پیسہ اخبار'' کا ایڈیٹر کون تھا؟

6. اخبار ''زمیندار'' کے بانی کون تھے؟

7. ''مدینہ'' اخبار کے قلمی معاونین کے نام بتایئے۔

## 3.5 خلاصہ

اردو صحافت کی ابتدا پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہماری نظر قدیم طریقہ صحافت پر جاتی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں اردو صحافت کے لیے فضا وہیں سے سازگار ہوتی چلی گئی۔ عہد سلاطین سے لے کر مغلیہ دور تک کسی نہ کسی صورت میں صحافت کا وجود تھا۔ ہر دور کے سلاطین وشہنشاہ نے اپنی اپنی سلطنت کی خبر گیری کے لیے ایک رابطے کا نظام قائم کر رکھا تھا۔ جن کے ذریعے وہ عوام کے حالات اور اپنی سلطنت کے مزاج کو جاننے کی کوشش کرتے اور اسی لحاظ سے حکومت چلانے کی تدبیر بناتے اور منصوبے طے کرتے اور پھر درباروں سے احکامات جاری ہوتے۔ اس نظام کی زبان فارسی ہوتی۔

اس کے برعکس جب ہندوستان میں صحافت کے آغاز وارتقا کی گفتگو کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد باقاعدہ صحافت کے تاریخی آغاز سے ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ہم نے اس کی صراحت کے لیے چند ذیلی عنوانات کے ذریعے بحث کی ہے۔ ہندوستان میں اخبار نویسی کی مختصراً بحث کے بعد اردو اخبار نویسی کی ابتدا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس میں اردو سے قبل انگریزی اور بنگالی صحافت کی تاریخ پر وضاحت ہے۔ کیونکہ اردو صحافت کی ابتدا کی یہی بنیاد ہے اور وہی افراد ہیں جو انگریزی اور بنگالی کے بانی رہے ہیں۔ بعد ازاں اردو اخبار نویسی پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اور اردو کے پہلے اخبار ''جام جہاں نما'' سے گفتگو کا آغاز کیا گیا ہے اس کی صراحت کے بعد ہندوستان میں اردو صحافت کے ارتقا پر گفتگو ہے۔ آخر میں فرہنگ وسفارش کردہ کتب کے عنوان سے طلبہ کی سہولت کے مدنظر مشکل الفاظ کے معانی اور چند کتابیں درج کر دی گئی ہیں۔

## 3.6 فرہنگ

| الفاظ | معانی |
|---|---|
| تکثیری | اجتماعی، کثیر لوگوں پر مشتمل |
| رواداری | نرمی |
| برید | ڈاک، پوسٹ |
| وقائع نگار | واقعات لکھنے والے |

| | |
|---|---|
| نہج | طریقہ، راستہ، ڈھب |
| مصلحین | مصلح کی جمع اصلاح کرنے والے |
| مصدق | جس کی صدیق کی گئی ہو |
| نووارد | نئے آنے والے |
| طباعت | چھپائی |
| اختراع | ایجاد |
| مندرجات | درج شدہ، شامل |
| محیط | حاوی |
| وسط | درمیان |
| معاونین | معان کی جمع مددگار |

## 3.7 سفارش کردہ کتب


| | | | |
|---|---|---|---|
| 1. | جنگ آزادی کا درخشاں باب | ڈاکٹر ابرار رحمانی | وزارت اطلاع ونشریات، حکومت ہند، 2007 |
| 2. | قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان صحافی | پروفیسر عابدہ سمیع الدین | انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی |
| 3. | اردو صحافت کا سفر | گربچن چندن | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2007 |
| 4. | اردو صحافت کا جائزہ | احمد ابراہیم علوی | مکتبہ دانش محل، لکھنؤ 2000 |
| 5. | اردو صحافت کی تاریخ | نادر علی خان | علی گڑھ 1987 |
| 6. | اردو صحافت پر ایک نظر | گربچن چندن | اردو اکادمی، دہلی 1986 |

# اکائی-4: جنگ آزادی اور اُردو صحافت

ساخت


4.1 تمہید

4.2 جنگ آزادی، اسباب وصورت حال

4.3 اردو صحافت پر جنگ آزادی کے اثرات

4.4 جنگ آزادی میں اردو صحافت کا کردار

4.5 خلاصہ

4.6 فرہنگ

4.7 سفارش کردہ کتب


## 4.1 تمہید

علوم وفنون کا آغاز قومی وملکی ضرورت کے پیش نظر ہوتا ہے۔ ہر علم اور ہر فن اپنے مخصوص اور متعین حدود ودائرے میں رہ کر کام کرتے ہیں۔ تاہم پھر بھی حالات وواقعات کے تقاضے کے مطابق ان میں نمایاں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا کا کوئی علم یا فن اپنے عہد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اردو صحافت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی میں نمایاں کردار ادا کرنے والا فن صحافت کو جہاں مثبت انداز میں ہدایات دینے اور صحیح خطوط پر چلنے کی تلقین کرنا تھا وہیں ہماری اردو صحافت مصلحتاً انسان اور انسانی معاشرے میں تفریق وامتیاز کی تعلیم بھی دی گئی۔

جنگ آزادی ایک ایسا موڑ تھا جس نے صحافت کے بنیادی مقصد سے قطع نظر وقتی ضرورت کو ترجیح دی اور آزادی کے حصول کے لیے اپنی پوری طاقت لگادی، تقاضے کے مطابق اتحاد واتفاق پر مبنی مضامین اور نظمیں اخبارات کی زینت بنتی اور عوام کے دلوں میں جذبہ حریت وعزم پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتیں۔ اس اکائی میں صحافت کے اسی پہلو پر گفتگو مقصود ہے۔ اس کے تحت تین ذیلی عنوانات کا تعین کیا گیا ہے جن میں جنگ آزادی، اسباب وصورت حال جنگ کے دوران پیدا حالات اور جنگ کے وجوہات پر روشنی ڈالی جائے گی تاکہ جنگ کی ابتدا کی حقیقی وجہ سے طلبہ کو واقفیت کرایا جائے جس میں کافی حد تک التباس پیدا کیا گیا ہے۔ دوسرے عنوان میں ''ہندوستان میں اردو اخبار نویسی کا آغاز'' کے تحت ہندوستان میں اردو اخبار نویسی کی شروعات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ کیونکہ ہندوستان میں باقاعدہ اردو اخبار نویسی کے متعلق مختلف آرا پائی جاتی ہیں کہ ہندوستان میں اردو کا پہلا اخبار کب اور کہاں سے جاری

ہوا۔اس کی وضاحت کی جائے گی۔

تیسرے موضوع ''ہندوستان میں اردو صحافت کا ارتقا'' کے تحت جنگ آزادی سے لے کر آزادی تک ہندوستان میں اردو صحافت کے ارتقا پر روشنی ڈالنی مقصود ہے اور اس دور کے اخبارات ورسائل پر مختصراً گفتگو کی جائے گی۔تاہم موضوع پر طوالت سے بچتے ہوئے اہم اخبارات کا انتخاب ہوگا اور ان پر حالات کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

بعد ازاں خلاصہ، فرہنگ اور سفارش کردہ کتب کے ذیلی عنوانات سے طلبا کی سہولت کے مدنظر اجمالاً ترسیل مقصود ہے، خلاصہ کے تحت تینوں ذیلی عنوانات پر گفتگو اجمالی طور پر پیش کرنا مقصود ہے تاکہ مطالعے کا مدعا و مقصود طلبا کے ذہن میں موجود رہے۔ مزید برآں، فرہنگ دی جائے گی تاکہ کسی لفظ کی وجہ سے سبق کی ترسیل میں رکاوٹ نہ پیدا ہو۔نیز طلبا کی مزید معلومات میں اضافے کے مقصد سے چند کتب کے نام اور مصنف کے اسمائے گرامی دیے جائیں گے تاکہ آسانی بہم پہنچے۔

## 4.2 پہلی جنگ آزادی اسباب وصورت حال

1857 کے واقعہ کو کس نام سے یاد کیا جائے، اس میں کسی قدر التباس ہے اور یہ سارے التباس انگریز مورخین کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔کہیں ''غدر'' کا نام دیا جارہا ہے، تو کہیں ''بغاوت'' سے اس کی تعبیر کی جاتی ہے۔صحیح معنوں میں 1857 ایک عہد ساز واقعہ ہے جس کو مکمل تحریک آزادی کا آغاز سمجھنا چاہیے۔کیونکہ اس سے قبل ریاستی سطح پر اٹھارویں صدی میں بغاوت کی ابتدا ٹیپو سلطان سے ہوچکی تھی، جس کے نتیجے میں ٹیپو سلطان کی شہادت ہوئی۔

اخبارات ورسائل کے اجرا کا مقصد دراصل علوم وفنون کا فروغ ہوتا ہے۔لیکن کوئی بھی تحریک یا عمل اپنے عہد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔تاہم کچھ محرکات ایسے ہوتے ہیں جو اصل مقصد کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور نئے حالات وتقاضے کے شکار ہوجاتے ہیں جو عین فطری عمل ہے۔حتیٰ کہ تقاضے کے مطابق جدید اقدامت کیے جاتے ہیں۔اردو رسائل وجرائد اور اخبارات کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ملکی حالات کے سبب ان کا لائحہ عمل بدل گیا۔نئے نئے اخبارات جاری ہوئے۔اٹھارویں صدی میں ٹیپو سلطان کی شبیہ ایک سیکولر و بہادر بادشاہ کی تھی۔آدھی سلطنت کھو دینے کے بعد ٹیپو سلطان نے ''فوجی اخبار'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس کا مقصد ازسرنو سلطنت کی تعمیر وتشکیل اور تنظیم تھا۔یہ اخبار 1794 میں شروع ہوا اور ٹیپو سلطان کی شہادت 1799 تک جاری رہا۔

1857 کو گرچہ ایک فوجی بغاوت سمجھا گیا لیکن اس کے پیچھے ایک عوامی مزاج اور تحریک کارفرما تھی جو انگریزی سلطنت کے خلاف ٹیپو سلطان کی شہادت کے وقت سے پرورش پارہی تھی۔اگر وسیع پیمانے پر غور کیا جائے تو 4 مئی 1799 کو ٹیپو سلطان کی شہادت پر ہندوستان پہلی جنگ ہار چکا تھا اور 1857 میں ملکی سطح پر ہندوستانی قوم کو انگریزوں کے ذریعے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔نیز پورے ملک پر برطانوی اقتدار کا غلبہ ہوگیا۔ 1857 کی بغاوت کا تاریخی سرا ٹیپو سلطان کی شہادت سے ملتا ہے۔1857 کی بغاوت کو کچل دینے کے

بعد انگریزوں کے ظلم وستم کی زد میں صرف فوجی ہی نہیں آئے بلکہ عام ہندوستانی بھی اس کا شکار ہوئے۔ایک طرف ''فوجی اخبار'' جاری کرنے والا بادشاہ ٹیپو سلطان شہید ہوتا ہے تو دوسرے مرحلے کی بغاوت میں ''دہلی اردو اخبار'' کا صحافی انگریزوں کی گولی کا شکار ہوتا ہے۔ ایک سرے پر جہاد بالسیف کا نمونہ ہے تو دوسری طرف جہاد بالقلم کی تمثیل ہے۔اس طور پر تحریک آزادی یا جنگ آزادی اور اردو صحافت ایک دوسرے میں پیوست و مدغم ہیں کہ جنگ آزادی اور اردو صحافت کو علیٰحدہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔کہا جاتا ہے کہ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ یہاں پر غور کیا جائے تو جنگ آزادی کے اسباب خود انگریزوں نے پیدا کیے جس کے پیچھے ان کی سوچی سمجھی سازش تھی اور وہ مشرق کو مغرب کا نمونہ بنانا چاہتے تھے۔انگریزوں نے صرف سماجی اور معاشی سطح پر استحصال نہیں کیا بلکہ تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی جذبات پر بھی حملہ کیا۔ سپاہیوں کے احساسات و جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔نوکری میں عہدوں پر تقرری کے وقت جانب داری برتتے ہوئے غیر دیانت داری کا ثبوت دیا، سپاہیوں کو حقیر نظروں سے دیکھتے، وفاداری پر اپنی افسری کا مظاہرہ کرتے، یہ حدیں اس وقت ٹوٹ جاتی ہیں جب کارتوس میں سور اور گائے کی چربی استعمال ہوتی ہے۔تہذیب، ثقافت، جاگیر اور ناموس کا سودا بھی ہندوستانیوں نے کر لیا لیکن جب مذہب کو نشانہ بنایا گیا تو بحیثیت مجموعی سارے ہندوستانیوں کا مزاج و رویہ بدل گیا اور بڑے پیمانے پر بغاوت پھوٹ پڑی۔کارتوس کے استعمال سے انکار کرنے پر 85 سپاہیوں کا میرٹھ چھاؤنی میں 9 مئی 1857 کو، کورٹ مارشل ہوا۔اس سے ایک ماہ پہلے ہندوستانی فوجیوں میں اشتعال انگیزی کے جرم میں منگل پانڈے کو سزائے موت دی گئی تھی۔ان سب واقعات کے باعث بنگال فوج کی چھاؤنی میں اشتعال برپا ہو گیا اور 10 مئی 1857 کو فوجیوں نے علم بغاوت بلند کر دیا اور دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔دہلی پہنچ کر اس وقت کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بلا تأمل پورے ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کر کے قیادت کرنے کی درخواست کی۔دہلی میں بغاوت کی آگ دوسرے صوبوں تک پہنچی اور فوجیوں کے علاوہ عوام نے بھی بغاوت کا اعلان کر دیا۔

بغاوت کا دو انجام ہے۔انقلاب یعنی نئی حکومت کی تشکیل یا پھر باغیوں کی سرکوبی۔لہٰذا ایسا ہی ہوا۔بغاوت ناکام ہو گئی۔ بڑے پیمانے پر خوں ریزی ہوئی اور دلی تباہ ہو گئی۔حتیٰ کہ دلی کی جامع مسجد کی مسماری کا فیصلہ بھی عنقریب تھا۔انگریزوں کے ظلم و جبر کی آندھی بنارس، پٹنہ، الٰہ آباد، جونپور اور اعظم گڑھ تک پہنچی اور عام لوگوں کو سزائے دار و رسن دی گئی۔توپ سے اڑا دیا گیا، عصمتیں تار تار کی گئیں۔

ہندوستانیوں کو زیر نگیں کرنے کے لیے کمپنی نے مشنریوں کا سلسلہ شروع کیا جس کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی تا کہ مغربی تہذیب و ثقافت کو خفیہ طور پر غیر شعوری انداز میں ہندوستانیوں پر مسلط کیا جائے۔ہندوستان دو بڑے مذاہب کا ملک ہے۔ مشنریاں ہندو مذہب و اسلامی اقدار کی بیخ کنی کرتی تھیں۔دونوں پیروکاروں کے جذبات پر حملہ کرتی تھیں اور تمام شعبوں میں عیسائیت کی تعلیم عام ہو رہی تھی۔عیسائیت کی تبلیغ کا سرکاری اجازت نامہ ملا تھا اور فنڈ بھی۔جس کے ذریعے عوامی مقامات، بازاروں، جیل خانوں، اسکولوں اور اسپتالوں کو ہدف بنایا گیا۔حالانکہ کچھ انگریز افسران کو اس عمل کے ردعمل کا احساس ہو گیا تھا، اس لیے وہ اس طرز عمل کے حامی نہیں تھے۔ان کو ڈر تھا کہ ان سرگرمیوں سے ہندوستانیوں کے اندر شدید نفرت اور سخت احتجاج ہو سکتا ہے۔

کمپنی بہادروں کے اس طرز عمل سے عوام میں ایک پیغام یہ بھی پہنچا کہ انگریز مغربی تعلیم و تہذیب عوام میں پھیلا کر اس کے

ذریعے عیسائیت قبول کرنے کے لیے راہ ہموار کررہے ہیں۔ اسلام اور دیگر مذاہب کے مطابق تبدیلی مذہب کے بعد آبائی جائداد سے بے دخل ہونا پڑتا ہے۔ لارڈ ڈلہوزی نے 1850 میں ایسا قانون بنایا کہ تبدیلی مذہب کے بعد موروثی جائداد سے محروم نہیں ہوسکتے تھے، لارڈ ڈلہوزی کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے لارڈ کیننگ نے بیواؤں کی دوبارہ شادی کا قانون وضع کیا جو ہندو مذہب کے خلاف تھا۔ ان دوقوانین کے ذریعے ہندو مذہب اور اسلام میں مداخلت تھی۔ اس کی وجہ سے ہندو مسلمان، دونوں کے دل میں مخالفت کا جذبہ پیدا ہوا۔ انھیں ان کے مستقبل کی فکر اور بے چینی پیدا ہوئی۔ انگریزوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہوا اور ملکی وقومی متحدہ مزاج کی جڑیں مستحکم ہوتی گئیں۔ یہی نہیں ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی حکمت عملی کے ذریعے زمیندار طبقے کو کاشتکاروں وکسانوں کے خلاف نئے زرعی نظام کی بنیاد ڈال کر، زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کا خواب دکھایا اور لگان کی وصولی کے ذریعے سماج کو کمزور تر کرنے کی سازش تھی اور کسانوں کو زمینداروں کے خلاف نفرت پیدا کرنا تھا اور خود ریاستوں پر قابض ہوکر اپنے زیر تسلط کرنا تھا۔ اودھ کے الحاق کے بعد صورت حال کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی۔

1857 کی بغاوت میں عورتوں کی شمولیت و حصے داری کے سبب ہندوستانی عوام کو مزید تحریک ملی، طبقۂ نسواں کی شرکت سے مردوں کو مہمیز و تازیانے لگے۔ لکھنؤ کے گرد ونواح میں بیگم حضرت محل نے فوجی کمان بھی سنبھالی اور انگریزوں کے خلاف سخت جدوجہد کی۔ 1854 میں انگریزوں نے جھانسی پر بھی اپنا تسلط قائم کرلیا تھا۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے قانونی چارہ جوئی کے بعد خاموشی اختیار کرلی۔ جب بغاوت کی آگ بھڑکی تو جھانسی ریاست کے باغیوں کی قائد بن کر اٹھیں اور آخر دم تک انگریزوں کا مقابلہ کرتی رہی۔ حتیٰ کہ جان عزیز قربان کردی۔ کانپور میں رقص وسرود کی محفلیں سجانے والی رقاصہ عزیزن 1857 کی بغاوت میں مردوں کا لباس زیب تن کیے گھوڑے پر سوار فاتحانہ انداز میں نانا دھوندھو پنتھ کے جلوس میں شامل ہوئیں، جو زخمیوں کے لیے سامان جراحت فراہم کرتی۔ ان کے خورد ونوش کا انتظام کرتیں۔ نانا صاحب کی پسپائی کے بعد گرفتار ہوئیں۔ مگر معافی مانگنے کی پیش کش کو ٹھکرادیا اور جام شہادت نوش کیا۔

ان سب حوصلہ افزا عوامل کے تحت بغاوت نے قومی یکجہتی کی صورت اختیار کرلی۔ جو بغیر کسی منصوبہ وحکمت عملی کے انجام پایا۔ پورے ہندوستان میں بلاتفریق مذہب وملت اور قومیت ونسل کے سب نے اپنے اپنے قائدوں کی قیادت میں سرفروشی کا مظاہرہ کیا۔ یہ سب انگریزوں کے پیدا کیے ہوئے امتیازی سلوک کا نتیجہ تھا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کا ہر طبقہ اپنے طور پر دل وجان سے حاضر تھا۔ انگریزوں کے پیدا کردہ اسباب ملک کے اندر جو حالات پیدا کیے اس کے باعث یہاں کے علمی وسیاسی اور رفاہ عامہ سے منسلک افراد نے اپنے آپ کو الگ محسوس نہیں کیا، بلکہ انگریز عسکری قوت کا مقابلہ اپنی قلمی قوت سے کیا۔ رسائل وجرائد کا اجرا کیا۔ اخبارات نکالے اور ہندوستانیوں کو اتحاد اور عزم وحوصلہ دیتے رہے۔ جذباتی مضامین، مذہبی ذمے داری، حب الوطنی سے سرشار نظمیں شائع کرتے۔

بغاوت ناکام تو ہوئی لیکن آئندہ کے لیے ایک لائحہ عمل وحکمت عملی ترتیب دینے اور احتساب کرنے نیز شکست کے اسباب کو دور کرنے اور منظم ہونے کی فکر لاحق ہوئی۔ آہستہ آہستہ سیاسی رسوخ کو تیز تر کرئے، سیاسی جماعتیں تشکیل دینے اور تشدد کی جگہ عدم تشدد کی پالیسی اختیار کرنے میں پائیداری کو اہمیت دی گئی۔ حالانکہ انگریزی حکومت کا مشق ستم کا رویہ ہنوز جاری رہا اور 1991 میں

جلیانوالا باغ کا سانحہ رونما ہوا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کے سبب 1942 میں آزادی کا مطالبہ کرنے والوں پر فضائی حملے بھی ہوئے۔ تاہم آزادی مطالبہ کرتی ہے، قربانی کا۔ 1799، 1857 اور 1947 کی خونی داستانیں اردو صحافت کے صفحات کو رنگینی و سرخی بھی عطا کرتی ہیں اور سرخروئی بھی۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. آزادی کی جنگ کب شروع ہوئی؟
2. جنگ آزادی کا آغاز کس نے کیا؟
3. 1857 کا واقعہ کہاں سے شروع ہوا؟
4. بغاوت کے اسباب کیا تھے؟
5. 1857 میں ملک کن حالات سے گزر رہا تھا؟
6. بغاوت کیوں ناکام ہوگئی؟

## 4.3 اردو صحافت پر جنگ آزادی کے اثرات

اردو ایک ایسی زبان ہے جس کی نشو ونما دھوپ میں بھی ہوتی ہے اور یہ زبان چھاؤں میں بھی برگ و بار لاتی ہے۔ امتداد زمانہ کا شکار ہو کر فروغ پاتی ہے۔ اس کے سینے میں ہر زمانے اور ہر رنگ کے واقعات و سانحات محفوظ ہیں۔ مورخین و محققین اپنی تلاش وجستجو اور ذوق وشوق کے مطابق تاریخ کے صفحات سے مواد و مضامین حاصل کرتے ہیں۔ ماضی کے واقعات و سانحات کے سچے و پکے منابع و مآخذ اخبارات و رسائل ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں ان کی مدد سے تصنیف کی جاتی ہیں۔ ان کے مندرجات دن اور تاریخ وشہادت پر مبنی ہوتے ہیں جو حوالے کا مستند ذریعہ بنتے ہیں۔ ادبیات، سماجیات، معاشیات و سیاسیات کے جلتے موضوعات سے لے کر علوم وفنون اور سائنسی انکشافات صحافت کے اہداف ہوتے ہیں اور رسائل و جرائد ان کے امین و محافظ بنتے ہیں۔ خوش گوار و رومانی فضا میں اردو ادب و صحافت طربیہ ادب پیدا کرتے ہیں۔ ہنگامہ خیز، اشتعال انگیز اور خانہ جنگی و طوائف الملوکی کی ماحول میں اردو زبان حزنیہ و المیہ نیز رزمیہ ادب تخلیق کرتی ہے۔

1830 میں فارسی زبان و ادب کو سرکاری درجے سے بے دخل کیا گیا اور اس کی جگہ اردو کو سرفراز کیا گیا۔ اس وقت سے اردو زبان و صحافت نے بہت سارے نشیب و فراز دیکھے۔ اس کی فطرت میں انجذاب اور تاثیر قبول کرنا ہے۔ اردو زبان کسی ساعت بیٹھی نہیں۔ اسے نرگسی آنکھ ملی ہے۔ جو ہمہ آن کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ کرتی ہے اور اپنے سینے میں ماحصل کو محفوظ کر لیتی ہے۔ ہمارے

ادبا، شعرا اور علما وفضلا نے جہاں ایک طرف علم وادب کے بیش قیمت خزانے اپنی کاوشوں سے جمع کیے وہیں تاریخی حقائق کو بھی محفوظ کیا۔ علم وادب کے شیدائی اور انشا پردازی کے دل دادہ جیالے حکمرانی وسیاست کی گلیوں میں آ کر حکمرانوں سے نبرد آزما ہوئے اور اپنے مطمح نظر میں نئے تقاضوں کو شامل کیا۔

1822 سے اردو صحافت نے اپنی ذمے داریاں نبھانی شروع کی اس وقت سے جاری ہونے والے اخباروں نے اپنی اپنی پالیسیوں کے مطابق اردو صحافت کی خدمت انجام دی۔ اخباروں پر پابندیاں بھی لگیں، جس کی وجہ سے صحافت کی ترقی سست ہوگئی۔ راجہ رام موہن رائے وہ پہلے صحافی ہیں جنھوں نے صحافت و پریس کی پابندی کے خلاف آواز اٹھائی اور عدالت عالیہ میں مقدمہ دائر کیا۔ راجہ رام موہن رائے کو اپنا اخبار ''مرأۃ الاخبار'' جو فارسی میں نکلتا تھا، بند کرنا پڑا۔ لیکن 1835 میں گورنر جنرل چارلس مٹکاف نے اخبارات کو بہت ساری آزادیاں دی۔ اس کے بعد بہت سارے اخبارات جاری ہوئے۔ انھیں آزادیوں کا فائدہ اٹھا کر مولوی محمد باقر نے ''دہلی اخبار'' جاری کیا۔ مولوی محمد باقر کے والد مولوی محمد اکبر دہلی کے معروف عالم تھے۔ ان کا اپنا قائم کردہ ایک مدرسہ تھا۔ انھوں نے اپنے بیٹے محمد باقر کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی مزین وسرفراز کیا تھا۔ مولوی محمد باقر تعلیم سے فراغت کے بعد دلی کالج میں ملازم ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہے۔ مولوی محمد باقر اپنے والد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور اپنے والد کے قائم کردہ مدرسے میں تدریسی ذمے داری سنبھالی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ انھوں نے اپنے آپ کو ملک وقوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ انگریزوں کی توپ وتلوار کا مقابلہ اپنی قوت تحریر سے کیا۔ اپنے اخبار کے ذریعے مولوی محمد باقر نے ہندوستانیوں کی رگوں میں گرم خون کو تحریک عطا کیا اور انگریز حکمرانوں کے کے ناپاک ارادوں پر ضرب لگائی جس کے صلے میں شہادت نصیب ہوئی۔ مولوی باقر کی شہادت کے بعد ان کے لائق وفائق فرزند مولانا محمد حسین آزاد کو صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ان کا گھر تباہ کر دیا گیا۔ انھیں گھر بار چھوڑ کر بے نام منزل کا سفر کرنا پڑا۔ مولانا کو اپنی دودھ پیتی بہن سے ہاتھ دھونا پڑا۔ انگریزوں کے ان ناروا سلوک سے اردو صحافت پر وقتی طور پر منفی اثرات ضرور پڑے تاہم راہیں مسدود نہیں ہوئیں بلکہ مزید فروغ ہوتا گیا۔ 1822 سے اخبارات کے اجرا کا جو سلسلہ شروع ہوا تو جنگ فرو ہونے تک بے شمار اخبار جاری ہوئے۔ مولوی محمد باقر کے اخبار کا اجرا ایک خاص پس منظر میں ہوا تھا۔ مولوی محمد باقر محبّ وطن وہمدرد ان تھے۔ انھیں اپنے وطن کے ساتھ مذہبی اقدار وروایات کا بڑا پاس تھا۔ دہلی کالج میں تدریسی خدمات اسی جذبے کا نتیجہ تھا۔ ان دنوں دہلی کالج کا ناظم ''مسٹر ٹیلر'' عیسائی پادری تھا۔ جسے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ وہ عیسائیت کا بڑا مبلغ تھا۔ اس لیے بڑے پیمانے پر عیسائیت کی تبلیغ کی تھی۔ مولوی محمد باقر کو دلی رنج ہوتا تھا کہ ہندوستانیوں کو عیسائیت کے پھندے سے کیسے بچایا جائے۔ اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے ''دہلی اخبار'' کا اجرا کیا تھا۔ جو آگے چل کر سیاسی حالات کا نقیب ومبصر ہوا۔

دہلی اردو اخبار کی بے باکیوں اور اس کے حوصلہ افزا اقدام سے دوسرے اخباروں کو بھی قوت ملتی۔ ان اخبارات کی ایک طویل فہرست ہے۔ ''سید الاخبار''، ''صادق الاخبار''، ''قران السعدین''، ''فوائد الناظرین''، ''لکھنؤ اخبار''، ''عمدۃ الاخبار''، ''صدرالاخبار''، ''فوائد الشائقین''، ''معیار الشعرا''، ''مراۃ العلوم'' ان اخبارات کے علاوہ بے شمار اخبار ہیں جو ہر ریاست سے ہر سال

کئی کئی اخبار شائع ہوئے۔اور جنگ آزادی میں اپنی ذمے داریاں ادا کرنے میں نمایاں رہے۔

1857 کے بعد بھی جاری ہونے والے اخبارات ظلم وتعدی کا شکار ہوئے لیکن کسی نہ کسی صورت میں شائع ہوتے رہے اور اپنی ذمے داریوں سے عوام کو فیض پہنچاتے رہے۔ بہت سارے اخبارات جو ہفت روزہ تھے، سہ روزہ ہوئے اور پھر ملکی وعوامی تقاضے کے مطابق روزنامہ ہوگئے۔1857 سے قبل جاری ہونے والا اردو اخبار ''کوہ نور'' اپنی بہتر کارکردگی کے سبب تعداد اشاعت بڑھاتا گیا اور 1854 میں اس کی خریداری کی شرح 349 ہوگئی تھی۔آج یہ کہتے ہوئے فخر کا احساس ہوتا ہے کہ برطانوی سامراج نے جتنی سختیاں کیں اردو صحافت اس قدر کھری ہوتی گئی۔اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور یہ ملک کی ترجمان بنتی گئی۔رابطے کی زبان بنتی گئی، جنگ آزادی کے دوران ہندوستانیوں کے درمیان جس قدر مقبول ہوئی اس میں برطانوی سامراج کا اہم رول رہا ہے۔

1857 سے لے کر 1947 تک اردو زبان وادب میں جو نکھار آیا، زبان میں شستگی پیدا ہوئی یہ جدوجہد اور طلب آزادی کی دین ہے۔جنگ آزادی کے سبب کتنے ہی بھٹکے ہوؤں کو منزل ملی ''اودھ اخبار'' جنگ آزادی میں شامل نہیں تھا۔لیکن اس نے انگریزوں کے ظلم وستم کو نظر انداز نہیں کیا۔بغاوت کے جرم میں انگریزوں نے اندور کے مجاہد آزادی سعد خاں، پونہ مجاہد آزادی رام پرشاد اور رام پور کے نیاز احمد کو پھانسی کی سزا ہوئی تو ''اودھ اخبار'' نے پھانسی کی تفصیل شائع کی۔بریلی کے قائد نواب بہادر خاں کو 1859 میں تختہ دار پر چڑھایا گیا تو ''اودھ اخبار'' نے ان کی پھانسی کی خبر کو جلی حروف نمایاں کیا۔یہ سب حالات کا تقاضا تھا کہ ہمارے صحافی حضرات اپنے خاص مقصد کو بھول کر اور انگریزی سامراج کی ناانصافیوں سے متاثر ہوکر انھیں اپنے قلم کا رخ بدلنا پڑا۔اور وہ کسی نہ کسی صورت جنگ آزادی کا حصہ ثابت ہوئے۔

جنگ آزادی سے قبل جو قوم اپنی روٹی روزی میں مصروف تھی انھوں نے جدوجہد آزادی کا نعرہ دیا۔''انقلاب زندہ باد''، ''کرانتی امر رہے'' کی تخلیق ہوئی۔اردو صحافت نے سوئے ہوؤں کو بیدار کردیا۔مولوی محمد باقر کی شہادت، حسرت موہانی ومحمد علی جوہر کی قید بامشقت، ظفر علی خاں کی اذیت کوش زندگی۔ابوالکلام آزاد کی اسیری اور سرسید احمد خان کی پرملال زندگی نے صحافت کو جس قدر متاثر کیا وہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔جنھیں علم وفضیلت میں کمال حاصل کرنا تھا وہ صحافت کی دنیا میں بھی باکمال ثابت ہوئے۔ان کی جدوجہد آزادی کی خدمات نے اردو زبان وادب کو جلا بخشی۔ادب میں باقاعدہ ایک صنف کا اضافہ کیا۔یہ 1857 کا تحفہ ہے کہ اردو صحافت جدید سے جدید تر تکنیکی ذرائع سے مزین ہوتی گئی۔آج اردو صحافت تمام جدید وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہے۔اردو صحافت ملک کی مقبول عام صحافت ہے، جس کا درجہ تیسرے نمبر پر ہے۔صحافت نے جس قدر فروغ پایا اردو کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔آج اردو زبان غیر ممالک میں اپنی نئی آبادیاں بسا رہی ہے۔اس کام کو اخبارات انجام دے رہے ہیں، اب اخبارات صرف خبروں تک محدود نہیں رہے۔ان کا دائرہ پھیل کر دنیا کے علوم وفنون اور انکشافات وایجادات کو اپنے صفحات کا حصہ بنا رہے ہیں۔نئے نئے علوم سے عوام کو باخبر کر رہے ہیں۔

مغربی علوم کے فوائد کا سرسید نے قوم کو جو احساس دلایا تھا اور نئے طرز تعلیم کی طرح ڈالی تھی۔وہ اپنے مقصد میں کامیاب

بھی ہوئے۔ان کے اخبار ورسالے نے جوعلمی بیداری کی مہم چلائی آج قوم اس کومحسوس کررہی ہے۔66 برس آزادی کو ہوئے ،ان رہنماؤں کوآج بھی ملک خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ یہ ان کی جدوجہد آزادی کا کھلے دل سے اعتراف ہے۔اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اردوصحافت بذات خود ایک ایجاد ہے۔ یہ ایجاد ضرورت اور وقتی تقاضے کی دین ہے جو آج ایک مکمل فن کے صورت ہماری جامعات میں درس وتدریس کا حصہ بنی ہوئی ہے۔شائد کہ دنیا ہمارے ان رہنماؤں کی طرف توجہ نہ دیتی،ان کی علمی خدمات کا اعتراف نہ کرتی ،تاہم جب انھوں نے جنگ آزادی میں کود کر اپنے خلوص کا ثبوت فراہم کردیا تو وہ تاریخ کے صفحات میں جاوداں ہوگئے۔ حسرت موہانی ،محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد،منشی سجاد حسین، سرسید احمد خاں،ظفر علی خاں، نیاز فتح پوری،عبدالماجد دریابادی اور قاضی عبدالغفار جیسے بے باک وجری بہادر صحافیوں کی تحریریں انقلاب کا سبب بھی رہی ہیں اورادب وانشا کا معیاری نمونہ بھی ہیں۔1857 میں متعارف کیا ہوا''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ آج بھی تقاضائے حال کے مطابق دلوں میں گرمی اور رگوں میں روانی پیدا کرتا ہے۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. اردوزبان وصحافت پر محرکات وعوامل کس قدر اثر انداز ہوئے ہیں؟
2. اردوصحافی جنگ آزادی میں کن حالات سے گزرے؟
3. جنگ آزادی میں اردوصحافت کا نقطۂ نظر کیا تھا؟
4. اردوصحافت کی اہمیت کی نوعیت کیا ہے؟

## 4.4 جنگ آزادی میں اردوصحافت کا کردار

انسان ہندوستان کا ہو یا انگلستان کا،آزاد پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی فرد یا جماعت اس کی آزادی پر دست درازی کرتی ہے اورآزادی سلب کرنا چاہتی ہے تو وہ فطرتاً زبان کھولتا ہے،احتجاج کرتا ہے۔ یہ احتجاج اس کا پیدائشی حق اور فطری عمل ہے۔اس کی زبان اس کے احتجاج کا پہلا ذریعہ وآلہ ہے۔انقلاب فرانس ہو یا یونانی معرکۃ آزادی ، امریکہ کی جنگ آزادی ہو یا خود ہندوستان کی جدوجہد آزادی سبھی ملکوں کے باشندوں نے ملکی آزادی کی خاطر اپنی زبان کا سہارا لیا اور زبانوں نے عوام میں بیداری کی لہر دوڑائی۔ ہندوستان کی جنگ آزادی اور اردوزبان وصحافت کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو اردوزبان وصحافت کا کردار ہر جگہ نمایاں نظر آئے گا۔ اردوصحافت نے پورے حوصلہ وعزم کے ساتھ جنگ آزادی میں حصہ لیا اور اپنے نعروں کے ذریعے انگریز حکومت کی دیواریں ہلا دیں۔ علامہ شبلی نعمانی کی نظم'' یہ ماتم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے۔ ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحان کب تک۔ ہو یا بسمل عظیم آبادی کی غزلیہ ہیئت کی نظم 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔ ہو۔ جنگ آزادی میں ایک اہم

رول ادا کیا اور پورے ہندوستان کی فضا میں مطالبہ آزادی کی گونج پیدا کر دی۔

1836 میں صحافتی آزادی ملنے کے بعد مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے شمالی ہند دہلی میں مبطوعہ صحافت کی باقاعدہ بنیاد ڈالی اور اپنے اخبار ''دہلی اخبار'' سے ہندوستانیوں کی رگوں میں خون زندگی دوڑا دیا۔ انگریز حکمرانوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ برطانوی سامراج کے توپ وتفنگ کا مقابلہ اپنی تحریروں سے کرتے کرتے جام شہادت نوش کر لیا۔ مولوی محمد باقر نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار جو قربانی دی ہے اس میں وہ اپنے گھر اور خاندان کا بھی تحفظ نہ کر سکے۔ ان کی شہادت کے بعد اہل خانہ پر کیا بیت گئی کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ مولانا محمد حسین آزاد کو والد کی شہادت کے بعد تباہ شدہ گھر کو چھوڑنا پڑا۔ اپنے اہل خاندان کو لے کر بے نام منزل کا سفر کرنا پڑا۔ راستے میں سفر کرتے ہوئے پاس ہی ایک بم گر کر پھٹا اور ان کی شیر خوار بہن کا دل دہل گیا اور چند دنوں کے بعد اس کی وفات ہوگئی۔ جنگ آزادی کے لیے یہ دو نسلوں کی قربانی تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد کو پانچ سو روپیہ کا انعامی ملزم قرار دے دیا گیا۔

دہلی سے جاری ہونے والا اخبار ''صادق الاخبار'' کے ایڈیٹر مولوی جمیل الدین نے جنگ آزادی کی زبردست حمایت کی اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کے قتل پر ابھارا۔ اس اخبار نے بغاوت کی آگ بھڑکانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جس کی پاداش میں ان کی جائداد ضبط کر لی گئی اور تین سال کی سزائے قید بالمشقت دی گئی۔ کلکتہ سے شائع ہونے والا اخبار ''گلشن نو بہار'' کے مدیر عبدالقادر تھے۔ یہ اخبار فارسی میں شائع ہوتا تھا مگر اس میں اردو مضامین بھی چھپتے تھے۔ یہ اخبار انگریزوں کے خلاف مضامین چھاپتا تھا۔ انگریزوں نے جب نواب اودھ کو برطرف کر کے قید کر دیا اور اودھ کو اپنی سلطنت میں ضم کر لیا تو ''گلشن نو بہار'' نے کھل کر احتجاج کیا۔ منشی نول کشور فطرتاً صحافی پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اپنا مطبع تھا۔ ان کے مطبع سے بہت سارے کتب رسائل شائع ہوئے۔ 1859 میں انھوں نے اپنا اخبار 'اودھ اخبار' کے نام سے جاری کیا۔ انھوں نے جنگ آزادی میں حصہ تو نہیں لیا، لیکن انگریزی سلطنت کی زیادتیوں کو اپنی خبروں کا حصہ ضرور بناتے تھے۔ 1876 میں ایک انگریز افسر کے سامنے ایک ہندوستانی وکیل حاضر ہوا تو اس افسر نے اس وکیل کے پاؤں سے جوتے نکلوا کر اس کے سر پر رکھوائے اور اس حالت میں کھڑا کر کے تذلیل کی۔ ایک ہندوستانی کے قتل پر ایک انگریز ملزم کو معمولی جرمانے کی رقم ادا کرنے کی سزا دی۔ اس حرکت پر اودھ اخبار نے زبردست نکتہ چینی کی اور ''قتل انسان'' کے عنوان سے مضامین تحریر کیے اور مخالفت کی۔ اودھ اخبار تعمیری تھا۔ ہندوستانی حکمرانی وحکمرانوں کی بے راہ روی پر بھی نکتہ چینی کرتا تھا۔ ہندوستانی عوام کے اندر بیداری کا جذبہ پیدا کرنے میں اس اخبار نے نمایاں حصہ لیا۔

اخبار ''اودھ پنچ'' کے بانی منشی سجاد حسین تھے۔ اس کے قلم کاروں میں محمد حسین آزاد، احمد علی شوق، لچھو بیگ ستم ظریف، رتن ناتھ سرشار، تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد برق، اکبرالہ آبادی اور عبدالغفور خان شہباز تھے۔ ان قلم کاروں نے برٹش سامراج پر خوب جم کر طنز وتعریض کی اس اخبار نے ملکی وغیر ملکی سیاست پر غور وفکر بھی کیا اور طنزیہ انداز میں نکتہ چینی بھی کی۔

حسرت موہانی تشدد کے حامی سیاست داں تھے۔ انھوں نے رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' جاری کیا۔ ان کی باغیانہ تحریروں کی وجہ

سے دوسال قید سخت اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کی سزا طے ہوئی۔ رہائی کے بعد دوبارہ جاری کیا تو چند دنوں میں شرح خریداری سات سو تک پہنچ گئی۔ انگریزوں کے خلاف ایک مضمون لکھنے کے جرم میں تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ ادا نہ کرنے پر مطبع اور اخبار دونوں بند کرنے پڑے۔ اس کے بعد سہ ماہی رسالہ ''تذکرہ شعرا'' شائع کیا تو دوبارہ قید کر دیے گئے اور مونجھ کی رسیاں بٹنے اور روزانہ ایک من گیہوں پیسنے کی سخت سزا دی گئی۔ کنویں سے پانی کھینچنے کی سزا دی گئی۔ مولانا انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ اپنی تقریروں میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے قائل تھے۔ کانگریس کے اجلاس میں ان کی پر تشدد تجویز تو رد کر دی گئی لیکن انھوں نے اپنی اسی تجویز پر عمل پیرا ہونے کا اعلان کر دیا۔ ان کے اس عمل کی بنیاد پر پھر گرفتار کر لیا گیا اور چھ سال کی قید بامشقت دی گئی۔ ان کا جذبۂ حب الوطنی کبھی سرد نہیں پڑا۔ مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد بھی انھوں نے سوشلزم اور مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔

مولانا محمد علی جوہر نے انگریزی میں دستگاہ حاصل کی تھی۔ اپنے احساسات کو برطانوی حکومت وسامراج تک پہنچانے کے لیے انگریزی ہفتہ وار ''کامریڈ'' جاری کیا۔ یہ ہفتہ وار اخبار صحافتی و علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ ان کی خواہش ایک اردو روزنامہ نکالنے کی تھی۔ وہ اپنی خواہش میں کامیاب ہوئے اور 23 فروری 1913 کو کوچہ چیلان دہلی سے روزنامہ ''ہمدرد'' جاری کیا۔ مولانا آٹھ صفحات کا روزنامہ نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن تکنیکی وجہ سے اولاً صرف دو صفحات پر مبنی ''ہمدرد'' کا اجرا کیا۔ پھر بعد میں اپنے مطلوبہ اخبار کو آٹھ صفحے میں شائع کیا۔ ''ہمدرد'' کے قلمی معاونین میں مولانا عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالغفار، سید ہاشمی فرید آبادی، محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری، قاضی عباس حسین گورکھپوری، مولانا عبدالحلیم شرر، سید جالب دہلوی، معید احمد، عبدالہادی خان، قاری عبدالعزیز منصور پوری، سید حسن ریاض خاں اور سید محمد جعفری جیسے باکمال فضلا شریک تھے۔ متحدہ قومیت مولانا کا مزاج تھا۔ انھیں امن وآشتی سے رہنے میں ملک وقوم کی ترقی کا احساس بہت پہلے ہو چکا تھا۔ ہمدرد کے مندرجات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے ان کو ملکی سیاست سے لے کر بین الاقوامی سیاست ومعاشرت سے دلچسپی تھی۔ ملکی سیاست کے نشیب وفراز اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور ہندو مسلم اتحاد کے وہ زبردست حامی تھے، یہ اوصاف ان کے اندر مذہبی وابستگی کے سبب تھے۔

''زمیندار'' اخبار اپنی نوعیت کا بالکل مختلف اخبار تھا۔ منشی سراج الدین احمد نے اپنے آخری ایام میں اپنے بیٹے ظفر علی خاں کے سپرد کر دیا۔ ظفر علی خاں کی ادارت میں آنے کے بعد اس اخبار نے صحافتی دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ عوام میں اخبار پڑھنے کا شوق ''زمیندارا'' ہی سے بڑھا۔ اس اخبار نے اپنے ہم عصر اخباروں پر تفوق حاصل کیا۔ کیونکہ اس نے ایسوسی ایٹیڈ پریس اور رائٹر سے خبروں کا آغاز کرنے میں اولیت ثابت کی۔ مولانا ظفر علی خاں خود شاعر تھے ان کی نظمیں زمیندار میں چھپتی تھیں جنھیں قارئین نہایت دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ حالات حاضرہ پر وقیع مضامین شائع ہوتے اور زمیندار میں چھپنے والے تبصرے بہت جامع و باوقار ہوتے تھے۔ مولانا خود بھی باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ عمدہ نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر وشعلہ بیان خطیب بھی تھے اور ان کے اخبار سے منسلک شخصیات بھی باکمال تھیں۔ مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی، مولانا نیاز فتح پوری، منشی وجاہت حسین جھنجھانوی اور مولانا عبداللہ عمادی قلمی تعاون دیتے جس کی وجہ سے زمیندار عروج پر تھا۔ گویا زمیندار جرأت و بے باکی سے ہر موضوع پر مضامین شائع کرتا تھا۔ فن صحافت کو وقار عطا کرنے میں ''زمیندار'' کو اولیت کا سہرا جاتا ہے۔ تین بار اس سے ضمانت طلب کی گئی۔ اس کے خلاف مولانا

نے تیس صفحے پر مشتمل ایک کتابچہ انگریزی زبان میں تیار کیا اور انگلینڈ لے گئے۔ لیکن انھیں واپس لوٹنا پڑا۔ اس کی سنوائی نہیں ہوئی۔ مولانا ظفر علی خان پہلے گریجویٹ تھے جنھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور صحافت کو بلند مقام تک پہنچا کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ پیشہ نہایت معزز و قدر کا حامل ہے۔ اس میں آنے والے بلند مرتبہ و باصلاحیت لوگ ہوتے ہیں۔ سینٹرل اسمبلی کے اجلاس میں منظوم احتجاجی تقریر کی۔ اس وقت تقریباً تین لاکھ روپے ''زمیندر'' اخبار کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں اردو صحافت نے مزید ترقی کی۔ اس کی وجہ تھی کہ اخبارات کو کمپنیوں سے تجارتی اشتہارات ملنے لگے۔ اس کی وجہ سے اخبارات کی شرح خریداری قدرے کم کر دی گئی اور تعلیمی رجحان بھی بڑھا۔ اس وقت ''اخبار عام'' کی قیمت صرف ایک پیسہ تھی۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا۔ 94-1893 میں اس کی خریداری دو ہزار سے زیادہ تھی۔ اس اخبار سے متاثر ہو کر منشی محبوب عالم نے اپنے اخبار ''ہمت'' کو تبدیل کر کے ''پیسہ'' نام سے جاری کیا۔ اور اس کی قیمت ایک پیسہ رکھی۔ منشی محبوب عالم یورپ بھی گئے تا کہ جدید ترین صحافت کا مشاہدہ کریں۔ ادھر سے واپس آ کر انھوں نے ''انتخاب لاجواب'' نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔

اس وقت ''پیسہ'' اخبار سے بہت سے صحافیوں نے تربیت حاصل کی ان ایک نمایاں نام جالب دہلوی کا ہے۔ ان کے مضامین وادار یے بہت وقیع و معلومات افزا ہوا کرتے تھے۔ ''پیسہ اخبار'' بھی ہفت روزہ تھا جو بعد میں روزنامہ ہو گیا۔ اپنے وقت کے روزناموں میں اول مقام رکھتا تھا۔ لاہور میں ''پیسہ اخبار اسٹریٹ'' آج بھی اس کی یادگار ہے۔ یہ اخبار 1924 میں بند ہوا۔

بیسویں صدی میں جو صحافی نمایاں طور پر ابھر کر آئے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سرفہرست ہے۔ مولانا عبقری شخصیت کے مالک تھے اور ادیب، شاعر، بلند پایہ صحافی، مقرر، سیاست داں اور دانشور تھے۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز دس سال کی عمر میں اخبار بینی سے ہوا۔ ان کے مطالعے میں اس عہد کے مشہور اخبار ''اخبار عام'' اور ''اردو اخبار'' ہوا کرتے تھے۔ لکھنے کی شروعات ایک طرحی غزل سے ہوئی۔ جو ''ارمغان فرخ'' بمبئی میں چھپی۔ انھوں نے خود ''نیرنگ عالم'' جاری کیا۔ ''المصباح'' کی ادارت بھی کی۔ ''احسن الاخبار'' میں اپنی ہنرمندی دکھائی۔ منشی نوبت رائے کے اخبار ''خدنگ نظر'' میں بھی اپنے علم وفن کا مظاہرہ کیا۔ علامہ شبلی نعمانی کے رسالہ ''الندوہ'' کی ادارت بھی کی۔ ''امرتسر سے نکلنے والے ''وکیل'' سے وابستہ رہے۔ ان کی وابستگی کلکتہ سے نکلنے والے ''دارالسلطنت'' سے بھی رہی۔

مولانا آزاد علم وادب کے علاوہ مشاہدے و تجربے کی دنیا سے گزرے تو انھیں ان کے اظہار کے لیے وسائل کی ضرورت محسوس ہوئی اس لیے انھوں نے ''لسان الصدق'' جاری کیا۔ ان سارے تجربات کے بعد انھوں نے ''الہلال'' نکالا۔ جس نے صحافتی دنیا میں ہنگامہ مچا دیا۔ اس کی زبان، معیار اور اسلوب عوامی نہیں تھا۔ تاہم اس اخبار نے حکومت پر جم کر حملہ کیا۔ جس سے انگریزی سلطنت گھبرا گئی۔ اس اخبار سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی اور اخبار جاری رہا۔ دوبارہ دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ ادا نہ کرنے کی صورت میں اخبار بند ہو گیا۔ اس کے بعد دوبارہ جاری ہوا۔ لیکن چھ ماہ کے بعد پھر بند ہو گیا۔ اس کے بند ہونے کے بعد مولانا آزاد نے ''البلاغ'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ ''الہلال'' ایک معیاری ومثالی اخبار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا تھا۔

''الہلال'' کے مضامین میں حالات حاضرہ پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ جب کہ اس کے دیگر مندرجات ادب، سوانح،

عمرانیات، تاریخ، سیاسیات، جغرافیہ اور مذاہب پر مضامین ہوتے تھے۔ ''الہلال'' پر برطانوی سامراج کی سخت تادیبی کارروائیوں نے اسے زیادہ عرصے تک چلنے نہیں دیا۔ ابوالکلام آزاد کو ان کی سرگرمیوں اور حب الوطنی کے سبب قید و بند سے بھی گزرنا پڑا۔ الہلال کے اشاعتی دور میں یورپ کی جنگیں اور طرابلس و بلقان کی جنگیں بھی ہوئیں۔ ''الہلال'' میں ان جنگوں کی خبریں تصویروں کے ساتھ شائع ہوتی تھی۔ الہلال مختصر عرصے میں ہندوستانی مسلمانوں و ہندوؤں کے دلوں میں آزادی کی آگ جلا کر 9 دسمبر 1927 کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

1857 کی بغاوت (جنگ آزادی) نے سرسید احمد خان کو بہت متاثر کیا۔ ہندوستانی قوم مفلوک الحال ہو گئی تھی۔ سرسید نے فیصلہ کیا کہ اب اس قوم کو پستی سے نکالنے کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے کیا جائے قوم کو اونچا اٹھانے کا راستہ انھیں جدید علم کے روشنی میں نظر آیا۔ وہ علم کی روشنی صحافت کے ذریعے عوام تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ 1837 میں جاری ''سیدالاخبار'' کے بانی سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خان کا جب انتقال ہو گیا تو اخبار کی ساری ذمہ داری سرسید احمد خاں پر آ گئی۔ سرسید احمد خاں ''سیدالاخبار'' میں پہلے ہی سے مضامین لکھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ''سیدالاخبار'' کے ذریعے قوم کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے کا کام شروع کیا۔ ''سیدالاخبار'' کچھ دنوں کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' جاری کیا۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا۔ یہ اخبار معتدل اور رواداری کے اوصاف سے بھرا تھا۔ اس اخبار کے ذریعے سرسید عالم اسلام کے نشیب و فراز سے متعلق معلومات افزا مضامین شائع کرتے۔ مغربی تعلیم کے ترقی بخش انکشافات سے قوم کے اندر حوصلہ و عزم پیدا کرتے۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ انھوں نے ایک مصلح و ناصح کے طور پر قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کی انتھک کوشش کی۔ 1857 کی ناکامی کے بعد سرسید کو معلوم ہو چکا تھا کہ اگر ہندوستانی قوم نے نئی علمی قوتوں اور نئے اصولوں کو نہیں اختیار کیا تو اب ان کو تباہی و بربادی سے نہیں بچایا جاسکتا۔ اس رسالے میں بیشتر مضامین معاشی و سماجی حالات، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی، دینی مسائل و اصلاح اور انگریزی تعلیم کے فوائد پر مبنی ہوتے تھے۔ اس رسالے کے قلم کاروں میں سرسید احمد خاں، حافظ محمد عبدالرزاق، منشی مشتاق حسین اور حافظ عبدالرحمٰن حیرت وغیرہ شامل تھے۔ 1897 میں تہذیب الاخلاق کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ضم کر دیا گیا۔

''تہذیب الاخلاق'' نے معیاری صحافت کے علاوہ دیانت داری اور سچے اصولوں کو راہ دینے میں اعلیٰ کردار عطا کیا۔ اس رسالے نے ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں اور عبدالماجد دریابادی کو سمت دکھائی۔ سرسید کے طریقے اور صحافتی اصولوں کو اپنا کر دوسرے صحافیوں نے صحافت کو ایک وقار و معیار دیا۔ سرسید اور ان کے اخبار و رسالے نے قوم کے اندر حلم و بردباری اور افہام و تفہیم کا سلیقہ سکھایا۔ مصلحت کوشی کی تعلیم دی۔ سرسید کے تصور میں یہ بات جگہ کر گئی تھی کہ انگریزی حکومت مانا کہ جابر و قاہر ہے اس کے باوجود اس کے اندر کئی صفات ہیں جن کو اختیار کر کے ہماری قوم آگے بڑھ سکتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے انگریزی تعلیم و نئے خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے سرسید نے اپنے رسالے سے اس مقصد کے حاصل کرنے کا کام انجام دیا۔ اس کے علاوہ بے شمار صحافی اور اخبارات تھے جنھوں نے تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی تفصیلات دوسرے ابواب میں گزر چکی ہے۔

## اپنی معلومات کی جانچ

1. جنگ آزادی سے مولوی محمد باقر کو کیا نسبت ہے؟
2. ''دہلی اردو اخبار'' کا مقصد اجرا کیا تھا؟
3. محمد حسین آزاد نے روپوشی کیوں اختیار کی؟
4. جنگ آزادی میں حسرت موہانی اور محمد علی جوہر کا کیا کردار تھا؟
5. ''زمیندار'' اخبار کا جنگ آزادی میں کیا حصہ ہے؟
6. ''پیسہ'' اخبار کس اخبار سے متاثر ہو کر جاری کیا گیا؟
7. ابوالکلام آزاد کی صحافتی خدمات؟
8. سرسید احمد خاں اور تہذیب الاخلاق؟

## 4.5 خلاصہ

ہندوستان تکثیری ملک ہے، یہاں طرح طرح کی بولیاں اور مختلف النوع قومیں آباد ہیں، یہاں کا ہر صوبہ اپنی ایک الگ شناخت اور خوبی رکھتا ہے۔ مغربی کمپنی اور ان کے اثرات ہمارے پورے ملک پر پڑے۔ برطانوی سلطنت کے جبر و استداد کا شکار پورا ملک ہوا۔ ایسے ماحول میں اردو صحافت نے ملک کو آزادی دلوانے میں دیگر زبانوں کی صحافت کے مقابلے زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ لہٰذا اردو صحافت اور جنگ آزادی اور اردو صحافت کی تاریخ اور اس کے حالات پر روشنی ڈالی گئی۔ جنگ کے اسباب پر دقت نظر کے ساتھ روشنی ڈالی گئی، جس میں انگریز مورخین نے اپنے سیاسی مفاد کے حصول کے لیے التباس پیدا کر رکھے تھے۔ ایک تحریک کو سازش کے طور پر بغاوت اور غدر کا نام دے رکھا تھا۔ مذکورہ مباحث میں صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، تاکہ طلبا کے دل میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کو رفع کیا جا سکے۔ 'جنگ آزادی، اسباب و صورتحال' موضوع کے ضمن میں کافی حد تک وضاحت سامنے آتی ہے۔ ''ہندوستان میں اردو اخبار نویسی کا آغاز'' کے تحت اب تک اردو صحافت اور اولین اخبار کے اختلاف رائے پر کسی قدر تفصیلی گفتگو سے دھند کو صاف کیا گیا ہے۔ اس اکائی کے تیسرے اہم موضوع ''ہندوستان میں اردو صحافت کا ارتقا'' کے تحت جنگ آزادی کے سبب اخبارات کی ارتقائی نوعیت پر تسلی بخش بحث کی گئی ہے اور اہم اخبارات اور دوران جنگ جاری ہونے والے اخبارات اور بند ہونے والے اخبارات کی تفصیلات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

مذکورہ تینوں ذیلی عنوانات کے تحت جنگ آزادی کی ابتدا اور حصول آزادی تک اخبارات کے آغاز و ارتقا پر تفصیلی روشنی

ڈالی گئی ہے۔ نیز جنگ کے اثرات ملک وقوم پر اور اردو صحافت پر کیسے مرتب ہوئے، اس کی تفصیل سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس اکائی میں فرہنگ کے تحت دیے گئے الفاظ و معانی سے تفہیم و ترسیل میں آسانی ہوگئی۔ آخری نکتے ''سفارش کردہ کتب'' بھی اہم ہے۔ اس سے طلبا کو مزید معلومات کے لیے آسانی پیدا ہوگئی ہے۔

## 4.6 فرہنگ

| | |
|---|---|
| الفاظ | معانی |
| التباس | گڈمڈ |
| محرکات | ابھارنے والے، مہمیز کرنے والے |
| جرائد | جریدہ کی جمع، میگزین |
| لائحہ عمل | منصوبہ، اسکیم |
| سیف | تلوار |
| مدغم | شامل |
| مسبب الاسباب | سبب پیدا کرنے والا |
| بیخ کنی | جڑ سے اکھاڑنا |
| سرود | باجا، ستار |
| ہنوز | ہمیشہ، سدا |
| برگ وبار | پھول پتی |
| منابع | منبع کی جمع، چشمے |
| طوائف الملوکی | بدنظمی، افراتفری |
| رزمیہ | جنگی |
| ضرب | چوٹ، گھاؤ |
| تعدی | ظلم وستم |
| شستگی | صفائی ستھرائی |

## 4.7 سفارش کردہ کتب

1. اردو صحافت — انور دہلوی، اردو اکادمی، دہلی 2006
2. جنوبی ہند کی اردو صحافت (1857 سے پیشتر) — ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، حیدرآباد 1981
3. مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت — ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، پاکستان 1989
4. ہندوستانی اخبار نویسی — محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ 1957
5. نیا دور (اردو صحافت نمبر) — جون جولائی 2011
6. جنگ آزادی کا درخشاں باب — ابرار رحمانی، وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند، 2007

# بلاک ۲

# اکائی۔5 : خبرنویسی،اداریہ نگاری، رپوتاژ نگاری، کالم نویسی فیچر نگاری

**ساخت**


5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 خبر کی تعریف اور خبر نگاری کا طریقہ کار

5.3.1 خبر میں استعمال ہونے والی زبان

5.4 اداریئے کی تعریف، اہمیت اور افادیت

5.5 رپوتاژ کی تعریف، اہمیت اور ضرورت

5.6 کالم نویسی کا فن، اداریئے اور کالم میں فرق

5.7 فیچر نگاری کا فن

5.8 خلاصہ

5.9 اپنی معلومات کی جانچ، نمونہ جوابات

5.10 نمونہ امتحانی سوالات

5.11 سفارش کردہ کتابیں


## 5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں خبر کی تعریف خبر لکھنے کے طریقہ کار۔خبر میں استعمال ہونے والی زبان،

اداریہ کی تعریف اور اس کی اہمیت وافادیت،

رپوتاژ کی تعریف اور اہمیت وضرورت،

کالم نویسی کے فن،فیچر کی خصوصیت اور اداریے وفیچر میں فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

اس اکائی کو اچھی طرح پڑھ اور سمجھ لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ خبر کی اصلیت و ماہیت بتا سکیں اور خبر تحریر کرنے کے فن/ تکنیک کو واضح کر سکیں۔

اداریئے کی تعریف واس کی اہمیت وافادیت پر گفتگو کر سکیں۔

رپوتاژ کی ماہیت واصلیت پر بحث کر سکیں،

کالم نگاری کے فن کی باریکیوں سے واقفیت حاصل کر لیں،

فیچر کی خصوصیت سمجھ کر فیچر و اداریے کے فرق کو واضح کر سکیں۔

## 5.2 تمہید

اخبار بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اخبار کا خبری حصہ اور اخبار کا غیر خبری حصہ۔ کسی بھی اخبار میں خبری حصہ جتنا اہم ہوتا ہے غیر خبری حصہ بھی قریب قریب اتنا ہی اہم ہوتا ہے۔

اخبار کے خبری حصے میں تو خبریں ہی خبریں ہوتی ہیں جس کی تفصیل آگے آئے گی مگر غیر خبری حصے سے بھی ہمیں بہت سی خبریں ملتی ہیں۔ مگر یہ خبریں مختلف قسم کے قارئین کے لیے الگ الگ دل چسپی کی حامل ہوتی ہیں۔ اس کے لیے اخبار میں مستقل کالم یا عنوانات ہوتے ہیں۔ اس زمرے میں اداریہ، کالم، فیچر، مضامین، قارئین کے خطوط، کتب پر تبصرے، کھیل پروگرام، رحلت کی خبریں، موسم کا حال، بازار بھاؤ، ریل اور ہوائی جہاز کے اوقات، مصروفیات اور دوسرے بہت سے مستقل عنوانات آجاتے ہیں۔ چوسٹھ (64) کالم کے اخبار میں عموماً بتیس 32 کالم غیر خبری حصے کے لیے وقف ہوتے ہیں۔

جہاں تک خبری حصے کا تعلق ہے تو بنیادی طور پر اخبار سماجی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات کی خبریں ہی عوام تک پہنچانے کے لیے معرض وجود میں آتا ہے۔ لیکن یہ خبریں اتنے فن کارانہ طریقے سے پہنچائی جائیں کہ ان میں قارئین کی دل چسپی پیدا ہو جائے اور وہ اسے ذوق و شوق سے پڑھیں بلکہ اسے حاصل کرنے کے لیے بے چین رہیں۔

## 5.3 خبر کی تعریف اور خبر نگاری کا طریقہ کار

خبر نگاری کی ابتدا ہوئے ایک لمبا عرصہ گذر چکا ہے۔ پھر بھی ابھی تک خبر کی کوئی ایسی جامع تعریف نہیں کی جا سکی ہے جس پر صحافیوں کی اکثریت متفق ہو۔ اس کے باوجود بعض لوگوں نے خبر کی تعریف کی ہے جو اس طرح ہے۔ لارڈ نارتھ کلف کا کہنا ہے کہ

''کوئی بھی غیر معمولی واقعہ خبر ہے۔ جب کہ عام واقعہ خبر نہیں۔''

امریکی صحافی جان لی بوگارڈ (سٹی ایڈیٹر) ''نیویارک مشن'' مثال دیتے ہوئے کہتا ہے۔

''اگر کتا انسان کو کاٹے تو یہ خبر نہیں۔ البتہ انسان کتے کو کاٹ لے تو یہ خبر ہے۔''

صداقت کے باوجود اس قول کے کچھ حصے تشنہ ہیں کہ کتا اگر کسی عام انسان کو کاٹے تو یہ خبر نہیں مگر کتا VIP کو کاٹ لے تو یہ واقعہ خبر کے دائرے میں آجائے گا۔ البتہ اس سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی غیر معمولی بات خبر ہو سکتی ہے۔

احمد نسیم سندیلوی اپنی کتاب ''خبر نگاری'' میں خبر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

''خبر کسی ایسے واقعے کا بیان ہے جو نیا ہو۔ عمومی دل چسپی کا باعث ہو۔ تازہ ہو، پہلے سے کسی کو معلوم نہ ہو، جو متحیر کرے، جس میں کاملیت ہو، پڑھنے والا تشنہ نہ رہے، اس کے بیان میں عصبیت نہ ہو جو اخبار یا جریدے میں شائع کرنے کے قابل ہو اور جس کی اشاعت سے

کسی کی تضحیک یا تذلیل نہ ہوتی ہو۔''

بعض افراد اسے انگریزی کی چاروں سمتوں کے ابتدائی حروف سے مل کر بنا ہوا بتاتے ہیں۔ مثلا:

NORTH - N

EAST - E

WEST - W

SOUTH - S

یعنی چاروں اطراف میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی اطلاع کو نیوز یعنی خبر کہتے ہیں۔ بعض ''نیوز'' کو ''نیو'' کی جمع بتاتے ہیں۔ جس کی رو سے ہر نئی بات خبر ہے۔ قواعد کی رو سے نیوز، نیو کی جمع ہو یا نہ ہو اتنی بات ضرور ہے کہ کوئی اطلاع یا کسی واقعے کا بیان اسی وقت تک خبر رہتا ہے جب تک نیا ہو۔ پرانا ہوتے ہی اس کی خبری اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

خبروں کے سلسلے میں پانچ ڈبلیو اور ایک ایچ اہمیت کا حامل ہے۔

کیا ہوا - What

کہاں ہوا - Where

کب ہوا - When

کون کون ملوث تھے - Who

کیوں ہوا - Why

کیسے ہوا - How

اگر کسی واقعے کی تفصیل میں ان چھ سوالوں کے جواب مل جائیں تو خبر کامل سمجھی جائے گی۔ اردو میں اسے چھ کا فی اصول کہتے ہیں۔

کون سی خبر اہم اور قابلِ اشاعت ہے اسے کتنی اہمیت دی جائے اس کا انحصار مندرجہ ذیل باتوں پر ہے۔

☆ خبر میں کتنے لوگ دل چسپی لیں گے۔

☆ خبر سے کتنے لوگ متاثر ہوں گے۔

☆ خبر کے آئندہ کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

☆ خبر کی نوعیت کیا ہے۔ (بین الاقوامی، قومی یا مقامی)

☆ خبر کا منبع کون سی جگہ ہے۔

☆ خبر میں انوکھا پن ہے یا عام سی خبر ہے۔

☆ خبر میں کتنی اہم شخصیت ملوث ہے۔

☆ خبر کتنی نئی ہے۔

☆خبر میں کسی راز سے پردہ اٹھایا گیا ہے یا کسی سازش کی نشاندہی کی گئی ہے۔

خبر کی اہمیت کا ایک عنصر ''قرب مکانی'' ہے۔خبر جتنے نزدیک کی ہوگی اتنی ہی دل چسپی سے پڑھی جائے گی۔اسی طرح ایک عنصر ''قرب زمانی'' ہے۔خبر جتنی تازہ ہوگی اتنی ہی اس کی اہمیت ہوگی۔جو خبر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے احساسات میں کھلبلی پیدا کرے۔جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بہلائے، پریشان کرے یا غور وفکر پر آمادہ کرے اسے زیادہ اہم کہا جاسکتا ہے۔

خبر تحریر کرتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ صحافتی انداز بیان کتابی انداز بیان سے مختلف ہوتا ہے۔اخباری تحریر میں اطلاع اہم ہوتی ہے۔جس کے بالواسطہ ابلاغ پر زور دیا جاتا ہے۔یعنی اسے اس انداز سے تحریر کیا جائے کہ قاری اپنے دماغ پر زور دیئے بغیر فوراً بات کی تہہ تک پہنچ جائے۔

خبریں تحریر کرنے کی کچھ مخصوص تکنیک ہوتی ہیں۔جس کے ذریعے خبر کو جاذب اور دل چسپ بنایا جاتا ہے۔بنیادی طور پر خبریں چار طریقوں سے لکھی جاتی ہیں۔

**1۔''الٹا اہرام''**:۔خبر تحریر کرنے میں الٹے اہرام سے مراد یہ ہے کہ ابتدا میں انتہا کو پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔یعنی جو اہم ترین بات ہوتی ہے وہ سب سے پہلے درج کی جاتی ہے۔جیسے جیسے پیراگراف بڑھتے ہیں کم اہمیت والی بات مذکور ہوتی ہے۔یعنی پہلے پیراگراف میں سب سے اہم دوسرے میں اس سے کم اہم تیسرے میں اس سے بھی کم اہم اسی طرح آخر تک۔اس میں ضروی نہیں ہوتا کہ خبر کی تفصیل سلسلہ وار بیان ہو۔اس طریقہ کار کو زیادہ تر اخبارات نے اپنا رکھا ہے۔

**2۔''خلاصہ''**:۔خبریں تحریر کرنے کا دوسرا طریقہ ''خلاصہ'' یا Summary کہلاتا ہے۔اس میں کسی خبر کا خلاصہ یا ماحصل گو کہ مختصر اور جامع انداز میں بیان کہا جاتا ہے پھر بھی کوشش کی جاتی ہے کہ خبر سے متعلق دماغ میں آنے والے تمام سوالات کے جوابات فراہم ہو جائیں۔

**3۔''معطل دلچسپی''**:۔جذباتی اہمیت کے مدنظر یا واقعے کے صورت حال کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر اہم بات ابتدا میں ہی بتا دی جائے تو خبر میں دلچسپی ختم ہو جانے کے امکانات ہوتے ہیں۔چنانچہ اس طریقہ کار میں قاری کی دل چسپی آخر تک قائم رکھنے کے لیے اہم بات آخر میں دی جاتی ہے۔

**4۔''سلسلہ وار بیان''**:۔سب سے اہم بات کو سب سے پہلے بیان کرنے کا طریقہ کار آج مرغوب بھی ہے اور فائدے مند بھی۔لیکن کچھ حالات وحادثات کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ انھیں ٹھیک سے ذہن نشین کرانے کے لیے سلسلہ وار تفصیلات ہی بیان کی جاتی ہیں۔ہو بہو اسی ترتیب کے ساتھ جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئی تھیں۔

## 5.3.1 خبر میں استعمال ہونے والی زبان

زبان کا بنیادی مقصد کسی اطلاع، مفہوم، خیال، تجربے، واقعات، کیفیت یا صورت حال کی پڑھنے یا سننے والوں تک ترسیل کرنا ہے۔ خبر چونکہ عوام کے ایسے گروہ کے لیے ہوتی ہے جس میں مختلف تعلیمی و ذہنی سطح کے لوگ ہوتے ہیں۔ لہذا خبر کی زبان کو زیادہ سے زیادہ سادہ اور آسان ہونا چاہیے۔ خبر میں نامانوس آدق اور مشکل الفاظ سے ہر صورت میں پرہیز کرنا چاہیے۔ مرکب اور پیچیدہ جملوں کو نہ صرف سمجھنے میں دقت آتی ہے بلکہ اس سے خبر کی پیش کش بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس میں مبہم الفاظ کے استعمال سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

کہا جاتا ہے کہ اخبار عوام کا معلم اور زبان سیکھنے کا وسیلہ ہوتا ہے مگر یہ موثر معلم جب ہی ہوگا جب اس میں زبان کی صحت کا پورا خیال رکھا جائے اور قواعد کی پابندی کی جائے اور خبر زبان کی سطح پر بھی دل چسپ ہو۔ یعنی روکھی پھیکی نہ ہو۔ بلکہ اس میں کچھ چاشنی بھی ہو۔ مناسب الفاظ، محاورے، مقولے یا شعر کا برجستہ استعمال ہو۔ جس سے زبان کا تیکھا پن نکھرے۔

مختصر یہ کہ خبر کی زبان میں:

سادہ اور سلیس زبان کا استعمال ہو۔

جملوں کی طوالت کم سے کم ہو۔

اسلوب زبان کے اصولوں کو برتا جائے۔

تحریر کو رنگ و روپ بخشنے کی کوشش کی جائے۔

متروک الفاظ اور گھسے پٹے جملوں سے احتراز کیا جائے۔

غیر عروج، غریب اور غیر علمی الفاظ کا استعمال نہ ہو۔

خبروں میں اپنی رائے شامل نہ کی جائے۔

## 5.4 اداریئے کی تعریف کی اہمیت اور افادیت

اداریہ اخبار کی وہ اہم تحریر ہوتی ہے۔ جس میں مدیر، ناشر یا مالک کسی اہم مسئلے پر رائے دیتا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے پھر بھی اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ اداریئے میں اہم خبروں کا تجزیہ بھی ہوتا ہے۔ اس سے کسی مسئلے پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کئی واقعات کی تفسیر و تشریح بھی ہوتی ہے۔ اس میں کسی مسئلے کی اہمیت بھی بتائی جاتی ہے۔ سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کا مفہوم سمجھایا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اس میں کسی تجویز کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ ملک یا سماج کے لیے غیر مفید منصوبے کی مزمت کی جاسکتی ہے۔ کسی مسئلے پر سوالات کئے جاسکتے ہیں۔ کوئی خاص رویہ اختیار کرنے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ اس میں تمام جائز مطالبات کیے جاسکتے ہیں۔ غرض اداریہ اخبار کے پاس ایسا حربہ ہے جس کے صحیح استعمال سے زندگی کے ہر شعبے کی نگرانی ہوسکتی ہے اور سماج کے صحت مند عناصر کے فروغ میں مدد لی جاسکتی ہے۔

اداریہ زیادہ تر ایڈیٹر خود لکھتا ہے یہ اسی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بڑے اخبارات میں جہاں ماہرین اداریہ کا عملہ ہوتا ہے۔ وہاں ایڈیٹر ماہرین کے اداریوں پر نظر ثانی کرتا ہے۔

اداریے کے لیے موضوع کا انتخاب بھی اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے ایسے موضوع کا انتخاب کرنا چاہیے جس میں زیادہ لوگوں کی دل چسپی ہو۔ اگر موضوع دل چسپ ہوگا تو مصروف سے مصروف قاری بھی اسے پڑھنے کی کوشش کرے گا۔ اس کی زبان سادہ سلیس اور رواں ہو۔ جملے پیچیدہ نہ ہوں۔ تحریر سے بلند ذوقی اور نفاست نمایاں ہو۔ اداریہ اس طرح تیار کیا گیا ہو جسے پڑھ کر قاری یہ محسوس کرے کہ کسی معاملے کی پوری نوعیت اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ اس کے ذریعے مدیر نہ صرف حقائق کو پیش کرے بلکہ حقائق پر جواں مردی سے تنقید بھی کرے اور قارئین کی صحیح رہنمائی بھی۔ مگر اپنے نظریات ان پر تھوپنے کی کوشش نہ کرے۔

اداریہ عام قاری کو نظر میں رکھ کر نہیں لکھا جاتا بلکہ اداریہ نگار کے پیش نظر باشعور، حالات حاضرہ پر نظر رکھنے والے اور کسی مسئلے کے پس منظر سے واقفیت کی خواہش رکھنے والے قاری ہوتے ہیں۔

اداریئے میں طعن وطنز، ہجویہ طرز، تنقید برائے تنقید اور احساسات و جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اسلوب سے دامن بچا کر حقائق کو استدلال کے ساتھ مودبانہ طرز میں پیش کرنے سے اخبار کا وقار اور مدیر پر عوام کا اعتماد بڑھتا ہے۔

اداریئے میں ہمیشہ ''ہم''، ''ہماری رائے میں''، ''ہمارے خیال میں'' جیسے الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اداریہ کسی فرد کا تحریر کردہ ہو یا ادارتی عملے کا اس میں لفظ ''ہم'' ہی استعمال ہوگا۔ اسے صحافتی اصطلاح میں ''ایڈیٹوریل وی'' کہتے ہیں۔

## 5.5 رپوتاژ۔ تعریف، اہمیت وضرورت

رپوتاژ (Reportage) فرانسسی زبان کا لفظ ہے جسے انگریزی میں رپوٹ کے ہم معنی قرار دیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک صحافتی تحریر ہے۔ لانگ مین یونیورسل ڈکشنری میں Reportage کے معنی اس طرح دیے ہوئے ہیں۔

1. The Act or Process of reporting news.
2. Writing Intended to give a factual account of events.

ڈیوڈ گرامبس Reportage کے سلسلے میں لکھتا ہے۔

"The reporting of news, factual topical writing that comes from direct observation or documentable events of situation news writing news story."

جان گیری رپوتاژ کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

''رپوتاژ عینی مشاہد کے ذریعے ضابطہ تحریر میں لائے گئے ایسے ٹھوس حقائق ہیں جو حادثے یا واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے بعد قلمبند کے گئے ہوں۔ وقت اور تاریخ کا تعین اور خود

مصنف کا عینی شاہد ہونا رپوتاژ کو زیادہ معتبر بنا دیتا ہے۔''

ان تعریفوں سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ رپوتاژ میں خیالی یا تصوراتی چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ حقیقت کا بیان ہوتا ہے۔ اس میں سنی سنائی چیزیں بھی بیان نہیں ہوتیں بلکہ زیادہ تر ناقدین نے رپوتاژ نگار کا کسی واقعہ یا حادثے کے عینی شاہد ہونے پر زور دیا ہے۔ جس طرح زندگی وسیع ہے اسی طرح رپوتاژ کے موضوع کا دامن بھی وسیع ہے۔ اس میں متعینہ وقت پر وقوع پذیر واقعات و حادثات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں جنگ، بلوے، فسادات، قحط، ادبی و تہذیبی جلسے اور تقاریب، سیر و سیاحت تہوار اور ان کی تقاریب، میلوں ٹھیلوں، نمائش، پکنک کھیل تماشوں اور چھوٹی بڑی شعری و ادبی محفلوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جا سکتا ہے۔

رپوٹنگ اور رپوتاژ میں یہ فرق ہے کہ رپوٹنگ میں امر واقعہ کا سیدھا اور صاف بیان ہوتا ہے جب کہ رپوتاژ میں مصنف کے داخلی تجربات و محسوسات بھی داخل کر دیے جاتے ہیں۔ چونکہ رپوتاژ میں مصنف خود عینی شاہد ہوتا ہے اس لیے کسی واقعے یا حادثے کو دیکھنے کے بعد اس کے دل پر جو گذرتی ہے اسے بھی وہ اپنے بیان میں شامل کر لیتا ہے۔ رپوتاژ میں تفصیلات، جزئیات اور منظر و پس منظر کو بروئے کار لا کر قاری کے سامنے مکمل تصویر پیش کر دی جاتی ہے۔ یہی چیز رپوٹ کو رپوتاژ بنا دیتی ہے۔ کانفرنسوں اور جلسوں کی روداد کو اخبار کی خبر کے بجائے تخلیقی تجربہ بنا کر پیش کرنا ہی رپوتاژ نگاری کا فن ہے۔

رپوتاژ میں بیانیہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ زبان و بیان کی شیرینی و لطافت اسے دل چسپ بنا دیتی ہے۔ چونکہ اس میں واقعات و حادثات کی صداقت کو برقرار رکھنا ہوتا ہے لہذا شگفتہ و شستہ زبان کا استعمال نہ کیا گیا تو یہ محض واقعات کی کھتونی ہو کر رہ جائے گا۔

رپوتاژ ایک غیر افسانوی ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر گیا ہے مگر اس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

## 5.6 کالم نویسی کا فن

کالم ایک ایسی صحافتی تحریر ہے۔ جس میں کالم نگار کسی خاص موضوع پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے اس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ کالم کی تحریر عام تحریر سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ چونکہ کالم میں ذاتی رائے کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔

اس لیے کالم نگار اس میں اپنے خیالات کا اظہار برملا کرتا ہے اور اپنی ذاتی رائے کی ذمہ داری بھی قبول کرتا ہے، شاید اسی لیے اس میں ہم کے بجائے ''میں''، ''میری رائے'' میں جیسے الفاظ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔

کالم کے اسلوب میں مزاح کا چٹخارہ اور زبان و بیان میں شوخی ہو تو اس کی کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ کالم میں ایک معمولی بات کو غیر معمولی بنا کر پیش کرنا کالم نگار کا ہنر تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں شائستگی، زندہ دلی اور شگفتگی شانہ بہ شانہ رہتی ہے۔

کالم میں اہم مسائل کا حل اور پیچیدہ معاملات کی توضیح اور تازہ خبروں پر انوکھے زاویوں سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کالم نگار اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کبھی کنایتاً اور کبھی برملا کرتا ہے۔ کبھی وہ اپنی وسعت معلومات سے قاری کو متحیر کرتا ہے اور کبھی نئے زاویوں کو نمایاں

کر کے دعوت فکر دیتا ہے۔ کالم نویس مبصر بھی ہوتا ہے اور شارح بھی۔ کالم کے لیے موضوع کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی چھوٹے بڑے کسی موضوع پر کالم لکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کالم کی کوئی متعینہ طوالت بھی نہیں ہوتی یہ موضوع کی وسعت و گہرائی پر منحصر ہوتا ہے اور لکھنے والے کے اسلوب و انداز پر۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کالم اور اداریے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ دراصل مقصد دونوں کا ایک ہے۔ جو کام اداریہ کرتا ہے وہی قریب قریب کالم بھی کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کالم زیادہ شگفتہ ہلکا پھلکا اور غیر رسمی ہوتا ہے جب کہ اداریہ بھاری بھرکم سنجیدہ اور مدلل ہوتا ہے۔ جو باتیں اداریئے میں سنجیدگی کی وجہ سے نہیں کی جا سکتیں۔ کالم میں ہلکے پھلکے انداز میں بڑی آسانی سے کہہ دی جاتی ہیں۔ اداریئے کے ساتھ اداریہ نگار کا نام نہیں جاتا۔ وہ ایک سنجیدہ، معیاری اور فکر انگیز تحریر لکھ کر بھی گمنام رہتا ہے۔ اس کے برخلاف کالم کے ساتھ کالم نویس کا نام ضرور ہوتا ہے۔ کالم میں ایک ایک لفظ کی ذمہ داری بھی کالم نویس کی ہوتی ہے۔

غرض کالم خیالات کے اظہار کا ایک ایسا پر تاثیر ذریعہ ہے۔ جس سے قارئین کو دعوت فکر ملتی ہے۔

## 5.7 فیچر نگاری کا فن

فیچر ایک ہلکا پھلکا مضمون ہوتا ہے جس میں کسی اداریے، شئے یا فرد پر ضروری روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ فیچر میں تحقیقی مواد جیسے تازہ اعداد و شمار، حقائق ان کے ثبوت و حوالہ جات کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی اس کے باوجود فیچر لکھنا کوئی آسان نہیں ہوتا۔ اس کی تحریر میں تازگی لطافت اور چستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ فیچر میں ابتدا وسط اور اختتام ہوتا ہے۔ پھر بھی اختصار یعنی جامعیت فیچر کی روح ہے۔ طوالت اور لفاظی فیچر کا لطف ختم کر دیتی ہے۔ فیچر میں ایک ہی بات یا ایک خیال پر پوری توجہ صرف کر کے اسے سنوارا اور نکھارا جاتا ہے۔ اس میں کئی کیفیت کے بجائے ایک ہی کیفیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

فیچر میں دلچسپی اور لطف کے لیے موقعہ و محل کی مناسبت سے چھوٹے موٹے قصے یا لطیفے بھی دیے جا سکتے ہیں۔ اور اس میں ڈرامائیت بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ فیچر نہ صرف شروع سے آخر تک رواں خوشگوار اور درخشاں ہو بلکہ اس کا اختتام بھی دل چسپ ہو۔ فیچر کے مسرت آگیں اور فرحت بخش پہلو سے کبھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا گو کہ اس میں مدلل اور فلسفیانہ گفتگو بھی ہوتی ہے۔ منطقی دلائل بھی دیے جاتے ہیں۔ فیصلہ کن باتیں بھی ہوتی ہیں۔ پھر بھی یہ زیادہ عالمانہ اور خشک نہیں ہوتا۔

فیچر کے لیے موضوعات کا بھی کوئی تعین نہیں ہے کہا جاتا ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر کسی بھی موجود شئے پر فیچر لکھا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں کوئی اہم پہلو، تازگی اور ندرت پیدا کی جا سکے۔ ان سب چیزوں کے لیے کوئی شخص وجدان، غور و فکر، وسیع مطالعے اور تجربے سے فیچر کے لیے نئے نئے موضوع حاصل کر سکتا ہے۔ کسی بھی قدیم موضوع کو ایک نیا زاویہ دے کر فیچر میں نئی جان ڈالی جا سکتی ہے۔

## 5.8 خلاصہ

خبر عوامی میراث سمجھی جاتی ہے۔ اسے کسی فرد کی ملکیت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مشہور انگریزی مصنف اور صحافی ڈیفو نے کہا تھا کہ

سماج کو تقویت خبروں سے ہی ملتی ہے۔اور انسانی زندگی کے چلن میں خبروں کا مقام کافی بلند ہے۔خبر گویا زمانے کی آواز ہے۔ہم عصر انسان کی اہم ضرورت ہے۔ یہ دن بھر کے واقعات کو تحریر میں نکھار کر، آواز میں سجا کر اور تصویر میں سمو کر اس کی اس خواہش کی تکمیل کرتی ہے جس کے تحت وہ ہر نئی بات جاننے کے لیے بےچین رہتا ہے۔خبری تحریر میں الفاظ ہلکے پھلکے، جملے چھوٹے چھوٹے، زبان سادہ، صاف و آسان اور پیراگراف چھوٹے چھوٹے ہوں تو بہتر ہے۔

خبروں کے ساتھ ساتھ اخبار میں اداریئے کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔کسی نے اسے اخبار کی جان کہا ہے تو کسی نے اس کا ضمیر۔ اس سے اخبار کی بے باکی اور پالیسی کا اظہار ہوتا ہے جو کہ اخبار کے کردار کا تعین کرتا ہے۔اداریہ اپنے دلائل اور استدلالی اسلوب سے فرد یا گروہ کی رائے کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اسی طرح اخبار میں رپوتاژ کا چلن بھی کافی عام ہو گیا ہے۔اس میں کسی واقعے، حادثے، کانفرنس یا جلسے کی روداد و بیان کی جاتی ہے جو حقائق پر مبنی ہوتی ہے۔اس میں رپوتاژ نگار حادثے یا واقعے کا آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری اس میں اپنے کو شامل محسوس کرتا ہے۔

رپوتاژ میں تفصیلات و جزیات کی مدد سے قاری کے سامنے مکمل تصویر پیش کر دی جاتی ہے۔اس میں زبان و بیان سادہ صاف اور رواں ہوتا ہے اس میں عموماً بیانیے کا استعمال کیا جاتا ہے۔

کالم ہم عصر صحافت کی ایک اہم تحریر ہے۔اس میں اہم مسائل کا حل، پیچیدہ معاملات کی توضیح اور تازہ خبروں پر انوکھے زاویئے سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔کالم کا اسلوب شگفتہ اور انداز غیر رسمی ہوتا ہے۔زندہ دلی، شگفتگی، لطیفے، چٹکلے، پھبتی اور قصے و کہانی جیسی چیزیں کالم کو کالم بناتی ہیں۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کالم غیر سنجیدہ ہوتا ہے یہاں بے خودی میں ہشیاری اور سادگی میں پرکاری برتی جاتی ہے۔

اردو صحافت کی تمام تر ترقی کے باوجود ہندوستان میں اخباری فیچر اس حد تک مقبول نہ ہو سکا جتنا کہ امریکہ اور یوروپ میں ہوا۔اس کی مختلف وجوہات ہیں پھر بھی بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو یہ عصری صحافت کا ناگزیر حصہ بن چکا ہے۔ یہ ایک ہلکا پھلکا مضمون ہوتا ہے جس میں کسی شئے یا فرد پر ضروری روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔اس کی تحریر میں تازگی لطافت اور چستی کی ضرورت ہوتی ہے۔

## 5.9 اپنی معلومات کی جانچ

1۔خبر کی بنیادی خصوصیت کیا ہے۔

a۔ایسا واقعہ جو نیا ہو
b۔ایسا واقعہ جس کی تفصیل ہو
c۔ایسا واقعہ جو پہلے سے سب کو معلوم ہو
d۔ایسا واقعہ جس پر کسی کو تعجب نہ ہو

2۔خبر میں استعمال ہونے والی زبان کیسی ہونی چاہیے۔

a۔مقفی و مسجع
b۔سادہ و سلیس

c۔جس میں نامانوس ادق اور
مشکل الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو۔

d۔جس میں قواعد اور صحت زبان کی پروا نہ کی گئی ہو۔

3۔اداریہ کیسے قاری کو ذہن میں رکھ کر لکھا جاتا ہے۔

a۔عام قاری کو نظر میں رکھ کر

b۔متوسط پڑھے لکھے قاری کو ذہن میں رکھ کر

c۔باشعور اور حالات حاضرہ پر
نظر رکھنے والے قاری کو نظر میں رکھ کر

d ۔یا کسی بھی قاری کو نظر میں رکھ کر نہیں لکھا جاتا

4۔ریپوتاژ کو کیا چیز زیادہ معتبر بناتی ہے۔

a۔ریپوتاژ نگار کا کسی واقعہ کا عینی شاہد ہونا

b۔سنی سنائی چیزوں پر انحصار کرنا

c۔اس میں افسانویت پیدا کرنا

d۔رنگین اسلوب اختیار کرنا

5۔کالم میں لکھی باتوں کی ذمہ داری کس کی ہوتی ہے۔

a۔ایڈیٹر کی

b۔کالم نگاری کی

c۔سب ایڈیٹر کی

d۔یا کسی کی نہیں

6۔کتا انسان کو کاٹے تو یہ خبر ہے۔ صحیح/غلط

7۔اخبار میں اداریہ لکھنے کی ذمہ داری ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ صحیح/غلط

8۔اخبار کو بنیادی طور پر دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ صحیح/غلط
اخبار کا خبری حصہ اور اخبار کا غیر خبری حصہ

9۔خبر تحریر کرنے کے طریقے الٹے اہرام میں جو سب سے اہم بات ہوتی ہے
وہ سب سے بعد میں تحریر کی جاتی ہے۔ صحیح/غلط

10۔ریپوتاژ کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ صحیح/غلط

11۔اخباری فیچر عصری صحافت کا ناگزیر حصہ ہے۔ صحیح/غلط

12۔اخباری تحریر میں سب سے اہم کیا چیز ہوتی ہے۔

a۔قصے کہانیاں

b۔اطلاع

c۔ایسا انداز جس میں بات کو گھما پھرا کر کہا گیا ہو

d۔جس میں مشکل زبان کا استعمال ہو

13۔کالم کے ساتھ کس کا نام جاتا ہے۔

a۔ایڈیٹر کا

b۔کالم نگار کا

c۔سب ایڈیٹر کا

d۔کسی کا نہیں

## اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

1۔a۔ایسا واقعہ جو نیا ہو۔

2۔b۔سادہ و سلیس۔

3۔c۔باشعور قاری کو ذہن میں رکھ کر۔

4۔a۔رپوتاژ نگار کا عینی شاہد ہونا۔

5۔a۔ایڈیٹر کی

6۔غلط

7۔صحیح

8۔صحیح

9۔غلط

10۔غلط

11۔صحیح

12۔b۔اطلاع

13۔b۔کالم نگار کا

## 5.10 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ذیل کے ہر سوال کا جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1۔خبر کسے کہتے ہیں۔اس کی اہمیت وافادیت کیا ہے۔

2۔اداریے کی تعریف کرتے ہوئے اداریئے اور کالم کا فرق واضح کیجیے۔

II۔مندرجہ ذیل ہر سوال کا جواب پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1۔کالم کے امتیازات پر روشنی ڈالیے۔

2۔فیچر نگاری کے فن سے بحث کیجیے۔

## 5.11 سفارش کردہ کتابیں

1۔سید اقبال قادری۔رہبر اخبار نویسی،نیشنل کونسل فار پرموشن آف اردو لینگویج،نئی دہلی،1989

2۔احمد نسیم سندیلوی،خبر نگاری،مقتدرہ قومی زبان۔اسلام آباد،1992

3۔انور دہلوی (مرتب)، اردو صحافت، دہلی اردو اکیڈمی، دہلی، 1987
4۔محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2003

# اکائی۔6: پریس کانفرنس اور رپوٹنگ

ساخت


6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 پریس کانفرنس کی تعریف

6.4 پریس کانفرنس حدود وامکانات

6.5 رپوٹنگ (نامہ نگاری)

6.6 نامہ نگاروں کے اقسام

6.7 نامہ نگاری کے بنیادی اصول

6.8 خلاصہ

6.9 اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

6.10 نمونہ امتحانی سوالات

6.11 سفارس کردہ کتابیں


## 6.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں پریس کانفرنس، رپورٹنگ یا نامہ نگاری کی تعریف اس کی اصلیت و ماہیت، طریقہ کار اور بنیادی اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس اکائی سے استفادہ کرنے کے بعد آپ پریس کانفرنس اور رپورٹنگ کے طور طریقے اور اہمیت وافادیت سے پوری طرح واقف ہوجائیں گے اور یہ بھی جان لیں گے کہ پریس کانفرنس کیسے بلائی جائے۔ کب بلائی جائے۔ اسے منظّم کرنے کا طریقہ کیا ہو۔ اس سے بھی واقف ہوجائیں گے کہ نامہ نگار کی کیا ذمہّ داریاں ہوتی ہیں۔ نامہ نگار کے اندر کن چیزوں کی اہلیت ہونی چاہیے۔

## 6.2 تمہید

ذرائع ابلاغ کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے اور خبریں واطلاعات حاصل کرنے کے نئے نئے طریقے وجود میں آگئے خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کے فروغ کے بعد۔ انھیں میں سے ایک پریس کانفرنس بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے لوگ اپنے نظریات وخیالات کی ترسیل وتبلیغ نہیں کرتے تھے۔ پہلے لوگ گھر گھر جا کر ذاتی ملاقات کے ذریعے اپنی بات کہتے تھے۔ میلے ٹھیلوں یا عوامی جلسوں میں تقریر کرکے۔ خصوصی لکچر پروگرام منعقد کرکے یا پد پاترا نکال کر اپنی بات کہتے یا اپنے نظریات کی تبلیغ

کرتے تھے۔لیکن ان سب طریقوں سے پیغام محدود دائرے تک ہی پہنچ پاتا تھا مگر اب جدید ذرائع کا استعمال کرنے کے بعد اس کی پہنچ لامحدود ہوگئی ہے۔رپوٹر یا نامہ نگار کے ذریعے خبریں حاصل کر کے اخبار کے آفس تک پہنچانے کا طریقہ کار بہت پرانا ہے۔

پہلے خبریں بھیجنے کے ذرائع بہت سست تھے۔اب وہ بہت تیز ہوگئے ہیں بلکہ اب تو کسی واقعے یا حادثے کی جائے وقوع کا نظارہ براہ راست دکھا دیا جاتا ہے۔اس لیے اب اس کی ضرورت، اہمیت وافادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

## 6.3 پریس کانفرنس کی تعریف

ایک پریس کانفرنس تو وہ ہوتی ہے جو ٹیلی ویژن کے مختلف چینلوں پر آپ کو اکثر نظر آتی ہے کہ بہت سے رپورٹر مائک لیے ہوئے کسی اہم شخصیت کو گھیرے ہوتے ہیں آج کل تو اتنے مائک ہوجاتے ہیں کہ شخصیت اس میں چھپ جاتی ہے اور بیک وقت اتنے سوالات ہوجاتے ہیں کہ ان کا جواب دینا مشکل ہوجاتا ہے۔لیکن پریس کانفرنس صرف یہی نہیں بلکہ فی زمانہ اپنی بات، خیالات و نظریات عوام کے بڑے گروہ تک بروقت پہنچانے کا ایک کارگر حربہ ہے اور رپورٹرس کے لیے خبریں حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ۔

## 6.4 پریس کانفرنس حدود وامکانات

جدید دور میں اپنی بات، خیالات ونظریات عوام تک پہنچانے کا پریس کانفرنس ایک بہترین ذریعہ ہے۔کسی پارٹی، ادارے یا انجمن کے ذمہ داران یا کوئی فرد جب اپنی بات عوام تک پہنچانا چاہتا ہے تو پریس کے نمائندوں کو مدعو کرتا ہے۔پریس کے نمائندوں کو بھی ایسے مواقع کی تلاش رہتی ہے کہ انھیں اپنے اخبار کے لیے مواد مل سکے۔پریس کانفرنس میں کانفرنس منعقد کرنے والا اپنی بات نمائندوں یا رپورٹر کے سامنے رکھتا ہے۔رپورٹر اس سے طرح طرح کے سوالات کر کے پارٹی، ادارے یا شخص کے بارے میں جانکاری حاصل کرتے ہیں کبھی کبھی پریس کانفرنس تشہیر کے لیے بھی بلائی جاتی ہے۔پریس کانفرنس اس وقت بھی بلائی جاتی ہے جب آپ کسی خاص موقعے پر کچھ خاص باتیں عوام تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

میڈیا کے ذریعے اپنی بات عوام تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ''پریس ریلیز'' بھی ہے۔یعنی آپ کوئی تحریری بیان اخبار یا الیکٹرانک میڈیا کے اداروں کو بھیج دیں لیکن پریس کانفرنس میں آپ زیادہ اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں کیوں کہ اس میں سوال و جواب بھی ہوتا ہے۔روبرو گفتگو کر کے آپ کسی نکتے پر زیادہ زور دے سکتے ہیں۔اپنے یا اپنے ادارے کے خلاف ہونے والی تشہیر کو زیادہ موثر انداز میں رد کر سکتے ہیں۔

پریس کانفرنس سے آپ کی بات ہی عوام تک نہیں پہنچتی بلکہ آپ کے وقار میں بھی اضافہ ہوتا ہے کہ پریس آپ کی بات سنتا ہے۔

پریس کانفرنس آپ کو اس وقت بلانی چاہیے جب آپ یا آپ کا ادارہ کسی خاص بات کو عوام تک پہنچانا چاہتا ہو۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خاص موقعے کے باوجود آپ میڈیا کو بلانا نہیں چاہتے مگر ایسا کم ہوتا ہے۔پریس کانفرنس اس وقت بھی بلائی جاتی ہے جب کسی واقعے میں کوئی اہم شخصیت شامل ہو یا جب آپ مستقبل کے کسی خاص منصوبے کی اطلاع عوام کو دینا چاہتے ہیں مثلاً کوئی مہم

شروع کررہے ہیں اگر کسی ادارے یا شخص پر کوئی پریشانی آجائے تو بھی پریس کانفرنس بلاتے ہیں۔

اگر کوئی ایسی رپورٹ یا عدالت کا کوئی فیصلہ آجائے جس سے عوام یا ادارہ یا پارٹی متاثر ہورہی ہے تو بھی پریس کانفرنس بلائی جاتی ہے۔

اگر کوئی ایمرجنسی ہوتو پریس کانفرنس جلدی میں بھی بلائی جاتی ہے۔ ورنہ اس کے لیے ایک ہفتے سے پندرہ دن کا وقت دینا چاہیے۔ جس میں تاریخ، وقت اور جگہ کا تعین واضح طور پر ہو۔ اس بات کا بھی پتہ لگالینا چاہیے کہ آپ کی کانفرنس پہلے سے مقررہ کسی کانفرنس سے ٹکرا تو نہیں رہی ہے۔

کانفرنس کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے جو شہر کے قلب میں ہو اور جہاں رپوٹر کو زیادہ سفر نہ کرنا پڑے اور وہاں پارکنگ کی گنجائش بھی ہو۔

آپ جو بات کہیں اختصار اور جامعیت کے ساتھ کہیں۔ زبان صاف، سادہ اور ابہام سے پاک ہو۔ الفاظ اشتعال انگیز نہ ہوں۔

جو کچھ آپ کو کہنا ہے اس کے لیے چار پانچ پوائنٹ بنالیں۔ رپوٹر کی طرف سے کئے جانے والے ممکنہ سوالات کو ذہن میں رکھیں۔ ہمیشہ سچ کہیں غلط کوئی بات نہ کہیں۔ اگر کسی سوال کا جواب معلوم نہیں ہے تو صاف کہہ دیں۔ بات کو بلاضرورت بڑھا چڑھا کر بیان نہ کریں۔ ایسے اعداد وشمار نہ دیں۔ یا ایسی باتیں نہ کہیں جو شواہد سے میل نہ کھاتی ہوں۔ کسی رائے کو حقیقت کے طور پر پیش نہ کریں۔

## 6.5 رپوٹنگ۔ نامہ نگاری

اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن مراکز اور نیوز ایجنسیاں خبریں حاصل کرنے کے لیے اپنے نمائندے مقرر کرتی ہیں۔ یہ نمائندے، نامہ نگار، رپوٹر یا کرسپانڈنٹ کہلاتے ہیں۔ ان کا کام خبروں کو حاصل کرکے متعلقہ ادارے کے دفتر تک کسی بھی ذریعے سے بروقت پہنچانا ہوتا ہے۔ ان کا یہ عمل نامہ نگاری یا رپوٹنگ کہلاتا ہے۔

نامہ نگاری یا نامہ نگاروں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ذرائع ترسیل کتنی بھی ترقی کرجائیں الفاظ و تصاویر کی مراسلت کے لیے کتنی ہی برق رفتار مشینیں تیار ہوجائیں۔ خبروں کی ترسیل نامہ نگاروں کی نامہ نگاری یا رپوٹنگ کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔ مشینیں خود جاکر تو خبریں حاصل کرنے سے رہیں۔ بنیادی طور پر خبروں کی فراہمی نامہ نگاروں کے ذریعے ہی ہوگی۔ خبر رساں ایجنسیوں سے آنے والی خبریں بھی بنیادی طور پر نامہ نگاروں کے ذریعے ہی حاصل کی جاتی ہیں۔

خبر رساں ایجنسیوں کی ترقی کے باوجود ہر بڑا اخبار اپنے خصوصی نامہ نگار بھی رکھتا ہے۔ ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ انھیں کچھ ایسی خبریں بھی میسر آجائیں جو دوسروں کو نہیں ملی ہیں۔

## 6.6 نامہ نگاروں کے اقسام

اخبار جہاں سے نکلتا ہے۔ وہاں کی مقامی خبریں حاصل کرنے والوں کو رپوٹر کہتے ہیں۔ بعض رپوٹر عمومی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان کے ذمے زندگی کے ہر شعبے کی رپوٹنگ ہوتی ہے۔ بعض خصوصی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان کے سپرد الگ الگ شعبوں کی خبریں جمع کرنے کا کام ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے شعبے ہی کی رپوٹنگ کرتے ہیں۔ مثلاً عدالتی رپوٹر صرف عدالتوں اور کرائم رپوٹر صرف جرائم کی ہی رپوٹنگ کریں گے۔ بعض اخبارات یا ادارے خبروں کی نوعیت کے لحاظ سے رپوٹروں کو کام تقسیم نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ان میں علاقے تقسیم کرتے ہیں۔ ہر رپوٹر کو ملا ہوا علاقہ اس کی بیٹ (Beat) کہلاتا ہے اور اس علاقے کی ہر طرح کی خبریں حاصل کرنا اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ باہر کے علاقوں میں متعین رپوٹر Correspondents کہلاتے ہیں، یہ بھی اپنے اپنے علاقوں میں اسی طرح کام کرتے ہیں جس طرح رپوٹر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی نمائندگان ہوتے ہیں جنھیں تین درجات میں تقسیم کیا گیا ہے۔

**خصوصی نامہ نگار**: کوئی اہم کانفرنس ہو، قومی یا بین الوامی سطح کا اجلاس ہو تو بڑے بڑے اخبارات اپنے تجربے کار صحافیوں کو وہاں بھیجتے ہیں۔ یہ خصوصی نامہ نگار کہلاتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہاں کی اہم خبریں وہ پہلے حاصل کریں اور انھیں کوئی ایسی چیز مل جائے جو دوسروں کو نہیں ملی ہے، ایسی چیزیں حاصل کر لینا ہی ان کا کمال ہوتا ہے۔ کہیں بڑا ریل یا بس حادثہ ہو گیا ہو، زلزلہ یا سیلاب آ گیا ہو، سیاسی جماعتوں کا سالانہ اجلاس ہو یا اولمپک ایشائی کھیل ہوں، خصوصی نامہ نگار اپنی کارگذاری دکھانے کے لیے موجود رہتے ہیں۔

**غیر ملکی نامہ نگار**: یہ دوسرے ممالک کے بڑے شہروں یا دارالخلافہ میں تعینات کئے جاتے ہیں۔ گویا یہ اس ملک میں کسی اخبار یا ادارے کے سفیر ہوتے ہیں۔ ان کے فرائض میں ہے کہ وہ جس ملک میں ہیں وہاں سے اہم اور غیر معمولی خبریں اپنے اخبار یا ادارے کو بھیجیں۔ وہ اکثر اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ اگر خبر رساں ادارے کسی خبر کے سلسلے میں جانبداری برتیں تو وہ صحیح رخ پیش کر دیں۔ بعض اخبارات ان سے ہفت روزہ یا پندرہ روزہ خبر نامے طلب کر کے ان کی بنیاد پر اہم غیر ملکی معاملات پر خصوصی جائزے شائع کرتے ہیں۔

**لابی نامہ نگار**: لابی نامہ نگار وہ کہلاتے ہیں۔ جنھیں بعض اخبارات پارلیمنٹ اور قانون ساز اسمبلی کے اس ہال میں مقرر کرتے ہیں جسے ''لابی'' کہتے ہیں۔ اراکین پارلیمنٹ یا اسمبلی وہاں کبھی کبھی کچھ دیر آرام کرنے یا ضروری ملاقاتیوں سے ملنے آتے ہیں۔ یہاں خصوصی لابی پاس کے ذریعے چند اخباری نمائندوں کو آنے جانے کی اجازت رہتی ہے۔

لابی میں بہت تجربہ کار نامہ نگاروں کی تقرری ہوتی ہے۔ یہ نامہ نگار آراکین اسمبلی یا ممبر پارلیمنٹ سے ملتے رہتے ہیں اور بہت سی خبریں یا ان کا سراغ قبل از وقت حاصل کر لیتے ہیں۔

نامہ نگاری کے لیے کسی بھی شخص کا صحافت کی طرف شدید میلان ضروری ہے یہ فن رجحان، ذوق، شوق، محنت اور لگن سے بھی

حاصل کیا جاتا ہے۔ نامہ نگار کو گفتگو کے آداب سے واقف اور موقع کی نزاکت کو سمجھنے والا ہونا چاہیے۔ نامہ نگار کا دلیر، گرم جوش، ملنسار، بیدار مغز اور خوشگوار حد تک باتونی ہونا پیشے میں معاونت کرتا ہے۔

حق پرستی اور راست بازی کا اخبار نویسی سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نامہ نگار کو ہمیشہ صحیح خبر پیش کرنے والا اور اخلاقی ضابطوں کا پابند ہونا چاہیے۔ اسے ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے اعتماد مجروح ہو۔ صحافتی دنیا میں اعتماد کی بڑی اہمیت ہے۔

نامہ نگار کے لیے بہترین علمی صلاحیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے ثقافتی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی امور کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ سے بھی گہری واقفیت ہونی چاہیے۔ کسی معاملے کی تہہ تک پہنچ کر صحیح نتائج اخذ کرنے میں علمی استعداد سے کافی مدد ملتی ہے۔

نامہ نگار کا خبروں کا ہی کاروبار ہوتا ہے لہذا اس کے اندر خبر سونگھ لینے کی حس بہت تیز ہونی چاہیے۔ اس حس کے ذریعے نہ صرف وہ خبر تک بروقت رسائی حاصل کرتا ہے بلکہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کون سے واقعے میں خبر کتنی ہے۔ اس کے اندر یہ فیصلہ کرنے کی قوت بھی تیز ہونی چاہیے کہ کون سی خبر کتنی اہم ہے اور کتنی مقبولیت حاصل کرے گی۔

## 6.7 نامہ نگاری کے بنیادی اصول

نامہ نگاری کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کسی کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اگر کسی نے کوئی معلومات اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ اسے متعینہ مدت کے بعد شائع کیا جائے تو اسے وقت مقررہ کے بعد ہی شائع کرنا چاہیے۔ اخبار گھر کے تمام افراد پڑھتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی فحش بات نہ ہو جسے پڑھ کر شرمندگی ہو۔ جرائم، شرمناک واقعات اور سماجی برائیوں کی خبریں اس انداز سے دی جائیں کہ قارئین اس سے نفرت کریں۔ جرائم پیشہ اور سماج دشمن عناصر کو بہادر اور ہیرو بنا کر نہ پیش کیا جائے۔ جس سے دوسروں کو ویسا بننے کی تحریک ملے۔

نامہ نگار کو خبروں میں ہر فرد ہر قوم اور ہر ادارے کے ساتھ برابر کا سلوک کرنا چاہیے۔ اسے کسی کی زندگی میں بیجا مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ اشتہار اس طرح نہ پیش کیا جائے جس پر خبر کا گمان ہو۔

نامہ نگار جو کچھ لکھتا ہے اسے ہزاروں لوگ پڑھتے اور اثر لیتے ہیں۔ اگر کوئی خبر غیر مصدقہ یا سنی سنائی ہے تو اس کے ساتھ لکھنا چاہیے کہ 'غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق' یا یہ ''افواہ سنی جارہی'' ہے۔ یا یہ ''افواہ گشت کررہی ہے۔''

تعصب اور جانبداری سے نامہ نگار کو پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر کوئی امر متنازعہ ہے تو اس کے دونوں رخ کو پیش کرنا چاہیے۔ تاکہ قارئین خود فیصلہ کریں۔ کسی خبر کا مکمل ہونا ضروری ہے۔ آدھی حقیقت پیش کر کے قارئین کو گمراہ نہیں کرنا چاہیے اور خبر میں اپنی رائے بھی شامل نہیں کرنی چاہیے۔

نامہ نگاری کی زبان سادہ، سلیس، رواں اور عام فہم ہو۔ قواعد کی رو سے زبان کی صحت ضروری ہے۔ اس میں املے کی غلطیاں نہ ہوں اور صرف ونحو کی پابندی کی جائے۔

## 6.8 خلاصہ

عصر حاضر میں پیغام رسانی یا خبر رسانی کے مختلف جدید طریقے وجود میں آ گئے ہیں۔ جو متنوع بھی ہیں اور پر اثر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ صحافت صرف خبر رسانی کا ذریعہ نہیں بلکہ اس سے رائے عامہ ہموار کرنے اور متاثر کرنے کی بھی کام لیا جا رہا ہے۔ اس کے توسط سے کسی مسئلے کی تفسیر و تفصیل بھی پیش کی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے معاشروں کی ترتیب، قیام امن، اقدار کا تحفظ اور عوامی حقوق کی حفاظت بھی کی جا رہی ہے۔

پیغام رسانی کے ان ہی جدید طریقوں میں ایک پریس کانفرنس بھی ہے۔ جب کسی ادارے کا سربراہ کسی پارٹی کا عہدے دار یا کوئی اہم شخصیت کوئی بات اطلاع یا خبر عوام تک پہنچانا چاہتی ہے تو اخبار یا خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندوں کو مدعو کرتی ہے۔ اور ان کے ذریعے اپنی بات عوام تک پہنچاتی ہے۔

پریس کانفرنس میں کسی تحریری بیان کی بہ نسبت گہرائی زیادہ ہوتی ہے۔ سوال و جواب کے ذریعے کسی معاملے کی پوشیدہ تہیں کھلتی ہیں۔ باالمشافہ گفتگو کی وجہ سے کسی بات پر زور دیا جا سکتا ہے۔ یا چہرے کے تاثرات سے حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نامہ نگاری ایک شوق بھی ہے اور باقاعدہ پیشہ بھی۔ اسے کتابوں سے حاصل تو کیا جا سکتا ہے مگر یہ نکھر تا عمل کے میدان میں ہی ہے۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے ادارے اور نیوز ایجنسیاں اپنے نمائندے مقرر کرتی ہیں۔ ان کا کام خبریں حاصل کر کے جلد سے جلد متعلقہ ادارے تک پہنچانا ہوتا ہے۔ ترسیل کی دنیا میں جو ترقی ہوئی ہے وہ انسانی توقعات سے بہت زیادہ ہے اس کے باوجود خبریں حاصل کرنے کا کام نامہ نگاروں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ نامہ نگار کی خدمات جتنی اہم ہیں۔ اس کی ذمہ داریاں بھی اتنی ہی زیادہ اس لیے اسے بیدار مغز، حق پرست، راست باز، علمی صلاحیت رکھنے والا، حالت حاضرہ سے پوری طرح واقفیت اور اخلاقی ضابطوں کا پابند ہونا چاہیے۔ تعصب اور جانب داری سے اسے پرہیز کرنا چاہیے۔

نامہ نگار کو زبان و بیان پر بھی قدرت ہونی چاہیے۔ اس کی تحریر میں جملے کی طوالت کم سے کم ہو۔ فعل، فاعل اور مفعول کے درمیان فاصلہ کم ہو۔ اسے گھسے پٹے، متروک الفاظ سے گریز کرنا چاہیے۔ غریب اور غیر مروج الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہے۔ اسے اسلوب بیان کے اصولوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ تب ہی وہ اپنے قارئین و سامعین کی توجہ مبذول کر سکے گا اور اپنی تحریر کو دل چسپ بنا سکے گا اور تب ہی اس کی شخصیت نکھرے گی اور لوگ اس پر اعتماد کریں گے۔

## 6.9 اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

1۔ بنیادی طور پر خبروں کی فراہمی کس کے ذریعے ہوتی ہے۔

a۔ سب ایڈیٹر کے ذریعے　　b۔ ایڈیٹر کے ذریعے

c۔ رپوٹر کے ذریعے　　d۔ سرخی جمانے والے کے ذریعے

2۔ پریس کانفرنس کے ذریعے اپنی بات عوام تک پہنچانے کا طریقہ کیسا ہے۔

a۔بے اثر طریقہ
b۔موثر حربہ ہے
c۔بہت فرسودہ طریقہ
d۔لاحاصل طریقہ

3۔پریس کانفرنس کے لیے کس کو مدعو کیا جاتا ہے۔
a۔اخبار کے ایڈیٹر کو
b۔عام ادیبوں کو
c۔اخبار کے نمائندوں کو
d۔کالم نگاروں کو

4۔نامہ نگاروں کو خبریں حاصل کرنے کے لیے جو علاقہ متعین کیا جاتا ہے اسے کیا کہتے ہیں۔
a۔حلقہ
b۔دائرہ عمل
c۔علاقہ
d۔بیٹ

5۔لابی نامہ نگار خبریں حاصل کرنے کے لیے کہاں تعینات کیے جاتے ہیں۔
a۔کورٹ میں
b۔گورنمنٹ کے دفاتر میں
c۔پارلیمنٹ کی لابی میں
d۔گورنر کے دفتر میں

6۔نامہ نگاری کے لیے کیسی زبان کی سفارش کی جاتی ہے۔
a۔جس میں طویل اور مبہم جملے ہوں
b۔جس میں متروک الفاظ سے گریز نہ کیا گیا ہو
c۔جس میں اسلوب بیان کے اصولوں کو فراموش نہ کیا گیا ہو
d۔جس میں غریب اور غیر مروج الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو

7۔جدید ذرائع ابلاغ کی پہنچ محدود ہے۔ صحیح/غلط

8۔پریس کانفرنس اس وقت بلائی جاتی ہے جب آپ کسی خاص موقع پر کچھ خاص باتیں عوام تک پہنچانا چاہیں۔ صحیح/غلط

9۔کانفرنس کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے جو شہر سے دور ہو اور پریس نمائندوں کو لمبا سفر کرنا پڑے صحیح/غلط

10۔رپوٹرس کے ممکنہ سوالات پر پہلے سے غور کرلیں صحیح/غلط

11۔پریس کانفرنس میں کسی رائے کو حقیقت کے طور پر پیش کر سکتے ہیں صحیح/غلط

12۔پریس کانفرنس میں ایسے اعداد و شمار نہ دیں جو شواہد سے میل نہ کھاتے ہوں۔ صحیح/غلط

13۔آج کے دور میں رپوٹرس کے بغیر بھی خبریں حاصل کرلینا ممکن ہے۔ صحیح/غلط

14۔نامہ نگاری کے لیے کسی بھی شخص کا صحافت کی طرف شدید میلان ضروری نہیں۔ صحیح/غلط

## اپنی معلومات کی جانچ نمونہ جوابات

1۔(a) رپوٹر کے ذریعے

2۔(b)۔موثر حربہ ہے۔

3۔(c)۔اخبار کے نمائندوں کو۔

4۔(d) بیٹ کہتے ہیں۔

5۔(c) پارلیمنٹ کی لابی میں۔

6۔(c) جس میں اسلوب بیان کے اصولوں کو فراموش نہ کیا گیا ہو۔

7۔غلط

8۔صحیح

9۔غلط

10۔صحیح

11۔غلط

12۔صحیح

13۔غلط

14۔غلط

## 6.10 نمونہ امتحانی سوالات

I۔مندرجہ ذیل ہر سوال کا جواب (30) تیس سطروں میں دیں۔

1۔ پریس کانفرنس کی تعریف کرتے ہوئے اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالیے۔

2۔ رپوٹرس کو بنیادی طور پر کتنے زمروں میں بانٹا جاتا ہے اور ان کا دائرہ کار کیا ہے۔

II۔مندرجہ ذیل سوال کا جواب (15) پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1۔ پریس کانفرنس کب بلائی جاتی ہے اس کے لیے پہلے سے کیا تیاری کرنی چاہیے۔

2۔ رپوٹنگ کے بنیادی اصول کیا ہیں۔واضح کیجیے۔

## 6.11 سفارس کردہ کتابیں

1۔ رہبر اخبار نویسی، سید اقبال قادر، NCPUL، نئی دہلی، 1989

2۔خبر نویسی اور ابتدائی ادارت، امداد احمد میاں، مقتدرہ زبان، اسلام آباد، 1991
3۔ابلاغیات، محمد شاہد حسین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2003
4۔خبر نگاری، احمد نسیم سندیلوی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1992

# اکائی۔2 : پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا

## ساخت


2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 پرنٹ میڈیا کی تعریف

2.4 پرنٹ میڈیا کی تاریخ

2.5 الیکٹرانک میڈیا کا تعارف

2.6 الیکٹرانک میڈیا کی اقسام

2.7 الیکٹرانک میڈیا میں پیغام رسانی کا طریقہ کار

2.8 خلاصہ

2.9 اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

2.10 نمونہ امتحانی سوالات

2.11 سفارش کردہ کتابیں


## 2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی تعریف وتاریخ تفصیل سے دی گئی ہے۔ دونوں کے مابین بنیادی فرق کی وضاحت کی گئی ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ اس لائق ہوجائیں گے کہ دونوں کے بنیادی فرق کی وضاحت کرسکیں۔ اور دونوں کے طریقہ کار اور اہمیت وافادیت پر روشنی ڈال سکیں۔ دونوں کی اہم اصناف سے بھی واقفیت ہوجائے گی اور آپ یہ بھی جان لیں گے کہ دونوں کی اہم اصناف کو میڈیا کے ذریعے پیش کرنے کے لیے کس طرح لکھا جائے۔

## 2.2 تمہید

عوامی ذرائع ترسیل کو بنیادی طور پر دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا۔ پرنٹ میڈیا سے مراد مطبوعہ مواد ہے۔ مطبوعہ مواد میں پڑھ کر کسی خیال یا پیغام کو سمجھا جاتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا میں سن کر اور دیکھ کر کسی پیغام کو حاصل کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر الیکٹرانک میڈیا کی دو شاخیں ہیں۔ ایک آواز پر منحصر ہے جیسے ریڈیو اس میں سن کر

کسی پیغام کو سمجھا جاتا ہے۔ دوسرا ذریعہ آواز اور تصویر دونوں پر منحصر ہے جیسے فلم اور ٹیلی ویژن۔ اس میں دیکھ اور سن کر کسی پیغام کو حاصل کیا جاتا ہے۔

اس میں قوت سامعہ اور قوت باصرہ دونوں بیک وقوت دماغ کو متاثر کرتی ہیں اس لیے یہ موثر ترین ذریعہ ابلاغ ہے۔

ذریعہ ترسیل کے تدریجی ارتقا میں سب سے پہلے زبان وجود میں آئی پھر تحریر اور پھر چھاپہ خانہ اس لیے پرنٹ میڈیا یعنی صحافت کی ابتدا ارتقا پہلے ہوا۔ مگر مطبوعہ مواد کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھیجنے میں صرفہ زیادہ ہوتا تھا اور وقت میں زیادہ لگتا تھا لہذا سائنسدانوں نے بے وزن چیز آواز کے ذریعے پیغام رسانی کا طریقہ ایجاد کیا۔ یہیں سے الیکٹرانک میڈیا کی ابتدا ہوئی۔

## 2.3 پرنٹ میڈیا کی تعریف

اس اکائی کا عنوان ''پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا'' ہے۔ یعنی ایسا مطبوعہ ذریعہ یا ایسا برقی ذریعہ جو پیغام رسانی کے کام آئے۔ لیکن یہاں میڈیا سے مراد ماس میڈیا ہے۔ ماس میڈیا میں ان ہی چیزوں کا شمار ہوتا ہے جو فنی اور تکنیکی طور پر پیغام کو عوام کے بڑے گروہ تک بیک وقت پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

بہ نظر غائر دیکھا جائے تو آج زندگی پوری طرح عوامی ذرائع ابلاغ پر منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ دراصل ترسیل کا نیا طریقہ کسی خیال، معلومات یا تجربے کو ترسیل کرنے کا نیا طریقہ ہی نہیں ہوتا بلکہ زندگی گذارنے کا نیا طریقہ بھی ہوتا ہے۔

پرنٹ (ماس) میڈیا میں اخبار۔ رسائل، پوسٹر، ہینڈ بل وغیرہ آجاتے ہیں۔ پرنٹ میڈیا سے ایسا مطبوعہ مواد مراد ہے۔ جو مقررہ وقفے وقفے سے شائع ہو اور جس کے ذریعے عوامی معلومات، رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ انجام دیا جاتا ہو۔

## 2.4 پرنٹ میڈیا کی تاریخ

عوامی ذرائع ترسیل کے فروغ میں زبان کی ابتداء، ایک بہت اہم قدم تھا جس نے ترسیل میں بے انتہا آسانیاں پیدا کر دیں۔ بولے جانے والے الفاظ وجود میں آگئے تو یہ انسان کی ایجاد کردہ چیزوں میں سب سے اہم اور قیمتی ثابت ہوئے۔ زبان کے ہی استعمال سے انسان کی اجتماعی زندگی میں نظم وضبط کی مہذب اور مفید صورتیں پیدا ہوئیں۔ اور اسے اجتماعی زندگی کے فوائد حاصل ہوئے۔ جو روئے زمین پر دوسرے جانداروں کو حاصل نہ تھے یعنی وہ حیوان سے حیوان ناطق بن گیا۔

زبان خیالات کے اظہار کا اولین ذریعہ تو ہے لیکن ناقص کیوں کہ یہ بہت دور نہیں جا سکتی یہ قائم رہنے والی بھی نہیں۔ تاریکی یا درمیان میں کسی چیز کے حائل ہو جانے کی صورت میں اشاراتی گفتگو بھی ناممکن ہو جاتی ہے۔

چنانچہ زمانہ قدیم میں ہی انسان نے ضروری باتوں کو محفوظ رکھنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت کے تحت تحریر کی ایجاد کی۔ تحریر نے انسان کے منہ سے نکلی ہوئی آواز کو فضا میں گم ہونے سے بچا لیا۔ تحریر نے زبان کو ایک ایسا منقش علامتی جسم دیا جسے پا کر وہ جاوداں اور متحرک ہو گئی۔ مشہور اطالوی عالم ڈاکٹر ڈرنگر نے اسے تہذیب انسانی کی کلید سے تعبیر کیا ہے۔

کاغذ کی ایجاد سے قبل ہڈی، کچھوئے کے کھپروں، بانس کے پچروں اور تاڑ کے پتوں پر لکھائی کا عام رواج تھا مگر ان چیزوں پر لکھنا مشکل ہوتا تھا۔ پھر گندھی ہوئی نرم مٹی پر لکھائی کی جانے لگی ابتداء میں مٹی کی تختیوں کا حجم بارہ انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا ہوتا تھا۔ لکھائی کے بعد انھیں دھوپ میں سکھا کر بھٹی میں پکا لیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پتھر کی سلوں اور لکڑی یا دھات کی پلیٹوں پر بھی لکھا جاتا۔

پھر بھوج پتر، چمڑے اور پیپرس کا دور آیا۔ چین کی تہذیب تحریر کے سلسلے میں بھی دنیا میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ابتدا میں وہاں بھی مختلف چیزوں پر لکھائی ہوتی تھی۔ لکڑی کی تختیوں پر لکھائی کا وہاں بہت طویل دور چلتا رہا۔ اس کے بعد ریشم پر لکھنے کا رواج بڑھا۔

چین میں ریشم پر لکھی کتابوں کو ایک زمانے میں اتنی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی کہ ان کے علم و ادب اور تمام ذہنی تخلیق کا ریشم کے ساتھ ایک گہرا فکری تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ چین کی ریشمی کتابوں کی تمام دنیا میں بڑی وقعت و شہرت تھی۔

دوسری اور تیسری صدی عیسوی سے چین میں چوبی ٹھپوں سے نقش جما کر لکھائی کی جانے لگی تھی۔ ریشم کے بعد وہاں کاغذ پر کتابیں لکھی گئیں۔

فن تحریر سے ترسیل کو جو ترقی ملی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر کاغذ کی ایجاد سے قبل اس کا دائرہ بہر حال بہت محدود تھا۔ کاغذ کی ایجاد کا سہرا چین کے سر ہے ایک اندازے کے مطابق چین نے 104ء میں کاغذ ایجاد کر لیا تھا۔ مگر اس نے سات سو سال تک اس ایجاد کو دنیا کی نظروں سے چھپائے رکھا۔ پھر بھی عرب ترکستانی علاقے میں چینیوں سے یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور آٹھویں صدی عیسوی میں سمرقند میں پہلا کاغذ کا کارخانہ قائم ہوا۔

کاغذ کی ایجاد کے بعد کسی تحریر کو محفوظ کرنے میں کافی آسانی پیدا ہو گئی۔ پھر بھی ہاتھ سے تحریریں محدود پیمانے پر ہی لکھی جا سکتی تھیں اور ان کی زیادہ کاپیاں تیار کرنا کافی دقت طلب تھا۔ لہذا چھاپے خانے کی ایجاد نے کاغذ کی ایجاد کو ایک وسیع پس منظر عطا کیا۔

کاغذ کی ایجاد کی طرح چھپائی کا سہرا بھی کسی حد تک چین کے ہی سر ہے۔ چین میں لکڑی کے ٹھپوں کے ذریعے چھپائی دوسری یا تیسری صدی عیسویں میں شروع ہو گئی تھی۔ اور اس بات کے بھی ثبوت موجود ہیں کہ گیارہویں صدی عیسوی

میں چین کے پی شنگ (P. Sheng) نامی شخص نے ٹائپ کے حروف مٹی کے سانچوں میں ڈھال کر تیار کیے۔ ان حروف کو کمپوزنگ کے انداز میں لکڑی کے تختے پر جمایا جاتا ان پر روشنائی لگا کر کاغذ رکھ کر اوپر سے دباؤ ڈالا جاتا اور اس طرح چھپائی عمل میں آئی۔ بعد کو یہی طریقہ پرنٹنگ پریس کی بنیاد بنا۔

ہالینڈ اور جرمنی میں 1430ء کے بعد کی کچھ کتابیں ٹھپوں کے ذریعے چھپی ہوئی ملتی ہیں چھپائی کا یہ طریقہ زیلو گرافی کہلاتا ہے۔ دراصل یہی زمانہ ہے جب یورپ میں علوم وفنون کا احیا ہو رہا تھا۔ عوام کی توجہ لکھنے پڑھنے کی طرف تھی۔ انھیں لکھائی پڑھائی کے سامان کی زیادہ ضرورت تھی۔ لہذا 1324ء سے 1448ء کے درمیانی بہت سے لوگ ٹائپ کے حروف وضع کرنے میں کوشاں تھے مگر سب سے پہلے یہ ایجاد جس شخص کے نام رجسٹر ہوئی وہ تھا جان گٹن برگ یہ جرمنی کا رہنے والا تھا۔ مختصر یہ کہ اس فن یا صنعت نے سب سے پہلے جرمنی میں ترقی کی اور وہیں سے بقیہ یورپ میں پھیلا۔

چھپائی کے سلسلے میں ایک ترقی اس وقت عمل میں آئی جب آلوئیس سینی فیلڈر نے 1800ء میں پتھروں کی سلوں کے ذریعے چھپائی کا طریقہ ایجاد کیا جسے لیتھوگرافی کا نام دیا گیا۔ سترہویں صدی کے ربع اول میں Estinnes Printing یا پلیٹ کے ذریعے چھپائی کی ایجاد بھی چھپائی کے ارتقا کا ایک اہم قدم تھا۔

1811ء میں اسٹیم انجن کی ایجاد ہوئی تو اسے بھی چھپائی کی مشین میں استعمال کیا گیا۔ اور ایک ہزار اوراق فی گھنٹہ کی رفتار سے چھپائی ہونے لگی۔ بھاپ کے انجن کے بعد بجلی سے چلنے والا انجن ایجاد ہوا تو اس کا استعمال پریس کے لیے زیادہ کیا گیا، اور اس سے رفتار میں بھی اضافہ ہوا۔

بیسویں صدی میں فوٹو آفسیٹ کی چھپائی نے ٹائپ کی چھپائی کو شرمندہ کر دیا۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے تقریباً چھ سو سال کا لمبا سفر طے کرنا پڑا۔ اب بہت کم وقت میں کسی تحریر کی بہت زیادہ کاپیاں تیار کی جا سکتی ہیں۔ جس سے آسانی یہ ہوئی کہ عوام کے لیے جانکاری، اطلاع، اور تفریحی مواد دور دراز قصبوں اور دیہی علاقوں میں بھی بروقت پہنچنے لگا۔ خصوصاً اخبارات نے اس سلسلے میں بہت اہم رول ادا کیا۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترسیل اور عوامی ذرائع ترسیل کا فطری ارتقا کچھ اس طرح سے ہوا کہ پہلے پرنٹ میڈیا کو ہی فروغ حاصل ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ معاشرے میں وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ اسے آج مملکت کا چوتھا ستون گردانا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے جرنلزم اور اردو میں صحافت کہتے ہیں۔ معاشرے میں اسے یہ مقام اس لیے حاصل ہوا ہے کہ یہ ہمیں اطلاعات ہی فراہم نہیں کراتی بلکہ کسی مسئلے کی تفصیل وتفسیر بھی پیش کرتی ہے۔ اس سے رائے عامہ ہموار کرنے یا متاثر کرنے کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہ مستقبل کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے راستے بھی ہموار کرتی ہے۔ یہ ہمیں باخبر کر کے نئی فکر نئے شعور سے ہم آہنگ ہی نہیں کراتی، نئے مسائل کے روبرو ہی نہیں لاتی بلکہ تجربات میں وسعت پیدا کر کے نئے نئے چیلنجز قبول کرنے کے لائق بھی بناتی ہے۔ اس کے ذریعے معاشروں کی تربیت، انتظام وانصرام، قیام امن، اقدار کا تحفظ اور عوامی حقوق کی حفاظت کی جا رہی ہے۔

اس وقت پرنٹ میڈیا خصوصا اخبارات کا مقابلہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ہے۔ ریڈیو کی ابتدا ہوئی تو لوگوں نے

سمجھا کہ اب اخبارات کے دن گئے۔ اخبار دن میں زیادہ سے زیادہ تین بار چھپ جائے گا۔ لیکن ریڈیو سے تو ہر گھنٹے خبریں نشر کی جاسکیں گی اور اگر کوئی اہم خبر آ گئی تو دوسرے پروگراموں کے درمیان ہی اسے نشر کیا جاسکتا ہے۔ پھر خبروں پر تبصرے، خبروں کا پس منظر حالات حاضرہ کی جھلکیاں اہم واقعات کا آنکھوں دیکھا حال اور یہ سب آواز کے سحر اور موسیقی کے جادو سے مزین۔ مزید یہ کہ ان سب سے مستفیض ہونے کے لیے خواندگی کی شرط ختم۔ اب اخبار لوگ خریدیں تو کیوں۔

لیکن تحریر کا اپنا مقام ہے، اس کے اندر ایک پائیداری ہے۔ یہ بولے ہوئے الفاظ کی طرح ہوا میں گم نہیں ہوجاتی۔ اپنے بس میں ہوتی ہے جب جی چاہے پڑھیئے جتنی بار جی چاہے پڑھیئے۔ اسے حوالے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کرسکتی ہیں۔ مزید یہ کہ اخبارات خبروں کو جس صراحت، کاملیت اور پس منظر کی گہرائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ برقی ترسیل کے ایک بولیٹن میں جتنی خبریں ہوتی ہیں، اخبار انھیں بڑی آسانی سے اپنے چار پانچ کالم میں پیش کردیتا ہے۔ پھر یہ کہ اخبار کا غیر خبری حصہ اتنا رنگا رنگ اور مختلف النوع ہوتا ہے کہ اس کا نعم البدل ریڈیو اور ٹیلی ویژن مشکل ہی سے پیش کرسکیں گے۔ مزید یہ کہ اخبارات کے ذریعے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

اسی لیے ماہرین کا دعوی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود پرنٹ میڈیا کی اہمیت نہ کم ہوئی ہے نہ ہوگی۔ کچھ لوگوں کا تو یہ دعوی بھی ہے کہ فی زمانہ اخبارات کا اشتیاق بڑھا ہے اور ان کی اشاعت میں اضافہ ہوا ہے۔

## 2.5 الیکٹرانک میڈیا کا تعارف

الیکٹرانک میڈیا سے مراد ایسا ذریعہ ترسیل ہے جس میں برقی وسائل اور مشینوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کی تیز رفتاری ہے۔ دراصل پرنٹ میڈیا میں یہ کمی تھی کہ اس سے صرف خواند طبقہ ہی استفادہ کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ مطبوعہ مواد کو ایک جگہ سے دوسرے جگہ پہنچانے میں خرچ بھی زیادہ آتا تھا اور وقت بھی زیادہ لگتا تھا۔ مزید یہ کہ تحریر میں تقریر کا تاثر، لہجے کا زیر و بم اور جذبات کا ظہور کہیں گم ہوگیا تھا۔ چنانچہ سائنسدانوں نے بے وزن، آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائی جانے والی تیز رفتار، جذبات کی شدت سے لیس آواز کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کی طرف توجہ دی اور اس کی ابتدا ہوئی ٹیلیگراف سے۔ ٹیلی گراف کے بعد وائرلس کی ایجاد ہوئی۔ جو برقی ترسیل کی سب سے اہم ایجاد تھی۔ آگے کی تمام تر ترقی اسی کے مرہون منت ہے۔ پھر ریڈیو کی ایجاد سے پہلے سنیما کی ایجاد ہوئی۔ بنیادی طور پر ریڈیو آواز کا اور سنیما تصویر کا میڈیم ہے۔ دونوں کی ترسیل کا طریقہ کار بھی مختلف تھا۔ پھر بھی ان دونوں کے امتزاج سے ٹیلی ویژن وجود میں آیا۔ لیکن موجودہ صورت حال میں ان ذرائع کی وسعت متقاضی ہے کہ ان کا الگ الگ جائزہ لیا جائے۔

## 2.6 الیکٹرانک میڈیا کی اقسام

انیسویں صدی کا ابتدائی دور تبدیلیوں کا دور تھا۔ عالمی صنعتی انقلاب میں امریکہ ایک نئی صنعتی طاقت بن کر ابھر رہا تھا۔ برطانیہ بھی اپنے بڑے بحری فوجی وتجارتی بیڑوں کے ساتھ مرعوب کرنے والا ملک تھا اور جیسے جیسے صنعتی ترقی ہو رہی تھی اور تبدیلیاں آ رہی تھیں زیادہ تیز ترسیلی نظام کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی لہذا بہت سے سائنسداں ایسی چیزوں کی کھوج میں مصروف تھے جن کے ذریعے تیز رفتاری کے ساتھ پیغام بھیجا جا سکے۔ Samuel F.B. Morse ان ہی میں سے ایک تھا جو اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش میں سرگرداں تھے۔ 36-1835ء میں وہ تار کی لائن کے ذریعے آواز کو برقی قوت کی مدد سے ایک سرے سے دوسرے تک بھیجنے میں کامیاب ہوا۔ شروع میں اسے ''رائٹنگ ایٹ ڈسٹنس'' کہا گیا بعد میں اس کا نام ٹیلی گراف پڑا۔

کافی سالوں تک مورس کا ایجاد کردہ ٹیلی گراف تیز رفتار ترسیل کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ 1866ء میں پہلی بار سائیرس فیلڈ کی نگرانی میں بحر اٹلانٹک کے آر پار کیبل ڈالا گیا اور امریکہ و یورپ کے درمیان ٹیلی گراف کے ذریعے پیغام کا تبادلہ ہوا۔ یہیں سے تیز رفتار عالمی ذریعہ ترسیل کی ابتدا ہوئی۔

ٹیلی گراف کے ذریعے صرف آوازی اشارے ترسیل ہوتے تھے۔ اب اسی طرز پر لاسلکی ذرائع سے آواز کو ہو بہو ترسیل کرنے کی کوشش ہوئی۔ جس میں سب سے پہلے کامیابی گراہم بل کو ملی اور اس کی اس ایجاد کو ٹیلی فون کا نام دیا گیا۔ بعد کو ٹیلی گراف اور ٹیلی فون دونوں سے وائرلیس اور ریڈیو کی ایجاد میں بہت مدد ملی۔

وائرلیس کی کارگردگی کا اشارہ اس کے نام کی ترکیب میں پوشیدہ ہے۔ ابھی تک جو چیزیں برقی ترسیل کے لیے استعمال ہو رہی تھیں۔ ان میں وائر یعنی تار کا استعمال ہو رہا تھا۔ لیکن اب ایسا طریقہ ایجاد ہوا جس میں وائر یعنی تار کا استعمال لیس یعنی ختم ہو گیا اور پیغام ہوا کے ذریعے بھیجا جانے لگا۔ دراصل وائرلیس میں فضا میں موجود برقی رو اور مقناطیسیت کے ذریعے آواز کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھیجا جاتا ہے۔

وائرلیس کی ایجاد ایک ایسی اہم اور بنیادی ایجاد تھی جس کی وجہ سے ترسیل زمین کی پستیوں سے اٹھ کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی بلکہ اسی کی وجہ سے ریڈیو، ٹرانسسٹر، ٹیلی ویژن اور سیٹیلائٹ ترسیل ممکن ہو سکی اور پوری دنیا میں صنعتی تجارتی ترقی انتہائی بلندیوں تک پہنچ گئی۔ اسی کی وجہ سے فاصلے سمٹ گئے۔ وقت پر قابو پا لیا گیا۔ لیکن ابھی تک عموماً وائرلیس کے ذریعے پیغام کوڈ (Code) میں بھیجے جاتے تھے اب اگلی کوشش آواز کو ہو بہو ترسیل کرنے کی تھی۔ جس طرح تار کی لائن کے ذریعے ٹیلی فون سے بھیجی جا رہی تھی۔ اس میں کامیابی مارکونی کو حاصل ہوئی اور ریڈیو وجود میں آیا۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ ریڈیو کا پہلا پروگرام کب اور کہاں نشر کیا گیا۔ البتہ مجموعی طور پر اس میں برتری امریکہ کو حاصل ہے۔ 1926ء میں فسینڈن (Fessenden) نے برنٹ راک ماس کے اپنے نجی تجرباتی اسٹیشن سے

کرسمس کی شام کو ایک پروگرام نشر کیا جسے بعض لوگ ریڈیو کا پہلا پروگرام کہتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے تجربات ہو رہے تھے۔ مگر باقاعدہ کسی لائیسنس یافتہ ریڈیو اسٹیشن سے پروگرام 2 رنومبر 1920 کو KDKA نشر ہوا۔

برقی ترسیل کا ارتقاء امریکہ اور برطانیہ میں قریب قریب ساتھ ساتھ ہوا۔ مارکونی کی حوصلہ افزائی سب سے پہلے برطانیہ نے ہی کی برطانیہ کی بحری فوج کے بیڑے ہوں یا تجارتی جہاز۔ ڈاک و تار کا محکمہ ہو یا کوئی اور ادارہ ہر جگہ برقی ترسیل کو خوش آمدید کہا گیا۔

ہندوستان میں ریڈیو کی ابتدا ریڈیو کلب آف بنگال اور بمبئی ریڈیو کلب کے ذریعے 1923ء اور 1924ء میں ہوئی۔ یہ دونوں پرائیویٹ کمپنیوں نے کچھ دنوں تک گھاٹہ اٹھانے کے بعد پروگرام بند کر دیے۔

پھر حکومت نے ریڈیو نشریات کو اپنے ذمے لیکر اسے انڈین براڈ کاسٹنگ سروس نام دے کر ایک اپریل 1930ء سے اسے محکمہ صنعت و حرفت کے حوالے کر دیا مگر اس کا کام اچھے ڈھنگ سے نہیں ہو رہا تھا۔ 1934ء کے آغاز میں دہلی ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی منظوری ملی۔ لہذا دہلی میں ایک 20KW ٹرانسمیٹر نصب کیا گیا۔ جس سے 1 رجنوری 1936ء کو پہلا پروگرام 18 علی پور روڈ سے نشر ہوا۔ اسی سال انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کا نام بدل کر آل انڈیا ریڈیو رکھا گیا۔ اور اس طرح ہندوستان میں نشریات کا ایک الگ محکمہ قائم ہوا۔ 1947ء میں بل لباٹریز میں کام کرنے والے ڈاکٹر ولیم شاکلے (Dr. William Shockley) نے ٹرانسسٹر ایجاد کیا۔ ٹرانسسٹر نے ریڈیو کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ پہلے ریڈیو سیٹ بڑے ہوتے تھے۔ انھیں چلانے کے لیے بجلی یا بڑی بیٹری کی ضرورت ہوتی تھی۔ جو بھاری ہوتی تھی۔ چنانچہ ریڈیو سیٹ ایک جگہ ہی رکھے ہوتے تھے۔

ٹرانسسٹر چھوٹے اور ہلکے بنائے جانے لگے۔ اور انھیں چلانے کے لیے ٹارچ کے دو سیل استعمال ہوتے۔ اب نہ صرف اس کا رکھ رکھاؤ آسان ہو گیا بلکہ اسے کہیں بھی ساتھ لے جایا جا سکتا تھا۔ اب آپ کھیت کھلیان میں کام کر رہے ہوں۔ گاؤں کی چوپال میں ہوں، پکنک میں کسی پارک یا بیچ پر ہوں کسی سواری سے سفر کر رہے ہوں اس کے ذریعے مختلف اسٹیشنوں کے پروگرام آپ کی دسترس میں ہوتے ہیں۔

ریڈیو کے ساتھ ساتھ ہی تصویر کو متحرک کرنے میں بھی کامیابی مل گئی تھی۔ اور خاموش متحرک فلمیں پردہ سیمیں پر پیش کی جا رہی تھیں۔ پھر جلد ہی سائنسدانوں نے تصویر کی حرکت کے ساتھ آواز کو ہم آہنگ کرنے کا طریقہ بھی ڈھونڈھ لیا۔ لیکن انھیں صرف پروجیکٹ کیا جا سکتا تھا ٹیلی کاسٹ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ٹیلی ویژن نے اس محدودیت کو توڑا۔ ٹیلی ویژن بظاہر فلم سے مشابہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی پیش کش یعنی ٹیلی کاسٹ کرنے کا زیادہ انحصار ریڈیو تکنیک پر ہے۔ ریڈیو میں آواز کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کا عمل مختصر ہوتا ہے۔ فضا میں موجود ''برقی رو'' پر۔ فضا میں سفر کرنے والی برقی رو۔ ''برقناطیسی'' موجوں کی صورت میں چلتی ہیں۔ ان موجوں کا استعمال گاڑی کے طور پر ہوتا ہے۔ ان پر آواز یا تصویر کی برقی رو کو سوار کیا جاتا ہے۔ اپنے سفر کے دوران جب یہ

کسی محصل کے ہوائیے (Arid) سے ٹکراتی ہیں تو دوبارہ برقی رو میں بدل جاتی ہیں محصل آواز کو الگ کر کے اسپیکر پر سنا دیتا ہے یا تصویر ٹیلی ویژن اسکرین پر پیش کر دیتا ہے۔ لہذا ٹیلی ویژن میں تصویر کو متحرک کرنے کا عمل سنیما سے لیا گیا۔ مگر اس سے نشر کرنے کا عمل ریڈیو سے لیا گیا چنانچہ یہ سنیما اور ریڈیو کا امتزاج ہے۔

ٹیلی ویژن کی ترقی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ جب اس میں مصنوعی سیاروں یعنی سیٹیلائٹ کا استعمال کیا جانے لگا۔ یعنی سیٹیلائٹ کے ذریعے ٹیلی ویژن پروگرام ان علاقوں تک پہنچائے جانے لگے جہاں زمینی اسٹیشنوں کے ذریعے پہنچانا مشکل تھا۔

## 2.7 الیکٹرانک میڈیا میں پیغام رسانی کا طریقہ کار

ریڈیو بنیادی طور پر آواز کا میڈیم ہے۔ اس میں ہر چیز کی تصویر سامع کے دماغ میں تخلیق کی جاتی ہے۔ کسی کردار کی شبیہ ہو کوئی صورت حال ہو، یا منظر و پس منظر سب کی تصویر انسانی آواز و دیگر صوتی اثرات کے ذریعے مرتب کی جاتی ہے۔ اس میں سامع کے تخیل کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے الفاظ کا انتخاب فن کارانہ طریقے سے کیا جاتا ہے۔ جو سامع کے تخیل کو متحرک کر دیں۔ پھر وہ اپنی چشم تصور سے ان تمام واقعات اور منظر و پس منظر کو بالکل اسی طرح دیکھتا چلا جائے گا جس طرح اسٹیج یا پردے پر دیکھتا ہے۔

چونکہ اسٹیج، فلم اور ٹیلی ویژن میں چیزیں دکھائی دیتی ہیں اس لیے ان میں تخیل سے زیادہ کام نہیں لینا پڑتا۔ لیکن ریڈیو میں چیزیں دکھائی نہیں دیتی ہیں اس لیے اس میں تخیل سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے، اور ہر چیز بیان کرنی پڑتی ہے۔ جو چیز بیان نہیں کی جا سکتی اسے خصوصی صوتی اثرات کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔

فلم اور ٹیلی ویژن دونوں آواز اور متحرک تصویر کا میڈیم ہیں۔ اس لئے ان میں بولے جانے والے الفاظ کم ہوتے ہیں۔ اسی لیے فلم اور ٹیلی ویژن پہلے بصری آرٹ ہیں پھر سمعی، ان میں کیا کہا سے زیادہ کیا کیا اہم ہوتا ہے۔ چونکہ ٹیلی ویژن و فلم میں تمام چیزیں متحرک تصویروں کے ذریعے پیش کی جاتی ہیں اس لیے اسکرپٹ نگار پہلے اپنے منصوبے کو اپنے دماغ میں متحرک تصویروں کے ذریعے ترتیب دیتا ہے۔ پھر ان کو کاغذ پر ایک خاص ہیئت (فارمیٹ) کے تحت لکھتا جاتا ہے۔ مگر اسکرپٹ تیار ہو جانے سے بات پوری نہیں ہو جاتی جیسا کہ تحریری ذرائع میں ہوتا ہے۔ دراصل اسکرپٹ نگار کا کام بچولیے کا ہے۔، جو اسکرپٹ کے ذریعے کوئی تجویز یا منصوبہ ڈائریکٹر کو ترسیل کرتا ہے۔ یہاں سے ڈائریکٹر کا کام شروع ہوتا ہے۔ وہ اسکرپٹ کو پوری تفصیل کے ساتھ ٹیپ پر ریکارڈ کرتا ہے وہ اسکرپٹ نگار کی خیالی متحرک تصویروں کو حقیقی زندگی سے پُر تصویروں میں تبدیل کرتا ہے۔ اس عمل میں سب سے اہم اور مثبت رول کیمرے کا ہوتا ہے۔ کیمرے کے بغیر فلم اور ٹیلی ویژن کے پروگرام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ڈائریکٹر جو کچھ بھی دیکھتا ہے کیمرے کی آنکھ سے دیکھتا ہے جو کچھ بھی کرتا ہے کیمرے کے ذریعے کرتا ہے۔

جب کسی منصوبے یا تجویز کو بصری ہیئت میں پیش کیا جاتا ہے تو لکھنے والا کہنے پر کم توجہ دیتا ہے یہ نسبت دکھانے کے، گوکہ یہاں بھی الفاظ کی اہمیت برقرار رہتی ہے۔ لیکن یہاں یہ اہمیت فنی کے بجائے تکنیکی ہوتی ہے۔ یہاں الفاظ ڈائریکٹر کے لیے ترسیل کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مگر یہ ناظرین کی قوت متخیلہ کو متحرک کرنے کے کام نہیں آتے۔ لہذا بصری ہیئت میں الفاظ صرف متحرک تصویروں کی وضاحت کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہاں پیغام کی ترسیل آواز اور تصویر سے ہوتی ہے۔ مگر پڑھنے والے کو نہیں بلکہ دیکھنے والے کو۔ یہاں اسکرپٹ لکھنے والے کے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہوتا کہ وہ کاغذ پر کون سے الفاظ تحریر کرے بلکہ اس کے سامنے یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ پردے پر کون سی تصویر تخلیق کرے۔

## 2.8 خلاصہ

پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کی اپنی اپنی خصوصیات اور اپنی اپنی اہمیت ہے اور کوئی کسی سے کم نہیں۔ مطبوعہ مواد میں پڑھ کر کسی خیال یا پیغام کو سمجھا جاتا ہے۔ تحریر شدہ یا مطبوعہ مواد ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھیجنے میں صرفہ بھی زیادہ آتا ہے اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ مگر اس میں ایک پائیداری ہوتی ہے۔ بولے ہوئے الفاظ کی طرح یہ ہوا میں گم نہیں ہو جاتے آپ کے بس میں ہوتی ہے جب جی چاہے پڑھیئے جتنی بار جی چاہے پڑھیئے۔ اس پر اطمینان سے غور و خوض کر سکتے ہیں۔ اسے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر سکتے ہیں۔ حوالے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ اس میں کسی بات کو گھما پھرا کر لکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ وہاں پورا مواد نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ لہذا اس میں کسی چیز کو سمجھنے کے لیے دوبارہ دیکھا اور غور کیا جا سکتا ہے۔

ریڈیائی تحریر گفتگو یا بولے جانے والے الفاظ کا ذخیرہ ہوتی ہے تو اس میں ان ہی الفاظ کو استعمال کرنا چاہیے جو روز مرہ کی فطری گفتگو کا جز ہیں۔ نہ کہ کتابی زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ کا۔ اگر یہ بات سمجھ لی جائے کہ سامعین کو اسلوب نگارش کے ذریعے متاثر کرنا اہم نہیں ہوتا بلکہ اطلاعات، معلومات یا تجربات کا ابلاغ اہم ہے تو مقصد آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔ ریڈیو کا یہ سنہرا اصول ہے کہ اس کی تحریر کا پہلا جملہ دل چسپ ہو۔ دوسرا جملہ مطلع کرے پھر اپنے نکتوں کو موضوع کے دھاگے میں تسبیح کے دانوں کی طرح پروتے جائیں۔

الیکٹرانک میڈیا خواہ ریڈیو ہو فلم ہو یا ٹیلی ویژن آپ کو اس کے وقت کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اس میں کسی بات کو فورا سمجھیں یا کبھی نہ سمجھیں۔ اس میں کوئی بات نشر ہوتی ہے تو سامعین و ناظرین کے بہت بڑے حلقے تک چشم زدن میں پہنچ جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے وقت پر قابو پا لیا گیا ہے اور فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے۔ اس کی وجہ سے عوامی ذرائع ترسیل کو جو ترقی ملی وہ ناقابل یقین ہے۔

## 2.9 اپنی معلومات کی جانچ۔نمونہ جوابات

1۔مندرجہ ذیل میں سے کون سی چیز پرنٹ میڈیا میں آتی ہے۔

a۔اخبار　　b۔ناول

c۔خطوط　　d۔ڈائری

2۔پرنٹ میڈیا میں کسی پیغام کو کس طرح سمجھا جاتا ہے۔

a۔سن کر　　b۔دیکھ کر

c۔پڑھ کر　　d۔اندازہ لگا کر

3۔ریڈیو کس چیز کا میڈیم ہے۔

a۔تصویر کا　　b۔تحریر کا

c۔آواز کا　　d۔ان میں سے کسی کا نہیں

4۔چین نے بنیادی طور پر کاغذ کس سنہ میں ایجاد کر لیا تھا۔

a۔206ء　　b۔104ء

c۔713ء　　d۔810ء

5۔آواز کی ہو بہو ترسیل سب سے پہلے کس چیز کے ذریعے ممکن ہوئی۔

a۔ٹیلی گراف　　b۔وائرلیس

c۔سیٹیلائٹ　　d۔ٹیلی فون

6۔آل انڈیا ریڈیو کا پہلا پروگرام کب نشر ہوا۔

a۔26/جنوری 1934ء کو　　b۔1/جنوری 1936ء کو

c۔فروری 1928ء کو　　d۔اپریل 1922ء کو

7۔ٹیلی ویژن کن چیزوں سے مل کر وجود میں آیا۔

a۔ٹیلی گراف اور وائرلیس سے　　b۔وائرلیس اور سیٹیلائٹ سے

c۔ریڈیو اور سنیما سے　　d۔ٹیلی گراف اور سنیما سے

8۔سنیما میں سن کر اور دیکھ کر کسی پیغام کو سمجھا جاتا ہے۔　　صحیح/غلط

9۔تحریر کی ایجاد نے انسان کے منہ سے نکلی آواز کو فضا میں گم ہو جانے سے بچا لیا۔　　صحیح/غلط

10۔ کاغذ کی ایجاد سے قبل صرف لکڑی کی تختیوں پر لکھائی ہوتی تھی۔ صحیح/غلط

11۔ عوامی ذرائع ترسیل میں سب سے پہلے الیکٹرانک میڈیا کا ارتقا ہوا۔ صحیح/غلط

12۔ سب سے پہلے متکلم فلمیں وجود میں آئیں۔ صحیح/غلط

13۔ ریڈیو میں آواز کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کے لیے تار کی لائن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ صحیح/غلط

14۔ ٹیلی ویژن اور سنیما کے پروگراموں کو بنانے میں سب سے اہم رول کیمرے کا ہوتا ہے۔ صحیح/غلط

## نمونہ جوابات

1۔a۔ اخبار

2۔c۔ پڑھکر

3۔c۔ آواز

4۔b۔ 104ء میں

5۔d۔ ٹیلی فون کے ذریعے

6۔b۔ 1/جنوری 1936ء

7۔c۔ ریڈیو اور سنیما سے

8۔ صحیح

9۔ صحیح

10۔ غلط

11۔ غلط

12۔ غلط

13۔ غلط

14۔ صحیح

## 2.10 نمونہ امتحانی سوالات

1۔ مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب 30 سطروں میں لکھیئے۔

ا۔ پرنٹ میڈیا کی تعریف کرتے ہوئے اس کی اہمیت وافادیت بیان کیجیے۔

II۔ الیکٹرانک میڈیا میں کون کون سی چیزیں آتی ہیں اور ان میں کسی پیغام کو کن چیزوں کے ذریعے بھیجا جاتا تھا۔

2۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں بھیجئے۔

I۔ کاغذ کی ایجاد سے پہلے کن کن چیزوں پر لکھا جاتا تھا۔

II۔ تحریر کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

## 2.11 سفارش کردہ کتابیں


1۔ میڈیا روپ بہرو، سہیل انجم

2۔ ٹیلی ویژن نشریات، انجم عثمانی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 1994ء

3۔ اردو صحافت، انور دہلوی (مرتب)، دہلی اردو اکادمی، دہلی، 1987ء

4۔ ابلاغیات، محمد شاہد حسین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2003ء

# اکائی۔4 : صحافی کے اوصاف

## ساخت


| | |
|---|---|
| 4.1 | اغراض ومقاصد |
| 4.2 | تمہید |
| 4.3 | صحافت مشن ہے یا پیشہ |
| 4.4 | صحافی بحیثیت ایڈیٹر |
| 4.5 | صحافی بحیثیت سب ایڈیٹر |
| 4.6 | صحافی بحیثیت رپوٹر/نامہ نگار |
| 4.7 | خلاصہ |
| 4.8 | اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات |
| 4.9 | نمونہ امتحانی سوالات |
| 4.10 | سفارش کردہ کتابیں |


## 4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں صحافی کی خصوصیات اور اہلیت بیان کی گئی ہے۔اسے مکمل کر لینے کے بعد آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ صحافی بننے کے لیے انسان میں کن خصوصیات کو ہونا چاہیے۔ یہ آپ نہ صرف سمجھ سکیں گے بلکہ اس کی وضاحت بھی کر سکیں گے۔ ان خصوصیات کو سمجھ لینے کے بعد کوئی بھی شخص صحافی بننے کے لیے اپنے اندر ان خصوصیات کو پیدا کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

## 4.2 تمہید

صحافت اطلاعات، خیالات اور معلومات کو انسانوں کے بڑے گروہ تک پہنچانے کا فن ہے۔فن اس لیے ہے کہ اس کے ذریعے اطلاع، معلومات یا پیغام غیر ارادی طور پر یوں ہی نہیں پہنچا دیا جاتا بلکہ منصوبہ بند طریقے سے تیاری کر کے ارادتاً پہنچایا جاتا ہے۔اور یہ پیغام کسی ایک فرد تک نہیں بلکہ ایک بڑے گروہ تک پہنچایا جاتا ہے۔فرد اور گروہ کی نفسیات مختلف ہوتی ہیں۔

فرد کی نسبت گروہ یا انبوہ میں عقلیت کم اور جذباتیت زیادہ ہوتی ہے۔

انبوہ میں استقلال اور فیصلہ کی کمی اور جبلی وسطی حسیت کی زیادتی ہوتی ہے۔

انبوہ کی نفسیات میں خیالات کا لاابالی پن، طفلانہ جوش وخروش، زود رنجی اور جلد خوش ہو جانے کی صفات پائی جاتی ہیں۔

چنانچہ صحافی کو کچھ لکھتے وقت انبوہ کی نفسیات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پھر انبوہ میں بھی مختلف ذہنیت، مختلف فکر اور مختلف روایات کے علم بردار لوگ ہوتے ہیں۔ صحافی کو ان سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحافت کے فن پر دسترس ذرا مشکل سے حاصل ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ صحافی کے اندر کچھ خصوصیات کی توقع کی جاتی ہے۔

## 4.3 صحافت مشن ہے یا پیشہ

میتھو آرنلڈ نے صحافت کو جلدی میں لکھا گیا ادب کہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تعریف کچھ لوگوں کے لیے قابل قبول نہ ہو کیوں کہ لفظ عجلت میں پوشیدہ تحقیری عنصر بالکل پوشیدہ بھی نہیں۔ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ عجلت میں لکھی گئی تحریر معیاری ہو، پھر تمام صحافتی تحریریں عجلت میں لکھی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اداریہ، کالم، فیچر، مضامین اور تبصرے عموماً عجلت میں تحریر کئے ہوئے نہیں ہوتے۔ لہذا صحافت اور ادب کے درمیان کوئی سیدھی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی۔ صحافت میں اکثر ایسے مقامات آتے ہیں جہاں صحافت اور ادب ایک ہو جاتے ہیں۔

صحافت اور ادب کے درمیان اگر کوئی باریک خط تفریق کھینچا جا سکتا ہے تو یہ کہ ادبی تحریروں کی تخلیق کے لیے وقت کا کوئی تعین نہیں ہوتا جب کہ صحافتی تحریروں کے لیے بہر حال وقت کی پابندی ہوتی ہے۔ صحافی کسی واقعے یا حادثے کو بیان کرتے ہوئے معاشرے کی بات کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جب کہ ادبی تحریروں میں ادیب کی ذاتی فکر بنیاد ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ صحافتی تحریروں کی زندگی مختصر ہوتی ہے جب کہ ادبی تخلیقات ایک لمبے عرصے تک زندہ رہ سکتی ہیں اور آنے والی متعدد نسلیں اس سے استفادہ کر سکتی ہیں۔ مگر ادب کے قاری محدود ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے جب کہ صحافت کی وسعت اور دائرہ اثر لامحدود ہے۔

صحافت کے بارے میں ابتدا ہی سے مختلف نظریات گشت کرتے رہے ہیں۔ کچھ اسے صرف تجارت یا پیشے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر بہت سے لوگوں کا ماننا ہے کہ کسی اعلی مقصد کو نصب العین بنا کر صحافت کے میدان میں قدم جمائے رہنا بہر حال لائق احترام ہے۔ جس کے تحت صحافی سماج کو مستعد اور چوکنا رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ ایسی صحافت کی گواہی کے لیے ہندستان کی جنگ آزادی کافی ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ صحافت کو وہی دینا چاہیے جو اس کے قارئین کی مانگ ہو۔ یہ بات ان لوگوں سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ صحافت کا فرض سچائی کو بے نقاب کرنا ہے۔ لوگوں تک وہ سچ پہنچاؤ جس کا جاننا ان کے لیے ضروری ہے۔

سچ بولنا جہاں صحافت کا مذہب ہونا چاہیے۔ وہیں سچ بولنے کی چھوٹ سرکار کی طرف سے بھی ہونی چاہیے۔ اسی چھوٹ کا نام پریس کی آزادی ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ جس سماج میں سچ کہنے کا اختیار نہیں ہوگا اس میں کسی طرح کی آزادی نصیب نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ آزادی اور اختیار کے ساتھ فرض اور ذمہ داری ہمیشہ سے جڑی رہی ہے۔ اگر کسی کو آزادی اور اختیار ملتا ہے تو اس کے کچھ فرائض بھی متعین ہو جاتے ہیں۔ صحافت جب مکمل آزادی حاصل کرتی ہے تو گویا بہت سی ذمہ داری بھی قبول کرتی ہے۔ جس سے وہ آزادی کی صحیح حامل ہو سکے۔ لہذا اس کی ذمہ داریوں میں پہلی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو، خود کفیل ہو۔ جو پریس اقتصادی طور پر آزاد نہیں ہوگا۔ وہ اپنے کام کو آزادی سے کیسے انجام دے سکے گا۔

صحافت کے فرائض میں ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ واقعات اور حکمرانوں کے فیصلوں کی صحیح جانکاری جلد سے جلد عوام تک پہنچائے۔ جو اخبارات سرکار اور دوسرے اداروں کی سرگرمیوں سے پردہ نہیں اٹھا سکتے وہ اپنے وجود کو عزت کے ساتھ زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتے۔ صحافت کا مذہب ہے بولنا، سیاست داں خاموش رہ سکتا ہے مگر صحافی نہیں۔

صحافی کو ان تمام باتوں کا سمجھنے والا ہونا چاہیے۔ صحافی کی اصطلاح کسی فرد واحد کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ ایڈیٹر بھی صحافی ہے، سب ایڈیٹر، رپوٹر کالم نویس، فیچر نگار، مضمون نگار، تبصرہ نگار، تجزیہ نگار یہاں تک کہ کارٹون بنانے والے، تصویریں مہیا کرانے والے اور سرخیاں جمانے والے بھی صحافی ہیں۔ اور ہر ایک کی خصوصیات اور اہلیت الگ الگ ہے۔ لہذا کچھ مخصوص صحافیوں کی خصوصیات پیش کی جارہی ہیں۔

## 4.4 صحافی بحیثیت ایڈیٹر

اخبار کو وقت پر شائع کرنے کی ساری ذمہ داری ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ وہ اخبار کا ایسا سربراہ ہوتا ہے جو اپنے زیر نگرانی عملے سے کام لے کر اخبار کو عوام میں مقبول بنانے کا اہم کام انجام دیتا ہے۔ اخبار کی پالیسی مالک کی رائے سے وہی طے کرتا ہے۔ اسی کی سوجھ بوجھ، سمجھ داری اور قابلیت واہلیت پر اخبار کے کردار و معیار کا تعین ہوتا ہے۔ وہ اپنی خاص تحریر ''اداریئے'' میں صرف کسی اہم مسئلے پر رائے ہی نہیں دیتا بلکہ کسی واقعے کی تفسیر و توضیح کرتا ہے۔ کسی فیصلے کی اہمیت بھی بتاتا ہے۔ کسی غیر مفید منصوبے کی مذمت بھی کرتا ہے۔ مبہم اور غیر واضح باتوں کا مفہوم بھی سمجھاتا ہے۔ کسی مسئلے پر اہم سوالات قائم کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ صحافیوں میں سب سے اہم ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے انداز صحافی کی جملہ خصوصیات ہونی چاہیں۔

ایڈیٹر کو چاہیے کہ وہ اپنی سوجھ بوجھ سے حکمرانوں کے اہم فیصلوں کی ٹھیک ٹھیک جانکاری بروقت عوام تک پہنچائے۔ جو ایڈیٹر / صحافی سرکار اور دوسرے اداروں کی سرگرمیوں یا بدعنوانیوں سے پردہ نہیں اٹھا سکتے وہ اپنے وجود کو عزت کے ساتھ زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتے۔ وہ نہ صرف حقائق کو پیش کرے بلکہ حقائق پر جواں مردی کے ساتھ تنقید بھی

کرے اور قارئین کی صحیح رہنمائی بھی۔ مگر اپنے نظریات ان پر نہ تھوپے اچھے ایڈیٹر میں یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ وہ اپنا کام غیر جانب داری کے ساتھ انجام دے اسے قطعی زیب نہیں دیتا کہ وہ چیزوں کو حکمروں کی خواہش کے مطابق توڑ موڑ کر پیش کرے۔ ایڈیٹر / صحافی کے کردار کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے اس کا غیر جانبدار رہنا، جو صحافی جانبدار ہو جاتا ہے وہ وقت کے ساتھ نہیں چل پاتا اور اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ ایڈیٹر کو چاہیے کہ وہ معاشرے کو یہ جانکاری بھی فراہم کرائے کہ اس معاشرے کے لوگ کیا کر رہے ہیں، کیا محسوس کر رہے ہیں اور ان کے افکار و رجحانات کی سمت و رفتار کیا ہے۔

تحریر میں ادبی چاشنی شامل ہو کر اس کا معیار بلند کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ لہذا ایڈیٹر کے اندر ادبی ذوق بھی ہونا چاہیے جو اس کی تحریروں کو جاذب اور پر اثر بنائے۔ اس کے اندر ایسا استدلالی شعور ہونا چاہیے کہ جب وہ کسی مسئلے پر روشنی ڈالے تو قاری یہ محسوس کرے کہ مسئلے کی پوری نوعیت اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ ایڈیٹر کا اپنا ایک نصب العین ہو، رائے عامہ کو متاثر کرنے کی قوت ہو، اور صحیح رہنمائی کی اہلیت۔ اسے اپنی تحریروں کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے جس میں زیادہ لوگوں کی دل چسپی ہو، اگر موضوع دل چسپ ہوگا تو مصروف سے مصروف قاری بھی اسے پڑھنے کی کوشش کرے گا۔ قاری کی توجہ مبذول کرنے کے لیے اس کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہو۔ جملے پیچیدہ نہ ہوں۔ تحریر سے بلند ذوقی اور نفاست نمایاں ہو۔ اسے طعن و طنز، ہجو یہ انداز، تنقید برائے تنقید اور احساسات و جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اسلوب سے دامن بچا کر حقائق کو اسدلال کے ساتھ پیش کرنا چاہیے، اس سے ایڈیٹر / صحافی میں عوام کا اعتماد بڑھتا ہے۔

## 4.5 صحافی بحیثیت سب اڈیٹر

صحافیوں میں سب سے زیادہ کام اور سب سے زیادہ ذمہ داری سب ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ ایڈیٹر کے بعد 'اخبار کے عملے' میں سب سے زیادہ اہم شخصیت سب ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا نام نہ اخبار کی کسی تحریر کے ساتھ چھپتا ہے اور نہ ہی اسے قارئین سے ذاتی ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ اس کی حیثیت گمنام ستارے جیسی ہے۔

خبر جیسے ہی اخبار کے آفس میں آتی ہے سب سے پہلے سب ایڈیٹر کے پاس جاتی ہے۔ لہذا کسی بھی مواد کو جانچنا پرکھنا ترتیب دینا اور اشاعت کے لیے منتخب کرنا سب ایڈیٹر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اشاعت کے لیے منتخب کیے گئے مواد کی نوک پلک سدھارنا، ابتدائیہ لکھنا، سرخی تجویز کرنا۔ پیراگراف مقرر کرنا، املا درست کرنا، ناموں کی صحت پر توجہ دینا قواعد کی رو سے عبارت کی تصحیح کرنا، سب ایڈیٹر کے فرائض میں داخل ہوتا ہے۔ خبر کی اہمیت کا اندازہ کرنا اور اسی لحاظ سے اس کے لیے جگہ کا تعین کرنا بھی اسی کا کام ہوتا ہے۔ سب ایڈیٹر کے کام کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے مختلف النوع خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے۔ مثلاً اس کے اندر ہوش و خرد، ذہانت و فطانت اور اچھی سوجھ بوجھ ہونی چاہیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت میں توازن ہو وہ جذباتی نہ ہو۔ اپنے مخالفوں کی بیجا مخالفت اور حمایتوں کی بیجا حمایت نہ کرے۔ اس کی نظر میں وسعت اور ذوق ستھرا ہوا ہو۔ اس کے اندر قوت فیصلہ، قوت

تمیز اور تحمل ہو، اس کا مطالعہ وسیع ہو۔ عصری مسائل، حالات حاضرہ اور عوامی رجحانات سے واقفیت رکھتا ہو۔ ہر طرح کے قوانین کی جانکاری ہو۔ صحافت کے فن سے واقف ہو۔ زبان پر قدرت ہو، عبارت کو چست اور جامع بنانے، جملوں کی ساخت میں ہم آہنگی اور تناسب قائم رکھنے کی اہلیت ہو۔ کیوں کہ کامیاب سب ایڈیٹر ذرا سی توجہ سے پینتیس چھتیس الفاظ کے مطلب کو چودہ پندرہ الفاظ میں ادا کر دیتا ہے۔ مثلاً ''وزیر اعظم ہندستان محترم جواہر لال نہرو'' کی جگہ ''وزیر اعظم جواہر لال نہرو'' یا مثال کے طور پر'' کی جگہ مثلاً لکھ کر کام چلا لے گا۔

مختصر یہ کہ کسی سب ایڈیٹر میں مذکورہ خصوصیات پائی جاتی ہوں تو وہ اپنا کام بہ حسن وخوبی انجام دے سکے گا۔

## 4.6 صحافی بحیثیت رپوٹر / نامہ نگار

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا رپوٹر ایسا صحافی ہے جس کے بغیر نہ تو کوئی خبر اخبار کے آفس تک یا کسی ادارے تک پہنچ سکتی ہے اور نہ خبر کے بغیر اس کی سرگرمی قائم رہ سکتی ہے۔ چنانچہ اس کے اندر درج ذیل خصوصیات کی سفارش کی جاتی ہے۔

☆ رپوٹر کو مہذب، آداب گفتگو سے واقف اور موقع کی نزاکت کو سمجھنے والا ہونا چاہیے، کیوں کہ خبریں حاصل کرنے کے لیے اس کا دن رات عوام سے سابقہ پڑتا ہے۔

☆ اسے گرم جوش، ملنسار، دلیر، بیدار مغز، تیز چالاک اور حاضر جواب ہونا چاہیے یہ تمام چیزیں اس کے پیشے میں معاونت کرتی ہیں۔

☆ صحافت کے میدان میں اعتبار واعتماد کی بڑی اہمیت ہے۔ لہذا رپوٹر کو اخلاقی ضابطوں کا پابند ہونا چاہیے۔ اسے ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس سے اعتماد مجروح ہو۔ مثلاً اسے اگر کسی نے کوئی خبر اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ اسے متعینہ مدت کے بعد شائع کیا جائے تو وقت مقررہ کے بعد ہی شائع کرنا چاہیے۔

☆ رپوٹر کے اندر خبر سونگ لینے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ بروقت خبروں تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس کے اندر فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ کسی واقعے میں خبری اہمیت کتنی ہے۔

☆ رپوٹر کے اندر ثقافتی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی امور کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ سے بھی گہری واقفیت ہونی چاہیے۔ کیونکہ کہ کسی معاملے کی تہہ تک پہنچ کر صحیح نتائج اخذ کرنے میں علمی استعداد سے کافی مدد ملتی ہے۔

☆ اسے غیر متعصب اور غیر جانب دار ہونا چاہیے اگر کوئی امر متنازہ ہے تو اس کے دونوں رخ کو پیش کرنا چاہیے کہ قارئین خود فیصلہ کر لیں گے۔

☆ اسے اپنی خبروں میں آدھی حقیقت پیش کر کے قارئین کو گمراہ نہیں کرنا چاہیے۔

☆ اسے اپنی خبروں میں ہر فرد، ہر قوم اور ہر ادارے کے ساتھ برابر کا سلوک کرنے والا ہونا چاہیے اور کسی کی زندگی میں بیجا مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔

☆ اسے کسی غیر مصدقہ خبر کو مصدقہ کے طور پر پیش نہیں کرنا چاہیے۔

☆ رپوٹر کے اندر عام فہم، قواعد کے رو سے درست اور سادہ و سلیس زبان لکھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

## 4.7 خلاصہ

اوپر ذکر کیا گیا کہ صحافت اطلاعات، معلومات اور خیالات کو عوام تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ مگر صحافت صرف اطلاعات و معلومات ہی نہیں پہنچاتی بلکہ یہ رائے عامہ کی تفسیر و تفصیل بھی پیش کرتی ہے۔ اس کے ذریعے رائے عامہ ہموار کرنے یا متاثر کرنے کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہ خبروں کی بنیاد پر مستقبل کی پیش گوئی بھی کرتی ہے۔ یہ سماجی زندگی کی تعمیری کوششوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ ادبی ذوق کی بھی تشکیل کرتی ہے اور تفریحی مواد بھی فراہم کراتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے متعلق صحافیوں کی مختلف اقسام ہیں۔ بنیادی طور پر انھیں دو قسموں میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک کل وقتی صحافی اور ایک جز وقتی صحافی، پھر ان میں بھی تقسیم ہو جاتی ہے کہ کوئی اداریہ لکھتا ہے کوئی خبروں کی ایڈیٹنگ کرتا ہے، کوئی خبریں فراہم کرتا ہے، کوئی کالم لکھتا ہے، کوئی فیچر لکھتا ہے، کوئی مضمون لکھتا ہے۔ کوئی تبصرہ لکھتا ہے اور موضوع کے لحاظ سے سب کی خصوصیات الگ الگ ہوتی ہیں۔

پھر بھی کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو تمام صحافیوں میں ہونی چاہیں مثلاً سچائی اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے لہذا صحافی کا مذہب ہے سچ بولنا۔ اسے اس سچ کو عوام تک پہنچانا چاہیے جس کا جاننا ان کے لیے ضروری ہے۔ صحافی کا رول تاریخ نگار کا سا ہونا چاہیے جو سچ کی تلاش میں رہتا ہے اور مستقبل کے لیے سچے واقعات چھوڑ جاتا ہے۔

صحافی کو غیر جانب دار ہونا چاہیے جو سب کے ساتھ برابر کا سلوک کرے جانبداری اس کے وقار کو مجروح کرتی ہے۔ اس کے انداز سوجھ بوجھ کا مادہ ہوتا کہ وہ چیزوں کو ان کے صحیح پس منظر میں رکھ کر حقیقت تک پہنچ سکے۔ چونکہ اس کا رابطہ عوام سے ہوتا ہے اس لیے اسے خوش اخلاق اور خوش گفتار بھی ہونا چاہیے۔ اس کے پیشے میں یہ چیزیں معاون ہوں گی۔

تمام صحافیوں کا ذریعہ اظہار و ابلاغ تحریر و تقریر ہے اس لیے ان کے اندر صحیح زبان لکھنے اور بولنے کی اہلیت ہونی چاہیے۔

## 4.8 اپنی معلومات کی جانچ، نمونہ جوابات

1۔ صحافت میں اطلاعات کس تک پہنچائی جاتی ہیں۔

a۔ کسی فرد تک

b۔ کسی بڑے گروہ تک

c۔ کچھ چنندہ اشخاص تک

d۔ کسی ادارے تک

2۔ صحافتی تحریروں کی زندگی کتنی ہوتی ہے۔

a۔طویل
b۔مختصر
c۔درمیانہ مدت کی
d۔بہت طویل

3۔پریس کی آزادی سے کیا مراد ہے۔
a۔سچ بات کہنے کی چھوٹ
b۔جذبات کو بھڑکانے والی چیزیں پیش کرنے کی چھوٹ
c۔چیزوں کو گورنمنٹ کی مرضی کے مطابق پیش کرنے کی چھوٹ
d۔چیزوں کو عوام کی خواہش کے مطابق پیش کرنے کی چھوٹ

4۔اخبار کو وقت پر شائع کرنے کی ذمہ داری کس کی ہوتی ہے۔
a۔رپوٹر کی
b۔سب ایڈیٹر کی
c۔ایڈیٹر کی
d۔نیوز ایجنسی کی

5۔اخبار کے عملے میں گمنام ستارے کی حیثیت کس کی ہوتی ہے۔
a۔کالم نگار کی
b۔ایڈیٹر کی
c۔رپوٹر کی
d۔سب ایڈیٹر کی

6۔صحافی کو کچھ لکھتے وقت فرد کا خیال رکھنا چاہیے۔ صحیح/غلط

7۔میتھو آرنلڈ نے صحافت کو اطمینان سے لکھا ہوا ادب کہا تھا۔ صحیح/غلط

8۔صحافت اور ادب کے درمیان سیدھا خط تفریق نہیں کھینچا جا سکتا۔ صحیح/غلط

9۔کسی صحافتی مواد کو جانچنا پرکھنا اور اشاعت کے لیے منتخب کرنا سب ایڈیٹر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ صحیح/غلط

10۔رپوٹر کو حالات حاضرہ سے واقف ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صحیح/غلط

11۔صحافی کو جانب دار ہونا چاہیے۔ صحیح/غلط

12۔اخبار کے آفس میں کوئی خبر آتی ہے تو درستگی کے لیے سب سے پہلے کس کے پاس جاتی ہے۔
a۔اخبار کے مالک کے پاس
b۔ایڈیٹر کے پاس
c۔سرخی لگانے والے کے پاس
d۔سب ایڈیٹر کے پاس

13۔اخبار کے عملے سے کام لینے کی ذمہ داری کس کی ہوتی ہے۔
a۔سب ایڈیٹر کی
b۔اخبار کے مالک کی
c۔ایڈیٹر کی
d۔رپوٹر کی

## اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

1۔(b) بڑے گروہ تک

2۔(b) مختصر

3۔(a) سچ بات کہنے کی چھوٹ

4۔(c) ایڈیٹر کی

5۔(d) سب ایڈیٹر کی

6۔ غلط

7۔غلط

8۔صحیح

9۔صحیح

10۔غلط

11۔غلط

12۔(d) سب ایڈیٹر کے پاس

13۔(c) ایڈیٹر کی

## 4.9 نمونہ امتحانی سوالات

I۔درج ذیل ہر سوال کا جواب (30) تیس سطروں میں لکھئے۔

1۔ایڈیٹر کی خصوصیات تفصیل سے بیان کیجیے

2۔سب ایڈیٹر کی ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

II۔مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات پندرہ (15) سطروں میں لکھیئے۔

1۔رپوٹر میں کن خصوصیات کی توقع کی جاتی ہے واضح کیجئے۔

2۔صحافی کی مجموعی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

## 4.10 سفارش کردہ کتابیں


1۔ابلاغیات محمد شاہد حسین ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2003

2۔رہبر اخبار نویسی، سید اقبال قادری، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1989

3۔فن ادارت، مسکین علی حجازی، اردو سائنس بورڈ، لاہور 1987

4۔صحافت (دی پریس)، ایم چلاہتی راؤ، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی 1984

5۔اردو صحافت (مرتبہ)، انور دہلوی، دہلی اردو اکیڈمی، دہلی 1987

بلاک ۔۴

اکائی ۹: مولوی باقر بحیثیت صحافی

اکائی ۱۰: مولانا محمد علی جوہر بحیثیت صحافی

اکائی ۱۱: مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت صحافی

اکائی ۱۲: حسرت موہانی بحیثیت صحافی

# اکائی۔۱ مولوی محمد باقر

ساخت؛

1.0 اغراض ومقاصد

1.1 تمہید

1.2۔مولوی باقر شخصیت وسوانح

1.3۔مولوی باقر سے قبل اردو صحافت

1.4 مولوی باقر بحیثیتِ صحافی

1.5 اپنی معلومات کی جانچ

1.6 خلاصہ

1.7 معروضی سوالات کے جواب

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.9 فرہنگ

1.10 سفارش کردہ کتابیں س

.....

## 1.0 اغراض ومقاصد

---

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

☆ مولوی باقر کی زندگی کے حالات سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ سن ستاون سے قبل اردو اخبارات اور اردو صحافیوں کی خدمات کا بخوبی علم ہوسکے گا۔

☆ اردو کا اوّلین مطبوعہ اخبار دہلی اردو اخبار سے متعلق واقفیت بہم پہنچے گی۔

☆ جنگِ آزادی میں اردو صحافت کے کردار کی تفصیلی جانکاری حاصل ہوگی۔

---

## 1.1 تمہید

---

جنگِ آزادی اور ملک کی تعمیر وترقی میں اردو صحافت نے جو کردار ادا کئے ہیں اس کے تذکرے کے بغیر ہماری تاریخ مکمل نہیں

ہوتی۔اردواخبارات نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کے ظلم وزیادتی اورناانصافی کو بےنقاب کیا، بلکہ جنگِ آزادی کی لے کوتیز کرنے اورمجاہدینِ آزادی کے لہوکوگرمانے،ان میں جوش وجذبہ اورحوصلہ پیدا کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔اردوصحافیوں کا یہ عمل بھی لائقِ تحسین رہا کہ انھوں نے خود جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کرحصّہ لیااور ہرطرح کی قربانیاں پیش کیں۔بلکہ اٹھارہ سوستاون کے انقلاب میں اردو کے عظیم صحافی مولوی محمد باقر کی شہادت ہماری جہدِ آزادی کا نقطہ آغاز ہے۔

---

## 1.2 حالاتِ زندگی

---

مولوی محمد باقر کا تعلق دہلی کے ایک خوشحال اور اہلِ علم گھرانے سے تھا۔ان کے آباء واجداد محمد شاہ کے دورِحکومت میں ایران سے ہندوستان آئے۔ان کے والد کا نام مولوی محمد اکبر تھا۔وہ یہاں پہلے ریاست کشمیراور پھر دہلی میں سکونت اختیار کی۔مولوی محمد اکبر عالمِ دین اورکئی کتابوں کے مصنف تھے۔ان کا اپنا کتب خانہ بھی تھا جس میں مذہبی کتابوں کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔محمد باقر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔پھر دہلی کے نامور عالم میاں عبدالرزاق سے درس لیا۔مولوی اکبر چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی انہیں کی طرح مذہبی علوم کی ترویج سے وابستہ ہو نیز زمانے سے ہم قدم ہوکر آگے بڑھے۔انھوں نے محمد باقر کوکواجتہاد کی تعلیم کے علاوہ عصری علوم سے بھی بہرہ ورکیا۔محمد باقر بھی شروع سے کھلے ذہن کے واقع ہوئے تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۲۵ء میں ''دہلی کالج'' قائم کیا جوعلم وآگہی کے جدید رجحانات کا سرچشمہ تھا۔مولوی باقر پہلے کالج میں بطورِطالب علم داخل ہوئے اور پھر ذاتی محنت،اور ذہانت کی بدولت ان کا تقرر بطورِمدرسِ فارسی ہوگیا۔کالج سے وابستگی کے دوران ہی ان کی دوستی پرنسپل فریڈرک ٹیلر سے ہوگئی جسے انھوں نے فارسی اوراردوزبان بھی سیکھائی۔وہ یہاں تقریباً سات برس تک درس وتدریس سے وابستہ رہے۔اس کے بعدوہ کلکٹری کے محکمہ میں تحصیل داراورسپرنٹنڈنٹ کے فرائض انجام دیتے رہے۔اس دفتر میں انہیں یہ بھی احساس ہوا کہ انگریزوں کے دفاتر میں ہندوستانیوں کی حیثیت دوسرے درجے کی ہےاوران کی تنخواہیں بھی انگریزوں کے مقابلے کم ہے۔اس تفریق سے وہ بےحددل برداشتہ ہوئے قلیل تنخواہ اورنامساعدحالات کے سبب وہ سرکاری ملازمت سے علاحدہ ہوگئے۔

مولوی باقر انگریزی حکومت کے تعصّبانہ رویوں اورتوہین کرنے والے طورطریقوں سے بیزار تھے۔وہ عیسائیوں کی مشنریوں اوران کی تبلیغی سرگرمیوں کے طورطریقوں اوران کی کتابوں کا بھی بغورمطالعہ کیا۔اس تشویش ناک صورتِ حال سے ہندوستانیوں کونجات دلانے کی غرض سے سماج کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔اپنے فلاحی مقاصدکوعملی جامہ پہنانے کے لئے مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۷ء میں ایک ہفتہ وار'دہلی اخبار'' جاری کیا،یہ اردوکا اولین مطبوعہ اخبار تھا۔جو بعد میں ''دہلی اردواخبار'' کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۸۳۴ء میں مولوی باقر نے دلّی کالج سے اس کا ایک فاضل لیتھو پریس خریدااور پہلے مطبع جعفریہ اور پھر مطبع اثناعشری کے نام سے اس سے طباعت کا کام لیا۔ پھر جب نئے اخبار نکالنے کی آزادی ملی تو اپنے تعمیری مقصد کے حصول کے لئے دہلی اخبار جاری کیا۔سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے انھوں نے دہلی کالج کا پریس پرنسپل ٹیلر کے توسط سے خرید لیا تھا۔مولوی باقر خوب سے خوب

ترکی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔وہ دینی تربیت یافتہ تھے ساتھ ہی زمانے کے نئے پرانے رنگ کا انھیں خاصہ تجربہ تھا۔انھوں نے اپنے عقیدے کے فروغ کے لئے 'مظہرالحق' کے نام سے ایک الگ اخبار جاری کیا تھا۔لیکن دلی اردو اخبار اس تاریخی شہر کے روایتی معاشرہ میں نئے موضوعات اور نئے خیالات بالخصوص سیاسی نکات میں دلچسپی لینے والا مخصوص اخبار تھا۔یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اخبار پر مولوی صاحب کا نام مالک یا مدیر کی حیثیت سے کبھی شائع نہیں ہوا۔

جنوری سے اگست ۱۸۴۰ء کے شماروں میں پرنٹر کے طور پر سید معین الدین کا نام شائع ہوتا رہا۔۱۹ اگست سے اس کے نام کے ساتھ امداد علی بیگ کے نام کا اضافہ ہوگیا۔۲۳ اگست سے پرنٹر اور پبلیشر کی حیثیت سے موتی لعل کا نام چھپنے لگا۔۱۸۵۱ء میں مطبع کا اہتمام مولوی باقر کے بیٹے محمد حسین آزاد کے ہاتھ آ گیا جو دہلی کالج سے اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے۔اخبار کے آخری شماروں پر جب اس کا نام ''اخبار الظفر'' ہو چکا تھا، بہ طورِ مہتمم سید عبداللہ شائع ہوا۔

مئی ۱۸۵۷ء کو انقلاب کی ابتدا ہوئی تو انگریزی حکومت نے باہر سے آنے والی تمام خبروں پر پابندی عاید کر دی۔ایسے حالات میں مولوی باقر نے روز رونما ہونے والے واقعات سے عوام کو باخبر رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔وہ اپنے دفتر سے باہر آ کر راجدھانی کی سڑکوں اور شاہراہوں، گلی کوچوں کی خبریں خود جا جا کر یکجا کرتے رہے۔انھوں نے جنگِ آزادی کے متوالوں کے پہلے دن کی معرکہ خیزی کی یادگار رپورٹنگ کی تھی اور انقلاب کے پہلے ہفتہ ہی میں اپنے ہفت روزہ روزنامے کا روپ دے دیا تھا۔۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کی دہلی اخبار کی رپورٹ نہ صرف طوفانی بغاوت کا آنکھوں دیکھا حال ہے بلکہ فرنگی کی ناگہانی خفت وشامت کا نقشۂ بے نظیر اور منظر نامہ یکتا ہے۔یہ صحیح معنوں میں چشمِ دید واقعات سے لبریز ایک ایسی دستاویز ہے جس کے مطالعے سے اس وقت کی تاریخ پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔اس ہنگامہ خیز دور کے سولہ شمارے .national Archiv of India,New Delhi میں محفوظ ہیں۔اس انقلاب میں دہلی اردو اخبار کے کردار سے خوش ہو کر مغل تاجدار نے اسے ''اخبار الظفر'' کا لقب دے دیا تھا۔جو ان ہی کے تخلص سے ہم رشتہ تھا۔اس اخبار کے ۲۴ مئی کے شمارے کے سرورق پر تاریخِ انقلاب عبرت افزا کے عنوان سے، مولوی محمد مولوی صاحب کے ہونہار فرزند مولوی محمد حسین آزاد کی تاریخی اور واقعاتی نظم شائع ہوئی۔جسے برطانوی حکومت نے، جو صداقت کی دشمن تھی قابلِ اعتراض قرار دے کر ضبط اور قفل بند کر دیا اور مولوی محمد حسین آزاد کو ان کے والد کی طرح مجرمین کی فہرست میں درج کر لیا اور ان کا وارنٹ گرفتاری نکال دیا۔

مولوی محمد باقر جو انقلاب کے پہلے دن سے انگریزوں کے خلاف انقلابیوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔قلمی واقعہ نگاروں کی تنظیم وتہذیب ان کے پیشِ نظر تھی، ہندو مسلم ارکان پر مشتمل ادیبوں اور صحافیوں کی ایک پوری جماعت ان کے ساتھ تھی۔فرنگی سامراج کے مشترکہ مقابلے کے لئے یہ واقع نگار اپنے فدائی جذبۂ وطن کے تحت وحدتِ فکر وعمل سے کام لے رہے تھے صاحبِ نظر مولوی محمد باقر نے ان باغیوں کے اتحاد میں بڑی کامیابی کی روشنی دیکھی۔

مولوی محمد باقر کی ایک اہم خصوصیت جو انھیں اپنے معاصرین پر انھیں فوقیت عطا کرتی ہے وہ عصری تقاضوں سے ان کی واقفیت ہے۔وہ دوسروں کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنے کے بجائے ہمیشہ وقت کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ صحافت محض خبروں کی

اطلاع کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ اس کے وسیلے سے سماج میں بیداری پیدا کی جاسکتی ہے اور اس سے تعمیرِ معاشرہ کا کام لیا جاسکتا ہے۔انھوں نے اسے عملاً کر کے دکھایا بھی۔ان کی صحافت نے ایک طرف انگریزوں کو خوف زدہ کیا تو دوسری طرف جنگِ آزادی کے جیالوں میں جوش و جذبہ بھی پیدا کیا۔انھوں نے قومی یکجہتی اور رواداری کو فروغ دینے میں بھی خصوصی دلچسپی لی۔اور ہندوؤں و مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے والی،انگریزوں کی کوششوں کو ناکام کیا۔

جہاں تک ان کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے مؤرخین نے ان کی زندگی کے کچھ اور پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ان کی پہلی شادی ایک ایرانی خاتون امانی خانم سے ہوئی تھی،جس کے بطن سے محمد حسین آزاد اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ان کے والد مولوی محمد اکبر کی حیات میں ہی ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔دوسری شادی ماسٹر حسینی کی بہن سے ہوئی تھی۔

مولوی محمد باقر مزاجاً نہایت وسعت النظر واقع ہوئے تھے،رواداری اور باہمی احترام کا جذبہ ان کی سرشت میں داخل تھا۔مولوی باقر کشمیری دروازہ کے علاقہ کھڑکی ابراہیم خاں میں رہتے تھے۔اور ان کے حلقۂ احباب میں مسلمانوں کے ہر مسلک کے افراد شامل تھے۔وہ سکھوں سے بھی قریبی روابط رکھتے تھے۔ڈاکٹر چمن لال ان کے احباب میں سرِفہرست تھے۔

وہ صحافی اور عالمِ دین ہونے کے علاوہ فوجی کارنامے بھی انجام دیتے تھے۔جیون لال نے اپنے ۱۶ مئی کے روزنامچے میں لکھا ہے کہ؛

''آج کے دن بادشاہ نے مولوی محمد باقر اور مولوی عبدالقادر کو باریاب ہونے کی عزت بخشی کیوں کہ انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ شاہی ہودے میں بٹھا کر اس کے گھر روانہ کیا''

جیون لال نے ۱۷ مئی کے روزنامچے میں لکھا کہ:

''مولوی باقر نے پیدل فوج کی دو پلٹنوں اور سواروں کے ایک دستہ کو حکم دیا کہ خزانہ کی حفاظت کریں''(بحوالہ نیا دور،انقلاب ۱۸۵۷ نمبر مئی ۲۰۰۷)

سرفروش،تیغ بکف،علمِ دین محمد باقر کی شخصیت کئی لحاظ سے اہم ہے وہ اردو کے پہلے شہید صحافی ہیں جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ نہ تو افکار کو پابہ زنجیر کیا جاسکتا ہے اور نہ قلم کو بیڑیاں پہنائی جاسکتی ہیں۔اسی قوت اور جذبے کے بل پر انگریزی حکومت کو للکارا۔ان کے یہ خیالات ملاحظہ کیجیے؛

''وہ خود کو رعایا کا محافظ اور امانت دار کہتے ہیں۔لہٰذا ان پر لازم ہے کہ امانت یعنی ملک ہندوستان بجنسہ ویسے ہی بلاتصرف اور تغیر واپس کر دیں''

مولوی محمد باقر کی شہادت کے متعلق محققین کی مختلف رائیں ہیں۔ان میں آغا محمد باقر (نبیرۂ آزاد) نے ''آبِ حیات کے لطیفے'' میں جو روایت پیش کی ہے اسے زیادہ معتبر تسلیم کیا جاتا ہے۔اس روایت کے مطابق دلّی کالج کی مدرسی کے زمانے میں ان کے تعلقات مسٹر ٹیلر سے گہرے ہوگئے تھے۔۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کے خلاف لوگوں کا غم و غصّہ پھوٹا،اور مارکاٹ ہونے لگی تو ٹیلر کسی طرح مولوی باقر کے گھر پہنچے اور ان سے پناہ مانگی۔مولوی باقر نے کچھ دنوں تک تو اپنے امام باڑے والے گھر میں چھپا کر رکھا لیکن کسی طرح محلوں والوں کو اس کی اطلاع مل گئی۔انھوں نے مولوی باقر پر اس قدر دباؤ ڈالا کے انہیں مجبوراً مسٹر ٹیلر کو سونپنا پڑا،جاتے ہوئے مسٹر ٹیلر

نے مولوی صاحب کو ایک لاطینی میں لکھا ہوا خط کسی شخص تک پہنچانے کی گذارش کی۔مولوی باقر کو نہ لاطینی آتی تھی اور نہ انھوں نے اس کی بابت کچھ دریافت ہی کیا۔امام باڑے سے نکلنے کے بعد ٹیلر کو قتل کر دیا گیا۔انقلاب کے پسپا ہونے کے بعد جب مولوی باقر نے وہ خط مکتوب الیہ کو پہنچایا۔جس کی بنا پر انھیں باغی قرار دے کر فوراً گرفتار کر لیا گیا۔۱۶ستمبر ۱۹۵۷ء کو دہلی دروازہ کے سامنے کے میدان میں سارے باغیوں کو گولی ماری جانی تھی۔مولوی صاحب کے دوست کرنل سردار سنگھ سے ان کے بیٹے آزاد نے والد کے آخری دیدار کی درخواست کی چنانچہ سائیں کے بھیس بدلوا کر انھیں اس میدان میں لے جایا گیا۔اس وقت محمد باقر نماز پڑھ رہے تھے۔نماز ختم ہوئی تو دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور وقت ختم ہونے کا اشارہ کیا۔مقررہ وقت پر توپ کے گولے سے اس مجاہدِ آزادی اور عظیم صحافی کو شہید کر دیا گیا۔

---

## 1.3 مولوی باقر سے قبل اردو صحافت

---

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے قبل اخبار نویسی کی کوئی قابلِ ذکر روایت نہیں ملتی۔البتہ سلاطین اور امراء کے احکام اور درباری خبروں سے متعلق قلمی اخبارات کی روایت بہت پرانی ہے۔کمپنی کے وجود سے جہاں ہمہ جہت نقصانات کا ایک سلسلہ شروع ہوا ،وہیں فنِ طباعت وصحافت میں مفید اضافے ہوئے۔موجودہ اخبار نویسی کا سنگِ بنیاد بھی اسی کا رہینِ منت ہے۔یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ انگریزوں نے یہ قدم کسی تعمیری نقطہ نظر کے تحت نہیں اٹھائے اور نہ عوام کی ذہنی وفکری تربیت یا معاشرے کی اصلاح ان کا مقصد تھا۔بلکہ بعض کمپنی کے ملازمین خالص شخصی اغراض، باہمی مناقشات اور مالی منعفت کے لئے صحافت کو وسیلہ بنایا تھا۔یہ کمپنی سے اختلاف اور اربابِ حل وعقد سے بیزاری اور ان پر نکتہ چینی کرنے کا نتیجہ تھا کہ ولیم بولٹس کو سب سے پہلے ملک بدر کیا گیا۔اس نے ۱۷۶۸ء میں کلکتہ سے اخبار نکالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا، البتہ یوروپ پہنچ کر پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب consideration of indian affairs لکھ کر کمپنی کے جبر واستبداد، غاصبانہ رویوں اور قاہرانہ حکمتِ عملی کو بے نقاب کر دیا۔یہ کتاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی پہلی تاریخ ہے جو جنگِ پلاسی کے بعد لکھی گئی۔دوسرے اس میں انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور بد اعمالیوں کا کچّا چٹھا ہے اور اسے ایک ایسے شخص نے لکھا جو ان سب چیزوں میں وہ خود شامل رہا۔اس روایت کو جن انگریز صحافیوں نے مستحکم کیا ان میں جیمس اگسٹس ہکی، ولیم ڈون، ڈاکٹر چارلس مکلین ،مسٹر فنیر اور جیمس بکنگم وغیرہ کے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان صحافیوں نے شخصی، اجتماعی، سیاسی اور اخلاقی ومعاشرتی فروگذاشتوں، کوتاہیوں، حق تلفیوں اور ناانصافیوں کو بڑی بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ اجاگر کیا۔یہ درست ہے کہ یہ صحافی جنگِ آزادی کی جدوجہد سے وابستہ نہ تھے، لیکن اردو اخبارات کی مجاہدانہ اور قائدانہ کارکردگی سے قبل ان صحافیوں نے انگریز مخالف آواز بلند کر دی تھی۔

ہندوستانی صحافیوں اور مصلحین میں راجہ رام موہن رائے کا نام صحافت کے بنیاد گذاروں میں ہوتا ہے۔جنھوں نے ۱۲اپریل ۱۸۲۲ء کو فارسی زبان کا پہلا اخبار 'مراۃ الاخبار' جاری کیا، اس کے علاوہ بنگلہ میں سمباد کمودی اور انگریزی اخبار 'برہمنیکل میگزین' کی بھی سرپرستی

کی۔ جب گورنر جنرل جان ایڈم نے ہندوستان میں ۱۴ مارچ ۱۸۲۲ء کو دیسی اخبارات پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی غرض سے پریس آرڈی نینس جاری کیا، تو راجا رام موہن رائے نے سب سے زیادہ مخالفت کی۔ اردو کا پہلا اخبار 'جامِ جہاں نما' ۱۸۲۲ء میں جب وجود میں آیا اس وقت تک انگریزی کے کئی اخبارات انگریز مخالف سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۹۳۰ء میں لسانی سازش کے تحت فارسی کی حیثیت ختم کر کے جب اردو کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا تو اس کی نشو و نما کے امکانات زیادہ روشن ہو گئے۔ ہندو مسلم صحافیوں نے مشترکہ طور پر اِن قلمی اور عملی جدو جہد میں حصّہ لیا۔ اور ہندوستان کے سپوتوں کے خون کو گرمانے ان کے اندر جوش و ولولہ پیدا کرنے اور ن غیرت و حمیت کو ابھارنے میں خصوصی دلچسپی لی۔

۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء کے درمیان شمالی و جنوبی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اردو اخبارات شائع ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز پرست ہندوستانیوں کے دل میں بھی آزادی کی تڑپ اور چاہ ابھرنے لگی تھی۔ دہلی کالج کے اساتذہ مثلاً اسپرنگر اور ماسٹر رام چندر اس کی بین مثال ہیں، جنھوں نے ۱۸۴۵ء میں دہلی سے اپنا پندرہ روزہ اخبار 'فوائد الناظر' اور علمی و ادبی رسالہ 'محبّ ہند' وطن پرستی سے سرشار ہو کر شائع کیا۔ دہلی سے ہی 'صادق الاخبار' کے نام سے کئی اخبار نکلے۔ ان میں سید جمیل الدین خاں کے 'صادق الاخبار' کو ان معنوں میں اہمیت حاصل ہے کہ اس اخبار نے ۱۸۵۷ء میں اپنی شعلہ بیانی سے تحریکِ آزادی کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور دیسی سپاہیوں و مجاہدین آزادی کے جوشِ جہاد میں غیر معمولی شدت پیدا کر دی۔ 'صادق الاخبار' جانباز اور سرفروش مجاہدوں کے انگریز کے خلاف زبردست معرکہ آرائی کی خبر انتہائی دلیری اور جوانمردی کے ساتھ پیش کرتا تھا۔ سید جمیل کو انگریز دشمن تحریروں کے سبب بغاوت کے الزام میں تین سال قیدِ بامشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔

سرسید کے بڑے بھائی کی ادارت میں شائع ہونے والا 'سید الاخبار' اور فرنگی محل لکھنؤ، کے مولوی محمد یعقوب انصاری کی ادارت میں نکلنے والا 'طلسم لکھنؤ' اور منشی نول کشور کا 'اودھ اخبار' اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ میرٹھ سے سید ظہور طور کا اخبار 'جلوۂ طور' اپنے انگریز مخالف پالیسی کی وجہ سے جہاں عوام میں مقبول ہوا وہیں کمپنی کے عتاب کا شکار بھی ہوا۔

ایسٹ انڈیا کمپی کے قلعہ بند اور مستحکم سامراج کی جن صحافیوں نے چولیں ہلا دیں ان میں محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر اور ان کی ادارت میں نکلنے والا ''دہلی اردو اخبار'' کا نام بے حد محترم ہے۔ ہر چند کے یہ اخبار ابتداً مغلیہ دربار اور کمپنی کی خبروں اور دیگر امور کی اشاعت تک محدود تھا، لیکن جلد ہی انگریز حکام کی بڑھتی ناانصافی اور عوام کی ہوتی تنگ زندگی نے، اس اخبار کو انگریز مخالف ہراول دستہ میں شامل کر دیا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے جہاں سیاسی اور معاشرتی سطح زندگی پر دیرپا اثرات مرتب کئے وہیں شعر و ادب اور صحافت پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ۵۷ء کے بعد کی اردو صحافت کا لب و لہجہ واضح طور پر بدلا ہوا ہے۔ ماضی سے وابستگی کے باوجود نئے دور اور نئے تقاضوں کی آہٹ صاف سنائی دیتی ہے۔ ان میں جہاں ایک طرف قومی، تہذیبی اور اخلاقی زوال کا شدید احساس تھا تو دوسری طرف قومی اور ذہنی و فکری تعمیر و تشکیل بھی اردو اخبار کے پیشِ نظر رہی۔ سرسید، حالی، شبلی اور محمد حسین آزاد اور دوسرے اکابرین کی کوششوں نے شعر و ادب کے علاوہ صحافت کا دائرہ بھی وسیع کر دیا، اردو صحافیوں نے اس نازک دور میں اپنی ذمہ داریوں کو قبول

کرتے ہوئے ایک حکمتِ عملی کے تحت جدوجہدِ آزادی کی لے کو تیز کیا۔

---

## 1.4 مولوی باقر بحیثیتِ صحافی

---

''دہلی اردو اخبار'' تاریخی لحاظ سے اس لئے اہم کہ یہ شمالی ہند کا پہلا اور ہندوستان کا دوسرا اخبار ہے۔شروع میں یہ دو کالمی ہوتا تھا۔صفحۂ اول پر''حضورِ والا'' کے عنوان سے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں روزنامچہ چھپتا تھا جب کہ دوسرے کالم میں''صاحب کلاں'' کے عنوان سے ایسٹ انڈیا کمپنی سے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں۔یہ اخبار شروع میں مغلیہ دربار اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے متعلق خبروں اور دیگر امور کی اشاعت کو یکساں طور پر ترجیح دیتا تھا۔لیکن انگریزوں کے ملک دشمن رویّے اور ناانصافی کے باعث اس میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس اخبار نے ملک وقوم کی خدمات کو اپنا شیوہ بنالیا۔

مولوی باقر تعمیری صحافت کے علمبردار تھے۔اور انسانی قدروں کے طرفدار۔ان کے نزدیک صحافت ایک ذمہّ دارانہ پیشہ تھا،اور اسے وہ تعمیرِ معاشرہ کا ایک اہم وسیلہ تصوّر کرتے تھے۔انھیں اپنی ملازمت کے دوران ہی انگریزوں کے ظلم وزیادتی اور سماج میں پھیلی نابرابری اور عصبیت کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا۔''دہلی اردو اخبار'' کی ۷/ اگست ۱۸۵۳ء کی اشاعت میں انھوں نے ایک مضمون میں اخبار کے ایڈیٹر کی ذمہ داریوں اور ایڈیٹر کے فرائض پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھیں عوام کے اخلاقی سدھار پر خصوصی توجہ دینے کی وکالت کی۔ان کا خیال تھا کہ یہ اہم فریضہ اس وقت انجام دیا جاسکتا ہے جب ایڈیٹر کی اپنی ذات نمونۂ تقلید ہو۔انھوں نے لکھا کہ کوئی ایڈیٹر اپنے پڑھنے والوں سے ان کی اخلاقی حالت میں تبدیلی کی امید اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک خود اس کے کردار وعمل بہتر نہ ہوں۔اس کے کردار وگفتار میں کوئی تضاد نہ ہو۔مولوی باقر کے نزدیک اخبار کا اوّلین فریضہ سچّائی کو بے نقاب کرنا تھا۔چناں چہ اسی مضمون میں انھوں نے ایڈیٹروں کو من گھڑت اور بدنیتی پر مبنی رپورٹیں بھیجنے والے نامہ نگاروں سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا۔ان کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں:

''ہرگز ہرگز ہرزہ اور خلافِ وضع اہلِ علم کے کاریس پانڈنٹ کو منھ نہ لگائے اور اون سے ہاتھ نہ ملائے''(بحوالہ اردو صحافت انیسویں صدی میں ص۱۸۲)

انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ایڈیٹر جھوٹی اور بے بنیاد خبریں نہ شائع کریں اس سے پڑھنے والوں کا اخبار پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اور یہ ان کے وقار کے منافی ہوگا۔

اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مولوی باقر صحافت کا ایک واضح نظریہ رکھتے تھے۔اس کا اندازہ اخبار کے مشمولات سے بھی بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ان کے اخبار میں جیلوں کی ابتری،سرکاری حکام اور پولیس کی زیادتیوں،اقتصادی بدحالی،جرائم اور عوامی فلاح کی عام خبریں چھپتی تھیں۔اداریے کا ان دنوں رواج نہ تھا۔لیکن خبروں کی ترتیب وتدوین اس طرح کی جاتی تھی کہ اصلاح کی ضرورت پیش آتی تھی اور یہ فریضہ ایڈیٹر ہی انجام دیتا تھا۔ان خبروں میں حب الوطنی اور انسان دوستی کے فروغ پر بھرپور توجہ دی جاتی تھی۔

مولوی باقر کے دوستوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب ہی تھے۔ان میں دلّی کالج کے معلّم اور صحافی ماسٹر رام چندر، قانون داں اور صحافی پربھودیال اور دلّی کالج کے ہیڈ ماسٹر جے، ایچ ٹیلر شامل تھے۔ یہاں ماسٹر رام چندر کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور کی خدمات بھی بیش بہا۔ان کی ادارت میں فوائدالناظرین، خیرخواہِ ہند اور محبِ ہند جیسے اخبار نکلتے تھے۔وہ ایک مفکّر تھے اور نظریۂ قوم کی ترجمانی کرتے تھے۔انھوں نے قوم کی ترقی وسربلندی کے لئے ہی اخبار کا سہارا لیا تھا۔

مولوی باقر کی صحافت میں بھی اپنے معاصرین کی طرح وطنِ عزیز کا درد اور معاشرے کو بدلنے کی للک موجود ہے۔خصوصاً ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں روزِ اوّل سے ہی انھوں نے جس طرح رپورٹنگ کی اس سے ان کی حب الوطنی اور جذبۂ ایثار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔مؤرخین کے نزدیک ۱۶/مئی ۱۸۵۷ء کا شمارہ اس لئے اہم ہے کہ یہ مولوی باقر کی آنکھوں دیکھی روداد ہے جو ایک کیمرے کی تصویر کے ہو بہو ہے۔اس لحاظ سے اس کی اہمیت ایک دستاویز کی ہے۔اس کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ بظاہر ایک ناکام انقلاب تھا لیکن اس شورش نے انگریزوں میں نہ ختم ہونے والی بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا تھا۔انگریز اس قدر بوکھلا گئے تھے کہ ایک مذمتی اور دھمکی آمیز اشتہار چھاپا اور اسے جامع مسجد کے دروازوں اور کئی مقامات پر چسپاں کروایا۔جون ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں کوئی سیاسی جماعت یا قیادت لوگوں کے اندر جوش وجذبہ بیدار کرنے کی ترغیب دینے سے قاصر تھی اس وقت اردو اخبار ہی تھے جو ان میں سرفروشی اور وطن پر مرمٹنے کا جوش بھر رہے تھے اور انھیں خود ہی اپنے وطنِ عزیز کی حفاظت کے لئے میدان میں اُترنے کے لئے مجبور کر رہے تھے۔

مولوی باقر کے زمانے میں آج کی طرح کوئی خبر رساں ایجنسی یا ادارے نہیں تھے۔لیکن مغلیہ حکمرانوں نے اپنے اطلاعتی نظام کو مستحکم کرنے کی غرض سے اردو اور فارسی کے وقائع نگاروں کا سہارا لیا تھا۔ان کے جانشینوں کا ایک طبقہ اب بھی فعال تھا۔مولوی باقر نے اپنے اثر ورسوخ سے ایسے ذرائع سے رابطہ قائم کیا اور اپنے اخبار میں مختلف درباروں، ریاستوں اور شہروں کی خبریں شائع کیں۔

مولوی باقر مختلف خبروں کے علاوہ ان پر تبصرے بھی کیا کرتے تھے جس سے ان کے موقف کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کی ایسی تحریریں بھی ملتیں ہیں جن میں حکومت کے زیرِ تجویز فیصلوں کی اطلاع دیتے ہوئے ان کی خامیوں کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے تاکہ فیصلے عمل میں نہ آسکیں۔۱۸۴۰ء کی فائل میں اخبار کے آخر میں جابجا ایک کالم ''سپرنٹنڈنٹ دہلی اخبار سلمہٗ'' کے عنوان سے درج ہے جس میں تازہ ترین حالات وواقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس وقت کے اہم مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہے۔یہاں بطورِ نمونہ ایک اقتباس درج کیا جارہا ہے جس میں عدالتی نظام اور وکیلوں کے کردار پر بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے:

''میں نے اکثر کچہریوں کی سیر کی اور محکماتِ عدالت دیوانی اور فوج داری وغیر اضلاع میں رہا، بہت تجربہ حاصل کیا، میں نے خوب غور کر کے دیکھا کہ جس محکمے میں مختار کار یا وکیل بیش تر ہوتے ہیں، وہاں کے حاکم کو بھی بہت تکلیف رہتی ہے۔مقدمات بہت طول پکڑتے ہیں اور حق تلفیاں بھی رعایا کی بیش تر ہوتی ہیں۔اکثر جھوٹے مقدمے صنعت اور سادہ کاری مختار کی سے، اس طرح کا رنگ اور صورت پکڑتے ہیں کہ سچّا حق دار اپنے حق سے محروم رہ جاتا ہے اور جھوٹا مقدمہ سرسبز ہوتا ہے.....اس لئے میری دانست میں بجز ضرورت.....خصوصی سررشتہ فوج داری میں تقرر مختار نہیں ہوتو بہتر ہے'' (اردو صحافت انیسویں صدی میں ڈاکٹر طاہر مسعود ص ۱۸۳)

'دہلی اردو اخبار' کے حوالے سے مولوی باقر کی صحافتی پالیسی کی نشاندہی کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اخبار حقائق کو چھپانے کے بجائے اسے بے نقاب کرتا تھا۔اس نے بلا تفریق قلعہ معلیٰ اور انگریز سرکار دونوں کے متعلق خبریں شائع کیں۔اس نے قلعے کے اندرونی زندگی کو بھی دیکھایا اور باہر فرنگیوں کے سیاہ وسفید کارناموں پر سے بھی پردہ ہٹایا۔اس کے باوجود مولوی باقر نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔وہ ایک طرف اخبارات کو جو آزادی نصیب تھی اس کا احترام کرتے تھے لیکن جہاں ضرورت پیش آئی بے باکی اور جرات مندی کا ثبوت دینے میں گریز نہیں کیا۔انھوں نے مغل بادشاہ کی بے بسی کی تصویریں بھی مختلف زاوے سے پیش کیں اور قلعے کے بعض فیصلوں پر اعتراجات بھی کئے۔لیکن جوں ہی ستاون کا انقلاب شروع ہوا بادشاہ کا حامی اور انگریزوں کا کٹّر دشمن بن کر میدانِ جنگ میں اتر گیا۔

مولوی باقر نے دہلی اردو اخبار کو عوامی مفادات کے تحفظ اور محروم ومحکوم طبقوں کے حقوق کی بحالی کا وسیلہ بنالیا تھا اور اسی کے ذریعہ وہ سدا آواز اٹھاتے رہے۔انھوں نے سرکاری محکموں بالخصوص پولیس کی زیاتیوں اور عدلیہ کی ناقص کارکردگی کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔اس اخبار نے قومی یکجہتی کے فروغ میں بھی کلیدی رول ادا کیا اور مسلکی جھگڑوں کو ختم کرنے میں بھی دلچسپی لے کر امن وآشتی کے پیغام کو عام کیا۔

یہاں دہلی اردو اخبار سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جس سے اس وقت کے پولیس محکمے کی بدعنوانیوں کی قلعی کھلتی ہے اور اخبار کے ذمہ دارانہ روّیے واضح ہو جاتے ہیں:

''دریافت ہوتا ہے کہ ان دنوں مین ہنگامہ چوری کا وہاں ایسا بازار گرم ہے کہ شہریوں نے رات میں سونا ترک کر دیا ہے۔ہر شب چور دولت مندوں کے گھروں میں آ کے جو کچھ نقدِ جنس پاتے ہیں اور اربابِ پولیس سے کچھ تدارک اوس کا نہین ہوسکتا۔طاہرا چورون سے سازش رکھتے ہیں وگرنہ ممکن نہیں کہ ہر شب بے سازش پاسبانوں اور اربابِ پولیس کے چوری کرنے میں جرأت کرسکیں''

مولوی باقر کا عہد شہادت کا عہد تھا ان کی رفاقت میں اردو صحافی جذبۂ سرفروشی سے سرشار تھے اور سامراجی کے سرپرست انگریزوں کو ہر حال میں ملک سے باہر کرنے کے درپے تھے۔مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد فرنگیوں کی زیادتیاں اور تیز ہوگئیں۔مولوی باقر اس حکومت کے پارکھ تھے ان کا سماج ان کا معتقد تھا۔اس نے حالات کے نئے موڑ سمجھا،اس کے صحافیوں نے علم کی اس نئی صنف کو ایثار کا ضابطہ بنایا اور آزادی کی راہ میں نکل پڑے۔مولوی باقر اپنے سرفروشانہ جذبے کے تحت جامِ شہادت نوش فرما گئے لیکن ان کی یہ قربانی ایک ایسی تاریخ رقم کرگئی جو بعد کی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ہے اور جس پر عمل کر کے اپنے ملک،قوم،معاشرہ اور خود اپنی ذات کو روشن و منوّر کیا جا سکتا ہے۔

.....

1.5 اپنی معلومات کی جانچ

.....

ا۔اردو کا پہلا اخبار کون تھا؟

۲۔اردو کا پہلا اخبار کب اور کہاں سے جاری ہوا؟

۳۔راجا رام موہن رائے نے کون سا اخبار جاری کیا تھا؟

۴۔مولوی باقر کے والد کا کیا نام تھا؟

۵۔مولوی باقر کے بیٹے کا نام کیا تھا؟

۶۔دہلی اردو اخبار کب وجود میں آیا؟

۷۔اودھ اخبار کس کی ادارت میں جاری ہوتا تھا؟

۸۔سید ظہور نے کون سا اخبار نکالا؟

۹۔ماسٹر رام چندر کس کالج سے وابستہ تھے؟

۱۰۔اردو کے پہلے صحافی جنھیں شہید کیا گیا؟

.....

## 1.6 خلاصہ

.....

ہندوستانی تاریخ میں ۱۸۵۷ء اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ انگریزوں کے خلاف ایک ایسا انقلاب تھا، جس نے فرنگیوں کی چولیں ہلا دیں۔ ہندوستانوں میں اپنے وطن پر مر مٹنے کا جذبہ زیادہ مستحکم ہوا اور آزادی کے حصول کے لئے سب کچھ قربان کرنے کی للک پیدا ہوئی۔

جنگِ آزادی کے دوران اردو اخباروں اور صحافیوں نے جو کردار ادا کئے وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ان مجاہدین میں مولوی محمد باقر اس اعتبار سے نمایاں ہیں کہ یہ اردو کے پہلے صحافی ہیں جنھیں شہادت نصیب ہوئی۔ان کا اخبار ''دہلی اردو اخبار'' جو ۱۸۳۷ء میں وجود میں آیا تھا، اس نے نہ صرف یہ کہ انگریزوں کے ظلم و زیادتی کو بے نقاب کیا بلکہ آزادی اور حرّیت کے متوالوں میں جوش و جذبہ کو ابھارنے، ان میں غیرت و حمیت پیدا کرنے اور خون کو گرمانے میں اہم کردار ادا کئے۔

مولوی باقر نے اپنے اخبار کے ذریعہ جہاں ایک طرف جنگِ آزادی کے لئے لوگوں میں جوش و جذبہ پیدا کیا وہیں ان سرکاری فیصلوں کے خلاف آواز ں بلند کیں جو لوگوں کے لئے باعثِ تکلیف ہوتے تھے۔انھوں نے ایسے فیصلوں کے خلاف مسلسل لکھنے اور اسے با قاعدہ مہم کی شکل دینے کی روایت قائم کی۔اس کے علاوہ کمپنی کی سیاسی عیاریوں، مکایوں اور دھوکا دہی کی وارداتوں پر بھی گرفت کیا کرتا تھا۔

دہلی اردو اخبار میں ادبی خبریں بھی چھپتیں تھیں۔قلعۂ معلیٰ کے مشاعرے اور وہاں پڑھی جانے والی غزلیں اخبار کی زینت بنتی تھیں۔مشاعرے کی رودادوں کو اردو صحافت میں ادبی رپورٹینگ کی اولین مثال کہا جا سکتا ہے۔چنانچہ اس اخبار نے زبان و ادب کے فروغ میں بھی خصوصی دلچسپی لی۔

مولوی باقر نے اردو صحافت کے لئے بعض اصول بھی مرتب کئے، جس کی رو سے صحافت کا پیشہ نہایت ذمہّ داری اور جوابدہی کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس میں حق وصداقت کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ صحافت عوام تک صرف خبریں پہنچانے کا وسیلہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ فکر وشعور کی تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔ مولوی باقر
نے دہلی اردو اخبار کے ذریعہ ایک ایسی تحریک کو جنم دیا جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ بعد کی اردو صحافت مولوی باقر کی روش کی ہی توسیع کہی جائے گی۔ اس لئے کہ اس نے ملک کی تعمیر وترقی میں جو رول ادا کئے اس کی حیثیت مسلّم ہے۔

.....

.....

## 1.7 معروضی سوالات کے جواب

.....

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ جامِ جہاں نما | ۲۔ ۱۹۲۲ء بمقام کلکتہ | ۳۔ مراۃ الاخبار |
| ۴۔ مولوی محمد اکبر | ۵۔ محمد حسین آزاد | ۶۔ ۱۸۳۷ء میں |
| ۷۔ نول کشور | ۸۔ جلوۂ طور | ۹۔ دہلی کالج |
| ۱۰۔ مولوی باقر | | |

.....

## 1.8 نمونہ امتحانی سوالات

.....

۱۔ مولوی باقر سے قبل اردو صحافت کی صورتِ حال پر روشنی ڈالیے۔
۲۔ مولوی باقر کے زندگی کے حالات قلمبند کیجیے۔
۳۔ جنگِ آزادی میں اردو صحافت کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
۴۔ دہلی اردو اخبار میں شائع ہونے والی خبروں کی خصوصیات بیان کیجیے۔

---

## 1.9 فرہنگ

.....

| | |
|---|---|
| آباواجداد۔ باپ دادا۔ | سکونت۔ مکان، مستقل قیام |
| علوم۔ علم کی جمع، ہنر | ترویج۔ رواج دینا۔ |
| اجتہاد۔ کوشش کرنا، جدوجہد کرنا۔ | آگہی۔ علم، خبر |

| | |
|---|---|
| دل برداشتہ۔ دل کا ہٹ جانا | قلیل۔تھوڑا |
| نامساعد۔ناسازگار | تعصب۔طرف داری |
| بیزار۔ناخوش، ناراض | فلاحی۔بھلائی، نیکی |
| مطبوعہ۔چھپا ہوا | توسط۔ذریعہ |
| مہتمم۔اہتمام کرنے والا، سربراہ | خفت۔ہلکا پن |
| بےنظیر۔بےمثال | چشمِ دید۔آنکھ سے دیکھا ہوا۔ |
| لبریز۔بھرا ہوا | تیغِ بکف۔ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے۔ |
| پسپا۔تباہ | مکتوب الیہ۔جسے خط لکھا گیا ہو۔ |
| سلاطین۔سلطان کی جمع معنی بادشاہ | ہمہ جہت۔چاروں طرف سے |
| فنِ طباعت۔چھپائی کا ہنر | مناقشات۔مناقشہ کی جمع، جھگڑا |
| منفعت۔فائدہ | استبداد۔ظلم وزور سے حکومت کرنا۔ |
| غاصب۔قبضہ | نشوونما۔بڑھنا |
| حمیت۔غیرت، شرم | روزنامچہ۔ڈائری |
| شورش۔ہنگامہ | اضطراب۔بےچینی |

---

1.10 سفارش کردہ کتابیں:

.....

۱۔ ہندوستانی اخبارنویسی (کمپنی کے عہد میں) محمد عتیق صدیقی

۲۔تاریخِ صحافت: محمد افتخار کھوکھر

۳۔تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل

۴۔اردو صحافت انیسویں صدی میں: ڈاکٹر طاہر مسعود

---

# اکائی نمبر 2۔محمد علی جوہر بحیثیتِ صحافی

## ساخت:

2.00 اغراض ومقاصد

2.1 تمہید

2.2 مولانا محمد علی جوہر کی حالات زندگی

2.3 شخصیت وسیرت

2.4 محمد علی جوہر کی قومی خدمات

2.5 محمد علی جوہر بحیثیتِ صحافی

2.6 خلاصہ

2.7 معروضی سوالات کے جوابات

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

2.9 فرہنگ

2.10 سفارش کردہ کتابیں

## 2.0: اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ:

☆عظیم مجاہدِ آزادی اور جدید اردو صحافت کے بنیاد گذار محمد علی جوہؔر کی زندگی کے حالات، ان کی شخصیت وسیرت سے بخوبی واقف ہوسکیں گے۔

☆محمد علی کی قومی اور ملّی خدمات، ان کی حب الوطنی، جنگ آزادی میں ان کے مجاہدانہ اور قایدانہ کردار سے متعلق واقفیت حاصل ہوگی۔

☆بحیثیت صحافی محمد علی جوہر نے اردو صحافت کے فروغ اور اس کے معیار کے متعین میں جو رول ادا کیا اور صحافت کے ذریعہ ملک قوم کی جو خدمات انجام دیں اس سے متعلق علم وآگہی حاصل ہوگی۔

## 2.1: تمہید

محمد علی جوہر کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی ۔وہ بیک وقت ایک قوم پرست سیاسی رہنما، بے باک صحافی، نامور شاعر، شعلہ بیاں مقرر اور مجاہد آزادی تھے۔انھوں نے اپنی پوری زندگی ملک وقوم کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ محمد علی جوہر ہندوستان کے ان سپوتوں میں سے ایک تھے جنھوں نے اپنی فکری، علمی، تخلیقی اور صحافتی صلاحیتوں کو ملک و قوم کی تعمیر اور ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے فروغ میں استعمال کیا۔بحیثیت صحافی جوہر نے اردو صحافت کو جہاں ایک طرف جدید طرز سے آشنا کیا تو دوسری طرف اپنے مضامین سے مجاہد آزادی کے خون کو گرمانے اور جنگ آزادی کی لے کو تیز کرنے کا کام لیا۔جس کے نتیجے میں انگریز مخالف لہر پیدا ہوئی۔جس کے پاداش میں کئی مرتبہ انھیں جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔

## 2.2: محمد علی جوہر کی حالات زندگی

محمد علی جوہر کی پیدائش 10 دسمبر 1878ء کو ریاست رام پور کے ایک خوشحال اور مہذب گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام عبدالعلی خاں اور والدہ آبادی بیگم تھیں، جو بعد میں بی امّاں کے نام سے مشہور ہوئیں۔محمد علی جوہر کے آبا واجداد پیشاور کے اطراف سے اسلامی فتوحات کے ساتھ پنجاب کے اکثر حصوں میں بود و باش کرتے ہوئے دہلی آئے، اور وہاں سے مراد آباد کے اغوان پور کے موضع میں وارد ہوئے۔ان کا خاندان بہ اعتبار قومیت شیخ تھا۔چوں کہ ان کے پردادا محبوب بخش خاں، اپنے ناموں کے ساتھ خاں استعمال کرنے لگے اسی مناسبت سے بعد میں ان کے خاندان کے افراد بھی اپنے ناموں کے ساتھ خاں کا اضافہ کرتے تھے۔محمد علی کے دادا علی بخش خاں اودھ کے والی ریاست رام پور میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔جوہر کے والد عبدالعلی خاں شہر رام پور میں اپنے خوش اخلاقی، مہمان نوازی اور فیاضی کے لیے مشہور تھے۔بدقسمتی سے ان کا انتقال ہیضے کے مرض سے عین عالم جوانی میں ہو گیا۔اس وقت ان کی عمر محض 32 برس تھی جب کہ محمد علی جوہر اس وقت بہ مشکل 2 برس کے تھے اور ان کے بھائی شوکت علی 5 برس کے ۔اس حادثے نے ان کی والدہ کے لیے سنگین مشکلات پیدا کر دی اور ان کو مالی بحران میں مبتلا کر دیا۔محمد علی لکھتے ہیں ''والد نے تیس پینتیس ہزار کا قرضہ چھوڑا تھا اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی جن میں سب سے بڑے کی عمر تیرہ سال کی تھی ''۔یہ حالات تھے جن میں محمد علی جوہر کے ابتدائی دن گزرے لیکن ان کی والدہ ان مشکلات اور دشواریوں کے باوجود بچوں کی اعلیٰ اور بہتر تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور انھوں نے اپنے بچوں میں قوم وملت کا جذبہ بیدار کرنے اور سپاہیانہ عزم اور بہادری کی صفات اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

واضح رہے کہ محمد علی جوہر کی والدہ آبادی بیگم جنھیں تاریخ میں بی امّاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ہندوستان کی

ایک با حوصلہ اور بہادر خاتون تھیں۔ ان کی شہرت صرف اس لیے نہ تھی کہ وہ محمد علی اور شوکت علی جنھیں عرف عام میں علی برادران کے نام سے جانا جاتا ہے، جیسے عظیم اور قابل فخر بیٹوں کی ماں تھیں، بلکہ اس لیے بھی تھی کہ انھوں نے خود تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور نوجوانوں کی قیادت کرتے ہوئے ان کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ بی امّاں ابتدا سے ہی ایسے سماجی اور سیاسی حالات و واقعات سے دوچار ہوئیں تھیں کہ قومی خدمت کا جذبہ ان کی رگ رگ میں رچ بس گیا تھا۔ ہر چند کہ اٹھائیس برس کی عمر میں وہ بیوہ ہوگئی تھیں لیکن اس کے باوجود ہمت اور استقلال سے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے بچوں کو جدید اور اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ وہ اپنے گھر کے کاموں، بچوں کی پرورش اور پاس پڑوس کے لوگوں کی خدمت اور دینی وملّی کاموں سے وابستگی کے باوجود جنگ آزادی کی جد و جہد میں مصروف رہیں۔ وہ تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں، رات گئے جلسوں میں شرکت وتقریریں کرتیں لیکن دوسری طرف مذہبی شوق اور جنون کا یہ عالم تھا کہ دیر رات تک چلنے والے ان جلسوں میں بھی فرض نماز تو کیا تہجد بھی نہ چھوڑتی تھیں۔

محمد علی جوہر نے ابتدائی تعلیم اپنی ماں بی امّاں کے زیر سایہ پائی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشرقی طرز پر قرآن مجید کی اعلیٰ اخلاقی کتابوں کی تدریس سے ہوئی۔ اس کے بعد وہ 1888ء میں مدرسہ انگریزی رام پور (موجودہ نام حامد انٹر کالج) میں داخل ہوکر جدید تعلیم کے حصول میں منہمک ہوگئے۔ بعد میں انہیں بریلی کے ایک اسکول میں منتقل کر دیا گیا، جہاں انھیں انگریزی، تاریخ اور جغرافیہ پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کی والدہ بی امّاں اگر چہ مذہبی خیال کی خاتون تھیں مگر بڑی روشن خیال، بیدار اور تعصب وتنگ نظری اور توہم پرستی سے دور تھیں۔ اس زمانے میں رام پور میں انگریزی کو کفر سمجھا جاتا تھا اور مغربی تعلیم سے عام نفرت تھی۔ اس کے باوجود بی امّاں نے اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا جو ان کے غیر معمولی ایثار، بلند عزائم اور جذبۂ خود اعتمادی کا اظہار تھا۔ جب وہ بریلی سے دسویں جماعت پاس کر گئے تو انھیں علی گڑھ بھیج دیا گیا جہاں علی گڑھ اسکول میں داخل ہوئے۔ 1894ء میں انٹرنس کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب رہے۔ 1896ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا اور دو سال بعد 1898ء میں بی اے کیا اور الہ آباد یونی ورسٹی میں اوّل رہے۔ ان دنوں یوپی اور اس کے صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں اور کالجوں کا امتحان الہ آباد یونی ورسٹی ہی لیا کرتی تھی۔ محمد علی جوہر نے اپنی تعلیمی زندگی کے کوئی آٹھ برس تک علی گڑھ میں گزارے۔ ان کا شمار اے ایم او (A.M.O.) کالج کے ذہین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ بی اے کرنے کے بعد ستمبر 1898ء میں مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ روانہ ہوگئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے لنکن کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں چار سال انگلینڈ میں مقیم رہے لیکن وہ انڈین سول سروس میں کامیاب نہ ہوسکے۔ وہ بہترین قانونی دماغ رکھتے تھے لیکن شوکت علی کے الفاظ میں ''

ان کی قسمت میں سول سرونٹ ہونا لکھا تھا نہ بیرسٹر ہونا'' آئی سی ایس کے امتحان میں ان کی ناکامی کا سبب ان کا انگریز مخالف ذہن بتایا جاتا ہے۔ چناں چہ دسمبر 1901ء میں وطن واپس آ گئے۔ اور ان کی شادی ایک عزیز عظمت اللہ خاں کی صاحبزادی امجدی بیگم سے 5 فروری 1902ء کو انجام پائی جس کے ڈیڑھ ماہ بعد مارچ 2002ء میں لندن واپس چلے گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ جدید میں بی اے آنرس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد 21 جولائی 2002ء کو رام پور واپس آ گئے۔

آکسفورڈ کے قیام کے دوران انھوں نے انگلینڈ کے علمی و ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کر لی۔ انھوں نے اس زمانے میں ایک عالمانہ اور شاندار مضمون سپرد قلم کیا تھا جس سے انگریزوں پر ان کی قابلیت کی دھاک جم گئی اور انھیں آکسفورڈ سوسائٹی کا پہلا ہندوستانی سیکریٹری مقرر کیا گیا یہ ایک ہندوستانی کے لیے اعلیٰ ترین اعزاز تھا۔ انھوں نے آکسفورڈ نورتن کے نام سے ایک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ جس کا ایک خاص کلب تھا اور کھانے پینے کا ایک خاص وضع قطع تھی۔ قیام لندن کے دوران موجودہ مختلف علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حصّہ
ّ لیتے رہے۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال بھی کھیلتے تھے اس کے باوجود حسن اور صداقت، پاکیزگی کی زندگی گزاری، ترکی ٹوپی پہنتے رہے اور نماز روزے کا اہتمام بھی کیا۔

1902ء میں جب محمد علی جوہر ولایت سے لوٹے تھے انھیں فوراً ہی نواب رام پور نے اسٹیٹ ہائی اسکول کا پرنسپل بنا دیا اور ریاست رام پور کے چیف ایجوکیشنل آفیسر کے عہدے پر مقرر کر دیا لیکن اس عہدے پر محض ایک سال تک ہی رہ سکے۔ 1903ء میں ریاست بڑودہ میں کمشنر مقرر ہوئے اور اس عہدے پر 1910ء تک رہے۔ انھوں نے جس محنت اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیے وہ اپنے آپ میں مثال ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی دوسرے ریاستوں میں اعلیٰ و منفرد عہدے پیش کیے گئے لیکن انھوں نے ان تمام عہدوں کو ٹھکرا دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد آئندہ قوم و ملت کو غلامی و ظلم و جبر سے آزادی دلانا تھا۔ اس لیے خدمت قوم اور وطن کے فلاح و بہبود کے مقدس جذبے نے انھیں ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں اور حوصلوں کے اظہار کے لیے صحافت کا پیشہ اختیار کیا چناں چہ بڑودہ کی ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد کلکتہ چلے گئے جہاں 14 جنوری 1911ء کو اپنے انگریزی ہفتہ وار ''کامریڈ'' کا اجراء کیا۔ محمد علی جوہر نے صحافت کے ذریعہ ملک و ملت کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ نا قابل فراموش ہیں۔ انھوں نے پوری جرأت اور بے باکی سے حکومت وقت پر تنقید کی اور برطانوی حکومت کو چیلنج کیا۔ وہ برطانوی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے اور ان راستوں کو حتی الامکان بند کر دینا

چاہتے تھے جہاں سے اسے کسی طرح مدد مل سکتی تھی۔ برطانوی حکومت کے لیے مولانا کی یہ سرگرمیاں زبردست خطرہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا پر حکومت نے شروع ہی سے کڑی نظر رکھی اور انھیں نظر بند اور گرفتار کر کے ان کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی جس کا سلسلہ 26 رمئی 1915ء کو نظر بندی سے شروع ہوا انھیں کئی جگہ نظر بند رکھا گیا 23 رستمبر 1915 کو انھیں ننداؤں چھندواڑا بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد 8 رجون 1919ء کو انھیں بیتول جیل منتقل کر دیا گیا جہاں سے آخر دسمبر میں رہا کر دیے گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کئی سال قید و بند میں گزارے۔ پہلی مرتبہ 1914 سے 1919 تک نظر بند اور اسیر رہے اور دوسری مرتبہ 14 ستمبر 1921 سے 29 اگست 1923 تک جیل کے اندر رہے انھیں جس جرم میں جیل میں ڈالا گیا تھا وہ یہ تھا کہ انھوں نے خلافت کانفرنس منعقدہ کراچی میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسلمانوں کے لئے برطانوی فوج میں ملازم (نیا) بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کرنا قطعی حرام ہے۔

مولانا نومبر 1930ء میں وائسرائے کی دعوت پر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن پہنچے۔ ان پر اس وقت امراض کا غلبہ تھا۔ بینائی میں فرق آ چکا تھا۔ پاؤں میں ورم آ گیا تھا۔ ذیابطیس کا پرانہ عارضہ الگ تھا۔ قلب کی حالت بھی درست نہ تھی پھر بھی انھوں نے سات ہزار میل کا بری و بحری سفر طے کر کے گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور اپنی علالت کے باوجود خاصی طویل تقریر کی اور تمام اہم متعلقہ مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے جرأت اور بے باکی کے ساتھ کیا۔ ”جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، ہندوستان کی آزادی کا تعلق ہے اور ہندوستان کے فلاح و بہبود کا تعلق ہے، میں اوّل ہندوستانی ہوں، دوم ہندوستانی ہوں، آخر بھی ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے علاوہ کچھ نہیں ہوں میں آپ سے ڈومینین اسٹیٹ مانگنے نہیں آیا ہوں............ مکمل آزادی کے سوا قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں ......... ہم امن، دوستی اور آزادی کے حصّوں کے خاطر یہاں آئے ہیں لیکن ایسا نہ ہوا تو واپس جا کر ہم مجاہدین کے انھیں صفوں میں نظر آئیں گے جہاں ہم آپ سے پہلے تھے۔

آج جس مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنے وطن کو صرف اسی صورت میں واپس جانا چاہتا ہوں کہ ارمغان آزادی میرے ہاتھ میں ورنہ غلام ملک واپس نہیں جاؤں گا اور اس کے بجائے غیر ملک میں مرنا پسند کروں گا بشرطیکہ وہ آزاد ہو۔ ہمیں اگر ہندوستان میں تم آزادی نہ دوگے تو میرے لیے قبر تو تمھیں دینی ہی پڑے گی۔ آخر کار 4 جنوری 1931ء کو یہ بہادر مجاہد راہ ملک عدم سدھار گیا، 5 جنوری کی شام کو میڈ ننگ ٹاؤن ہال میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور 24 جنوری کو بیت المقدس میں دفن کیے گئے۔

## 2.3: شخصیت اور سیرت

مولانا محمد علی جوہر کی دیو پیکر شخصیت تھی۔ ان کی زندگی کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کی عظمت اور بلندی کا واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے کردار اور سیرت میں کچھ ایسی امتیازی خوبیاں تھیں جو کم لوگوں کے حصّے میں آئی ہیں۔ وہ اپنے معاصرین میں اس لحاظ سے سب سے نمایاں اور مختلف نظر آتے ہیں اور اپنی انفرادی شخصیت کا واضح اثر قائم کرتے ہیں۔ ان کی زندگی جن کارناموں سے عبارت ہے انھیں ان کے کردار اور سیرت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

محمد علی جوہر نے یقیناً کچھ انسانی کمزوریاں بھی تھیں جن سے کوئی انسان خواہ کتنا ہی عظیم اور غیر معمولی کیوں نہ ہو ،مبرّ ی نہیں ہوسکتا۔ اس کے باوجود ان کے کردار میں استقامت اور پائداری پائی جاتی ہے اور اصول و آدرش کے لیے مر مٹنے کا جذبہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ قدرت کی طرف سے زبان و علم کی بے پناہ صلاحیتیں جو حق وصداقت کی خدمت کے لیے وقف رہیں، ان کی شخصیت کی انفرادیت، عظمت اور بلندی کا واضح ثبوت ہیں۔

محمد علی جوہر ایک بے حد ذہین شخص تھے۔ ان کی ذہانت اور طباعی پر ان کے تمام ہی سیرت نگاروں نے زور دیا ہے۔ ان کی سرشت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ برجستگی اور حاضر جوابی میں محمد علی کا جواب نہ تھا۔ اسی طرح ان کی تنک مزاجی ،شعلہ بیانی اور جذباتیت بھی مشہور تھی۔ مگر دوسری طرف ہمدردی، غم گساری کا پتلا تھے۔ ان کی حق گوئی اور صاف بیانی کی ایک دنیا قائل ہے۔

محمد علی گاندھی جی کو اپنا سیاسی سردار تسلیم کرتے تھے اور ان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ مگر دیکھیے کہ ایک موقع پر وہ کس طرح برہم ہوتے ہیں اور ان کی شعلہ مزاجی کیا گل کھلاتی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب گاندھی محمد علی کی رہائش گاہ پر مقیم تھے اور انھوں نے محمد علی سے مشورہ کیے بغیر اکیس دن کا برت رکھ لیا۔

محمد علی جوہر کو تقریر پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ ان کی قوت تقریر اور زور خطابت کا اعتراف تمام لوگوں نے کیا ہے۔ وہ ایسے مقرر تھے کہ ہزاروں کے مجمعے پر چھا جایا کرتے تھے جب تقریر کرتے وقت وہ جوش میں آجاتے تھے تو ان کا گلا رندھ جاتا تھا، آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ لیکن تقریر کا سیلاب نہ تھمتا تھا۔

محمد علی جوہر کو بہت ساری نامور شخصیتوں نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کا مشہور مقولہ ہے ’’ مولانا محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا‘‘، مولانا کی زبان برق کی زبان تھی اور ان کا قلم میکالے کا قلم تھا۔ مولوی عبدالحق نے مولانا کے اوصاف اور کمالات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت کو آتش فشاں، پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی ہے جس کی عظمت وشان تو ہے مگر خطرہ وتباہی بھی موجود ہے۔ اردو کے شعرا میں اقبال، تلوک چند محروم، جوش، ظفر علی خاں اور آل احمد سرور نے ان کی خدمات اور کمالات کے اعتراف میں خصوصیت کے ساتھ نظمیں لکھیں اور انھیں خراج تحسین پیش کیا

ہے جس کے مطالعہ سے مولانا کی شہرت وشخصیت کی تفہیم آسان ہوجاتی ہے۔

## 2.4: محمد علی جوہر کی قومی وملّی خدمات

محمد علی جوہؔر کا نام ہندوستان کی جنگِ آزادی کا ایک ایسا حوالہ ہے جس کے ذکر کے بغیر تحریکِ آزادی کی کوئی بھی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ جوہؔر نے طالب علمی کے زمانے ہی سے قومی اور ملکی معاملات سے دلچسپی لینی شروع کردی تھی اور ابتدا ہی سے سیاست کی طرف مائل تھے۔ انھیں احساس تھا کہ ان کی توانائیاں ملک وملت کے لیے زیادہ بہتر طور پر کام آسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑودہ کی ملازمت سے منسلک رہنے کے باوجود ان کی سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں اور اس دوران ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے علاوہ لاہور سے شائع ہونے والا اخبار ''آبزور'' اور ''ہندوستان ریویو'' جیسے موقر انگریزی اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ ان طویل مضمون Thought on Present Discontent جو 1907ء میں ٹائمز آف انڈیا بمبئی میں بالقسط شائع ہوا بطور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس مضمون کی اہمیت اور مقبولیت اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ اسے ''انڈین اسکٹیڈ یڈ'' میں بھی نقل کیا گیا اور یہ ایک علاحدہ کتابچے کی شکل میں بھی شائع ہوا۔ یہ مضمون دراصل ہندو مسلم کشمکش کے پس منظر میں لکھا گیا تھا جو اکتوبر 1905ء میں لارڈ کرزن کے تقسیم بنگال احکام جاری کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ مضمون اس وقت کے مسلم سیاسی ذہن کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے، جس کی نمائندگی مسلم لیگ کے ذریعہ ہورہی تھی۔ یہ حقیقت واضح ہے کہ انگریزی اقتدار کے بعد مسلمان تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے بالکل پچھڑ چکے تھے۔ سرسید نے مسلمانوں کو ان کی پسماندگی سے نکالنے کے لیے انھیں انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا اور 1875ء میں مدرسۃ العلوم (اے۔ایم۔او) کالج کی بنیاد ڈالی اور اس کے نتیجے میں کوئی تیس برسوں کے بعد مسلم تعلیم یافتوں کی ایک ایسی نسل وجود میں آئی جس کے اندر اپنے حقوق کے تحفظ وبقا کے لیے اپنی سیاسی تنظیم کا واضح شعور پیدا ہوا۔ اسے اس قومی بیداری کا ایک جزو بھی قرار دے سکتے ہیں جس کے نتیجے میں 1885ء میں کانگریس کا وجود عمل میں آیا۔ سرسید احمد خاں کی رہنمائی میں مسلمان اس وقت سیاست سے الگ رہ کر تعلیمی میدان ہی میں اپنی ترقی کے لیے کوشاں رہے ان میں ملّی تنظیم کا شعور اس وقت جاگا جب مسلم نوجوانوں کی ایک نسل جدید تعلیم سے آراستہ ہوکر مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے باہر آئی۔ مسلم لیگ کا قیام دراصل اسی احساس وشعور کا نتیجہ اور عملی اظہار تھا۔ تقسیم بنگال نے لیگ کے قیام کے لیے خصوصاً ایک مضبوط محرک کا کام کیا اس تقسیم نے بنگال میں مسلمانوں کو غالب اکثریت دے دی اور اس کے بعد ہی ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ اس صوبے میں اپنے حقوق کی نگہداشت کے لیے ایک سیاسی جمعیت ملّیہ قائم کریں۔ یہی جمعیت ڈھاکا کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بعد

1906ء میں مسلم لیگ کے نام سے وجود میں آئی۔ جن شخصیتوں نے اس تنظیم کی بنیاد ڈالی اور اس کا دستور تیار کیا ان میں نواب وقار الملک، مظہر الحق، سید وزیر حسن کے ساتھ مولانا محمد علی جوہر کے نام بطور خاص شامل ہیں۔

مولانا محمد علی کے پیش نظر قوم و وطن کی خدمت کے ساتھ مسلمانوں کی ملّی تنظیم کا پیچیدہ مسئلہ بھی تھا وہ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں پاتے تھے بلکہ وسیع تر انسانی نقطۂ نظر کے تحت ملّی اور وطنی مسائل کے ساتھ بین الملّی مسائل سے دلچسپی لینا جائز سمجھتے تھے۔ اور بالکل سوچے سمجھے ہوئے نظریے کے تحت علاقائی اور غیر علاقائی معاملات اور مسائل میں اشتراک اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے اپنی سیاسی، قومی اور ملّی سرگرمیوں کو اسی بنیاد پر آگے بڑھایا اور اس پر زور دیتے رہے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں اس پر شاہد ہیں انھوں نے اسی مقصد اور نقطۂ نظر کے تحت صحافت کو اپنایا اور اس کے ذریعہ ملک و ملت کی خدمت انجام دی۔ اس سلسلے میں ان کے یہ خیالات توجہ طلب ہیں:۔

**''ہم کسی کے جانب دار نہیں ہیں اور سب کے ساتھ ہی ہیں۔ ہم مختلف فرقوں اور مذاہب کے روز افزوں اختلافات کے خطروں کو بخوبی محسوس کرتے ہیں اور دلی آرزو ہے کہ ہندوستان کے سیاسی نظام کے مختلف اجزاء میں بہتر تعلقات پیدا ہوں۔''**

محمد علی جوہر ہندوستان کے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان اتحاد اور اتفاق پیدا کرنا چاہتے تھے اسے دوسرے لفظوں میں ہندو مسلم اتحاد کا نام دیا جا سکتا ہے۔ الہ آباد کانفرنس منعقدہ 11 مئی 1921ء کے صدارتی خطبے میں ان کے یہ الفاظ قابل غور ہیں:۔

**''میں نے ہمیشہ اتحاد کی حمایت کی اور میرے اخبار کا نام کامریڈ اس پر دلالت کرتا ہے ..... سوراج میرا مذہب ہے اور میں آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ سوراج حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔''**

محمد علی جوہر ایک مقبول عوامی رہنما اور سیاسی لیڈر تھے۔ جنگِ آزادی کی جدوجہد میں جس سرفروشانہ جذبے کے ساتھ شامل ہوئے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے پاداش میں متعدد مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن ان کے حوصلے اور عزائم میں ذرّہ برابر بھی کمی واقع نہ آئی، محمد علی جوہر اپنی شخصیت اور جذبہء ایثار کے سبب ہر خاص و عام میں محبوب تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی قومی مفادات کے تحفظ اور ملّی فلاح و صلاح کے لئے وقف کر دی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ ہندو و مسلمان دونوں کے نزدیک محترم رہے۔ چنانچہ جب آپ پہلی مرتبہ 1919ء میں جیل سے رہا

ہوئے تو آپ کا جگہ جگہ شاندار استقبال ہوا۔آپ جیل سے رہا ہوکر سیدھے امرتسر پہنچے جہاں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے ۔راستے میں آپ جس اسٹیشن سے گزرے ہزاروں کی تعداد میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپ کا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔جالیاں والا باغ کے پاس پہنچتے ہی آپ نے شہیدوں کے اعزاز میں ننگے سر ہوکر ایک دردانگیز تقریر کی۔امرتسر کانگریس نے 1857ء کے بعد پہلی مرتبہ ہندو مسلم اتحاد کا روح پرور، زندہ اور جیتا جاگتا نقشہ پیش کیا اور مسلمان جو، اب تک سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھے ان کے لیے ملکی سیاست میں شرکت کی راہ ہموار کی۔محمد علی نے اس سلسلے میں قائدانہ رول ادا کیا اور اس کے بعد ہی ایک مسلم رہنما اور قومی لیڈر کی حیثیت سے مسلّم طور پر روشناس ہوئے۔

محمد علی برطانوی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے مسلم ممالک پر برطانیہ کے بڑھتے ہوئے اثر واقتدار کو ختم کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ان کے خیال میں ان علاقوں میں انگریزوں کا بڑھتا ہوا اقتدار ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں رکاوٹ پیدا کرسکتا تھا، اسی لیے مسلمانوں کی حکومت برطانیہ سے کسی ایسی وفاداری کو پسند نہیں کرتے تھے جو انگریزوں کی سامراجی عزائم کی تکمیل میں معاون ہو اور ہندوستان کو اس کی آزادی کی منزل سے دور کردے۔محمد علی راسخ العقیدہ مسلمان تھے مگر سیاست کی دنیا میں انھوں نے ایک نیشنلسٹ مسلمان کی حیثیت سے قدم رکھا۔ان کے نزدیک جب تک ہندو اور مسلمان دونوں متحد ہوکر ایک سیاسی مقصد کے لیے کام نہیں کریں گے اس وقت تک ہندوستان آزاد نہیں ہوسکتا لیکن اس کے پہلو بہ پہلو وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ دونوں اپنی شناخت برقرار رکھیں ۔مولانا محمد علی کے ہندوستان کے سیاسی افق پر نمودار ہونے سے پہلے ہندوستان کی سیاست صرف لچھے دار تقریروں اور عاجزانہ طور پر اپنی مانگیں پیش کرنے تک محدود تھیں۔لیکن مولانا کی آمد نے ہندوستانی سیاست کی ہوا کا رخ یکسر بدل دیا۔وہ گفتار کے نہیں کردار کے غازی تھے اور اپنے حقوق کے لیے لڑنے اور جان کی بازی لگا دینے کے لیے تیار رہتے تھے انھوں نے ہندوستانی سیاست کو مصلحت پسندی کے دائرے سے باہر نکال کر میدان کارزار میں لا کھڑا کیا۔

اکتوبر 1912ء میں بلقان کی سلطنتوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کردی۔اس بغاوت کے پسِ پشت بعض مغربی طاقتوں خصوصاً حکومتِ برطانیہ کا ہاتھ تھا۔ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں سے ہمدردی کا اعلانیہ اظہار کیا اور ان کی حمایت میں ہندوستان میں ایک تحریک شروع کردی۔ہندوستانی مسلمان جو بہر حال آزاد نہیں تھے، ترکوں کی صرف اخلاقی اور مالی مدد ہی کرسکتے تھے انجمن ہلالِ احمر کے نام سے ہندوستان بھر میں انجمنیں قائم کی گئیں جنھوں نے ترکوں کی امداد کے لیے روپیہ اکٹھا کرنا شروع کیا۔مولانا محمد علی جوہر نے ہندوستانی مسلمانوں میں ترکوں

سے ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے اور بلقان فنڈ میں چندہ دینے کی ترغیب کے سلسلے میں بہت نمایاں کام کیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی ایما پر ترکی میں ایک طبی مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا محمد علی نے طبی مشن کے لیے روپیہ فراہم کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ انھوں نے اکتوبر 1912ء کے آخری ہفتے میں کامریڈ میں اس کے لیے اپیل شائع کی اور نومبر کے آخر تک دو لاکھ روپے جمع ہو گئے طبّی مشن اپنے پروگرام کے مطابق 15 دسمبر 1912ء کو بمبئی سے ترکی کے لیے روانہ ہو گیا۔

ابھی بلقان کی جنگ ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے سامنے دوسرا مسئلہ آ گیا۔ 2 جولائی 1913ء کو کانپور کے محلّہ مچھلی بازار کی مسجد کا ایک حصہ مقامی مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود وہاں کی میونسپلٹی کے ارباب حل وعقد نے پولیس کی مدد سے شہید کر دیا۔ مولانا محمد علی نے یوپی کے لفٹیننٹ گورنر سر جیمس مسٹن کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ مداخلت کر کے مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیں۔ لیکن مسٹن نے نہ صرف مداخلت کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ضلع کے حکام کی کاروائی کی تائید بھی کی۔ اگست کے مہینے میں مولانا آزاد سبحانی کی قیادت میں کانپور کے مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا، جس میں یہ طے پایا کہ مسجد کے منہدم شدہ حصے کو اس کی پرانی اینٹوں سے از سر نو تعمیر کیا جائے۔ مسلمانوں کے ایک بڑے مجمع نے، جس میں بچّے اور بوڑھے بھی شامل تھے، جائے وقوع پر پہنچ کر مسجد کی تعمیر شروع کر دی۔ مجسٹریٹ نے پولیس کو فائرنگ کا حکم دیا۔ ان گنت لوگ شہید ہوئے اور بے شمار زخمی۔ جو باقی بچے وہ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیے گئے۔ فائرنگ کے پانچ روز بعد جیمس مسٹن کانپور آئے اور پولیس کے ان سپاہیوں کو، جنھوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی، خوشنودی کی سند عطا کی۔

جیمس مسٹن کے اس جابرانہ اور قاہرانہ رویّے نے پورے برصغیر کے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑا دی۔ مختلف مقامات پر احتجاجی جلسے ہوئے اور مسلم پریس نے حکومت کے رویے کے خلاف ایک زبردست مہم شروع کر دی۔ مولانا محمد علی ہندوستان میں انگریزی حکومت کے نمائندوں سے مایوس ہو کر وزیر حسن سکریٹری مسلم لیگ کے ہمراہ انگلستان گئے اور وہاں اس مسئلے کے متعلق احتجاج کیا، مضامین لکھے، تقریریں کیں، ارباب حکومت، ممبران پارلیمنٹ، ارکان کابینہ سے ملاقات کی اور ہر طرح سے انھیں اس مسئلہ کی نزاکت بتائی اور اس کے نتائج سے باخبر کیا۔

آخر مولانا کی کوششیں بار آور ہوئیں، لندن سے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کے نام احکامات صادر ہوئے اور انھوں نے خود کانپور جا کر اس مسئلے کا تصفیہ کیا۔ مولانا کی واپسی سے قبل ہی تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور مسجد کے منہدم شدہ حصے کے از سر نو تعمیر کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ جب مولانا انگلستان سے واپس آئے تو ان کا ہندوستان میں ہر

جگہ شان دار استقبال کیا گیا۔

جولائی 1914ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ حکومت ہند جنگ کے آغاز ہی سے مسلم رہنماؤں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ ترکی کی جنگ میں شرکت نے مسلمانوں کے اضطراب میں اضافہ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی مسلم رہنماؤں کے سلسلے میں حکومت کے شکوک بھی بڑھتے گئے۔ اسی زمانے میں ''قانون تحفظِ ہند'' Defence of Indian Act پاس کیا گیا اور سب سے پہلے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اس کی زد میں آئے۔ 17 مئی 1915ء کو علی برادران کو نظر بندی کا حکم ملا اور وہ مہرولی میں نظر بند کر دیے گئے۔ اس موقع پر مولانا علی نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا:۔

''یہ ایک پیغمبرانہ سنت ہے جس کی ادائیگی کے لیے خداوند کریم نے اپنے فضل سے مجھے منتخب کیا۔''

مہرولی، دہلی سے صرف 12 میل کی دوری پر واقع تھا، اس لیے دہلی سے ہزاروں آدمی علی برادران سے ملنے آیا کرتے تھے۔ حکومت یہ کب برداشت کر سکتی تھی اس لیے اس نے علی برادران کو لینس ڈاؤن بھیج دیا۔ وہاں پر اور بھی زیادہ پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ان کا قلم بھی نظر بند کر دیا گیا اور وہ ''ہمدرد'' کے لیے مضامین لکھنے سے بھی محروم ہو گئے۔ کامریڈ تو بند ہی ہو چکا تھا، اب ہمدرد بھی حکومت کے عتاب کی زد میں آ گیا۔ لینس ڈاؤن سے جلد ہی علی برادران کو چھندواڑہ منتقل کر دیا گیا جہاں وہ تقریباً تین سال تک نظر بند رہے۔

اسی زمانے میں یہ افواہ پھیلائی گئی کہ مولانا محمد علی نے امیر کابل کو ایک خط لکھا ہے جس میں انھیں ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور امیر کابل نے اس خط کو حکومت ہند کے پاس بھیج دیا ہے۔ علی برادران نے ان الزامات کی تردید کی اور حکومت سے درخواست کی کہ وہ ان خطوط کو دکھائے مگر حکومت نے ان کی یہ درخواست مسترد کر دی۔ بعدازاں حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے علی برادران سے 1918ء میں ملاقات کی۔ علی برادران کے پوچھنے پر کمیٹی کے ممبران نے ان خطوط سے لاعلمی ظاہر کی۔ اس کمیٹی نے علی برادران کی نظر بندی کو تو جائز قرار دیا، مگر اس نے یہ سفارش کی کہ اب انھیں رہا کر دیا جائے۔ لیکن حکومت نے یہ سفارش منظور نہیں کی۔ مسز اینی بیسنٹ نے بھی علی برادران کی رہائی کے لیے وائسرائے سے ملاقات کی۔ لیکن ان کوششوں کا اثر الٹا ہی ہوا، اور رہا کرنے کے بجائے انھیں چھندواڑہ سے اسّی میل دور بیتول میں قید کر دیا گیا۔

محمد علی ترکِ موالات کی مہم کے آغاز میں مہاتما گاندھی کو ساتھ لیے علی گڑھ گئے اور کالج کے ٹرسٹیز سے مطالبہ کیا

کہ کالج کے لیے سرکار سے امداد لینا بند کریں اور اسے قومی تعلیم کا مرکز بنائیں۔ یہ مطالبہ منظور نہ ہوا اور محمد علی کو قومی تعلیم کے تخیل کو روبہ عمل لانے کے لیے ایک علاحدہ یونیورسٹی قائم کرنی پڑی جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام دیا گیا۔ یہ یونیورسٹی مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی کوششوں سے اکتوبر 1920ء میں علی گڑھ میں وجود میں آئی۔

مولانا علی نے ترکِ موالات کی تحریک کو جس جذبۂ جہاد اور جوش حرّیت کے ساتھ آگے بڑھایا وہ جد و جہد آزادی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ ان کی تقریریں، ان کی آتش بیانی اور شعلہ نوائی پر گواہ ہیں۔ عتیق صدیقی نے غلط نہیں لکھا ہے کہ تحریکِ ترکِ موالات میں جوں جوں تیزی پیدا ہوئی محمد علی کی آتش نوائی بھی بڑھتی گئی۔ محمد علی نے خلافت مشن میں ناکام ہونے اور انگلستان سے واپسی کے بعد ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ:۔

**''اسلام کی آزادی کے لیے ہندوستان کی آزادی قطعی ضروری ہے۔''**

اس کے ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو یہ مشورہ دینا بھی ضروری سمجھا کہ وہ اپنے مسائل حل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جائیں اور عالمِ اسلام اور ہندوستان کو مغربی اور برطانوی استعمار کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے سرگرم عمل ہوں۔ محمد علی کو شدّت سے احساس تھا کہ ملک کی مختلف ملّتوں کے فرقہ وارانہ مفادات کو ہندوستان کے برتر و اعلا مفادات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ انھوں نے ترکِ موالات کی تحریک میں جو جوش اور سرگرمی دکھائی اس کا اصل سبب یہی ہے۔ ترکِ موالات کی تحریک کی ابتدا کرتے ہوئے تحریکِ خلافت کے علم بردار کی حیثیت سے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنا ضروری سمجھا۔

تحریک موالات کوئی دو سال تک پورے زور و شور سے چلتی رہی۔ جمعیۃ العلمائے ہند نے تحریک کی حمایت میں باضابطہ فتویٰ جاری کیا اور ترکِ موالات کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار دیا۔ بہر حال اس تحریک کے دوران لاکھوں ہندو مسلمان سکھ عیسائی جیل گئے۔ تحریک نے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں میں کچھ ایسا اشتعال اور جوش و خروش پیدا کر دیا تھا کہ بقول مولانا محمد علی انقلاب فرانس کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انگریزی راج ختم ہو چکا ہو۔ مگر چوری چورا کے تشدّد آمیز واقعے کے بعد مہاتما گاندھی نے اچانک تحریک کو ختم کر دینے کا اعلان کر دیا۔ حالاں کہ ابھی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ گاندھی جی کے اس اقدام نے محمد علی اور دوسرے لیڈروں اور کارکنوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ حکومت کو بھی اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ اس نے گاندھی جی کو قید میں ڈال دیا۔ ترک موالات کی تحریک نے حکومت کے لیے شدید خطرات پیدا کر دیے تھے۔ تحریک کے خاتمے کے بعد حکومت نے بڑی ہوشیاری سے ہندو مسلم اتحاد میں دراڑ

پیدا کرنے کی کوشش کی اور ڈاکٹر مونجے کی سنگھٹن اور سوامی شردانند کی شدھی تحریکوں نے زور پکڑنا شروع کیا۔ یہ خالص فرقہ پرستانہ تحریکیں تھیں جن کے ردّعمل میں ڈاکٹر کچلو کی تبلیغ و تنظیم کی تحریک نے سر اٹھانا شروع کیا۔ یہ تحریکیں ملک و قوم کے مفاد کے خلاف تھیں چناں چہ مولانا محمد علی نے جن کی سرگرمیوں کا مقصد ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینا تھا، تبلیغ و تنظیم کی تحریکوں کی شدّت سے مخالفت کی۔ مہاتما گاندھی نے اس زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے پیش نظر مولانا کی رہائش گاہ پر اکّیس دن کا برت رکھا۔

ستمبر 1923ء میں مولانا کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ آپ نے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں جو 26 دسمبر 1923ء کو جنوبی ہند کے مقام کرکانڈا میں منعقد ہوئی تھی، اپنی صدارتی تقریر میں ہندو مسلم اتحاد پر بالخصوص زور دیا اور اس بات کی بجا طور پر تلقین کی کہ ہمیں ہندوستان کے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے قومی و ملکی مفاد کی خاطر سارے جھگڑوں کو پسِ پشت ڈال دینا چاہیے۔ انھوں نے حصولِ اتحاد کے لیے ان تعصّبات کو خیر باد کہنے کا مشورہ دیا جو اتحاد کی راہ میں حائل اور باہمی نفاق کا باعث ہیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ بغیر باہمی اتحاد و عمل کے ہندو مسلمان کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مولانا محمد علی نے ملکی و ملّی اتحاد کے سلسلے میں جو کوششیں کیں وہ ان کے ہم عصر سیاسی رہنماؤں میں انھیں واضح طور پر ممتاز کرتی ہیں۔ مولانا کا ایک اہم ترین کارنامہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام (29 اکتوبر 1920ء) ہے۔ جامعہ تحریک ترکِ موالات کے دوران ایک آزاد یونیورسٹی کی شکل میں وجود میں آئی۔ اس کا افتتاح شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن نے فرمایا۔ مولانا محمد علی اس کے پہلے شیخ الجامعہ اور حکیم اجمل خاں امیر جامعہ مقرر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ جامعہ (نیشنل مسلم یونیورسٹی) کا خاکہ دراصل حکیم اجمل خاں صاحب نے پیش کیا۔ ویسے اسے واقعی وجود مولانا محمد علی کی کوششوں نے عطا کیا۔ جامعہ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دنیاوی علوم کے ساتھ دینی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کا ذریعہ تعلیم اردو بھی ہے۔ نیز اس کی بنیاد خدا پرستی، ملّت پروری اور وطن دوستی پر رکھی گئی ہے۔

جامعہ ملیہ اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے ہمارے قومی تعلیمی اداروں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور مولانا محمد علی کی ایک ایسی یادگار ہے جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

## 2.5: محمد علی جوہر بحیثیتِ صحافی

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کے ہندوستان میں سیاسی، سماجی، ادبی، اصلاحی اور صحافتی سطح پر جو شخصیتیں ابھریں اور جنھوں نے تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے ان میں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو،

ظفر علی خاں، مولانا آزاد، حسرت موہانی کے علاوہ محمد علی جوہر کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک اردو صحافت کی تاریخ اور ارتقا کا تعلق ہے محمد علی جوہر سے قبل اردو صحافت کی ایک متمول روایت موجود ہے۔ اس روایت میں محمد علی جوہر کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی اپنی صحافتی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ محمد علی جوہر نے باضابطہ اخبار اور رسائل نکالنے سے قبل ہندوستان و برطانیہ کے انگریزی اخبارات میں مضامین لکھ کر اپنی انگریزی دانی کا ثبوت پیش کر دیا تھا۔ جوہر بنیادی طور پر ایک صحافی ہی تھے، یہی سبب ہے کہ بڑودہ کی ملازمت کو تج کر انھوں نے زیادہ وسیع دائرے میں ملک وملّت کی خدمت انجام دینے کی غرض سے باضابطہ صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا اور اس خیال، خواہش اور مقصد کے تحت وہ کلکتہ گئے جو ان دنوں ملک کا پایۂ تخت تھا اور وہاں سے 14 جنوری 1911ء کو اپنے انگریزی ہفتہ وار اخبار ''کامریڈ'' کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ اخبار کے اداریے میں اس کے اغراض ومقاصد کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> **''ہم کسی کے جانب دار نہیں ہیں سب کے ساتھی ہیں۔ ہم مختلف فرقوں اور مذاہب کے روز افزوں اختلافات کے خطروں کو بخوبی محسوس کرتے ہیں اور ہماری دلی آرزو ہے کہ ہندوستان کے سیاسی نظام کے مختلف اجزا میں بہتر تعلقات پیدا ہوں۔''**

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ صحافت کا مقصد وسیع پیمانے پر ملک وقوم کی خدمت انجام دینا تھا۔ یہ درست ہے کہ مولانا محمد علی نے انگریزی اخبارات میں مضامین ضرور لکھے تھے لیکن عملی صحافت کا کوئی تجربہ نہیں تھا، اس کے علاوہ ان کی مالی حالت بھی اچھی نہیں تھی، وسائل کی کمی کے باعث وہ خبروں کا کوئی ایسا نظام تیار کرنے سے قاصر تھے، جو براہ راست ان تک پہونچتی یا ان کی وہ تصدیق کر پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ خبروں کے لئے ان انگریزی اخبارات و ذرائع کا سہارا لینا پڑتا تھا جو حکومتِ وقت کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے شائع کئے جاتے تھے۔ ہر چند کہ انھیں شروع میں اخبار نویسی کا کوئی خاص تجربہ نہ رہا ہو لیکن وہ عوام کے مزاج اور خبروں کی نبض کے علاوہ ایک صحافی کی ذمہ داریوں سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے نزدیک صحافت ایک اہم پیشہ تھا جس کا مقصد عوام کو حالاتِ حاضرہ کے حالات سے واقف کرانے کے علاوہ ان کی ذہنی وفکری تربیت کرنا بھی تھا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اخبار نویسی کے سلسلے میں انھوں نے ایک باضابطہ اخلاق مرتب کر رکھا تھا۔ جس کا پتہ ان تحریروں سے چلتا ہے جو انھوں نے اپنے شناسا نظام الدین کو خط کی شکل میں مشورے طور پر بھیجا تھا، جس میں یہ تاکید کی گئی تھی کہ اخبار ذاتیات سے پاک ہونا چاہیے، اس میں عبارت

آرائی نہیں ہونی چاہیے۔اخبار مذہبی بحث سے مبرا ہونا چاہیے،اخبار کا مقصد اپنی قوم کو نقصان نہیں پہونچانے کے ساتھ دوسری قوم کو بھی نقصان سے پرہیز کرنا چاہیے وغیرہ۔محمد علی جوہر کے دس نکاتی ضابطہ اخلاق ان کی صحافتی بالغ نظری اور فنی تقاضوں سے آگہی کا پتا دیتے ہیں۔اخبار کو ذاتیات سے مبرا اور خبر میں معروضیت پر اصرار کرنا اردو صحافت کو ایک نئے تقاضے سے آشنا کرنا تھا اس لیے کہ اس سے قبل اردو صحافت کی جو روایت ملتی ہے اگر بعض کو منہا کر دیا جائے تو یہ ذاتی پسند و ناپسند، جذباتیت اور رنگین عبارت آرائی سے پُر نظر آتی ہے۔اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اخبار نویس کے لیے اپنا ایک نظریہ رکھتے تھے۔

مولانا محمد علی نے اپنے مشہور انگریزی ہفتہ وار، دی کامریڈ the comrade میں متذکرہ اخلاقی ضابطے کا عملی نمونہ پیش کیا اور اپنے پہلے ہی شمارے سے انگریزی اخبارات میں اپنی ایک جگہ بنالی۔کامریڈ کے اجراء کے ضمن میں ان کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں:۔

''میں نے جب 1910 میں ریاست بڑودہ کی ملازمت سے اس نیت سے علاحدگی اختیار کی تھی کہ اس سے زیادہ وسیع دائرے میں قدم رکھ کر ملک وملت کی خدمت کیا کروں تو کامریڈ نکالنے کے لیے کلکتہ گیا اس وقت یہ خیال میرے دل میں تھا کی انگریزی ہفتہ وار حکومت کی خدمت میں عرض حال کے لیے ہو اور ہندوستان کی دوسری ملّتوں کو بھی ملّتِ اسلامیہ کے افکار و مطامح سے اس کے ذریعے سے باخبر رکھا جائے اور ایک حد تک ہندوستان سے باہر کی اسلامی اور غیر اسلامی دنیا کو بھی ان افکار اور مطامح سے آگاہ کیا جاتا رہے۔'' (مضامین محمد علی)

اس اقتباس سے محمد علی جوہر کے صحافتی مقاصد واضح ہو جاتے ہیں۔کامریڈ کے اجراء کا مقصد مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور طرز فکر سے انگریزوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو واقف کرانا تھا۔

جوہر ہندوستان کے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان اتحاد اور اتفاق پیدا کرنا چاہتے تھے جسے دوسرے الفاظ میں ہندو مسلم اتحاد کا نام دیا جا سکتا ہے۔انھوں نے صحافت کے ذریعے اسی مقصد کے حصول پر توجہ دی۔ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

''اس سرزمین میں جہاں کروڑوں کی تعداد میں بیشمار ملّتوں، مذہبی فرقوں اور گروہوں کے لوگ آباد ہیں۔اور سب کو اپنے اپنے مذہب سے گہرا تعلق ہے، قدرت نے مختلف اجزا کو باہم سمونے اور ان میں امتزاج پیدا کرنے کا ایک نادر موقع دیا ہے اور اس کی صورت سوائے مذاہب کے وفاق یعنی فیڈریشن کے اور کوئی صورت نہیں .....ہفت روزہ ''کامریڈ'' کو سب کا کامریڈ (ساتھی) اور کسی کا بھی بے جا حمایتی نہیں ہے انھیں خیالات کا ترجمان ہونا تھا اور اس کا

مقصد مسلمانوں کو اپنی ماورائے وطن ہمدردیوں کے جوش وخروش میں جو کہ اسلام کا مقصد اصلی ہے، ذرہ برابر کمی کیے بغیر ان کو ملک اور وطن کی محبت میں اپنا مناسب حصہ پیش کرنے کے لیے تیار کرنا تھا۔''

الہ آباد کانفرنس منعقدہ 11 مئی 1921ء کے صدارتی خطبے میں ان کے یہ الفاظ قابل غور ہیں:۔

''میں نے ہمیشہ اتحاد کی حمایت کی اور میرے اخبار کا نام ''کامریڈ'' اس پر دلالت کرتا ہے...... سوراج میرا مذہب ہے اور میں آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ اتفاق کر کے سوراج حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔''

مولانا کے لیے صحافت ایک کاروبار نہیں، مشن تھا۔ یہ ان کے لیے کوئی شہرت یا منفعت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ قومی خدمت کا ایک آلہ تھا۔ ان کے پیش نظر کچھ واضح قومی اور ملی مقاصد تھے۔ وہ صحافت کو بھی انھیں مقاصد کے اصول کے ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہ ان کے لیے دراصل گھاٹے کا سودا تھا۔ انھوں نے اس کے لیے اپنا سب تج دیا۔ مالی نقصان کے علاوہ صحت اور تندرستی بھی گنوا دی، اس کے باوجود ان کے پائے استقامت میں لرزش نہ ہوئی۔ انھوں نے مجاہدانہ عزم کے ساتھ اپنا صحافتی مشن اور سرگرمیاں جاری رکھیں۔ حالاں کہ ان کی صحافتی زندگی بڑے جان لیوا تجربات سے دوچار ہوئی۔ وہ صحافتی زندگی کے مقاصد تجربات اور نشیب وفراز پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''میں نے **1911**ء سے قبل کسی اخبار کی اڈیٹری نہیں کی تھی، نہ کسی اخبار کے دفتر کا مجھے کوئی تجربہ تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ مسلمانانِ ہندوستان کے پاس ایک اخبار بھی ایسا نہیں جو صحیح طور پر ان کے خیالات اور خواہشات کی ترجمانی یا ان کی اصلاح کر سکے میں نے بسم اللہ مجریھا و مرسھا کہہ کر صحافت کے بحر ذخار میں اپنی کشتی ڈالی تھی۔ اس وقت سب کا یہی خیال تھا کہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ حکومت تک اپنے خیالات وخواہشات کو پہنچانا ۔۔۔۔۔۔۔۔'کامریڈ' کے اجرا سے بڑی غرض اپنی التجاؤں کو حکومت کے گوش گزار تھا۔۔۔۔''کامریڈ'' نے انگلستان کے مختلف اخباروں کا چربہ اتارا تھا اور حاکم ومحکوم دونوں کے مشترک مذاق کے مطابق ایک معجون مرکّب تیار کر کے دونوں کے سامنے پیش کیا تھا اس کے عوض میں ۔۔۔اپنی قوم سے جو کچھ ملا وہ ہزار ہا روپے کے قرض کا بارِ گراں تھا۔''

(مضامین محمد علی جلد اول ،مرتبہ محمد

سرور،ص 27-28)

''تن تنہا' کا مریڈ' نکالنے کے باعث ہر ہفتے دو راتیں پوری کی پوری آنکھوں میں گزر جاتی تھیں اور دن کو بھی ملاقاتیوں کا ہجوم اور کمیٹیوں وغیرہ کی شرکت کے باعث آرام میسر نہ ہوتا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ صحت اور بھی خراب ہوگئی۔۔۔دنیا بھر میں شاید ہی کوئی اخبار کا مریڈ کے حجم کا ایسا نکلتا تھا جسے ایک شخص شروع سے آخر تک لکھتا اور ترتیب دیتا ہو، پورے ایک ہی ہفتے کی محنت سے جس میں دو راتوں کا 'رات جگا' شامل ہے۔''

(مضامین محمد علی ،محمد

سرور،ص 58-59)

'کا مریڈ' ظاہری صفائی اور زینت کے معیار سے ولایت کے ہفت روزہ جریدوں کا ہم سطح تھا۔گویا معیار کی بلندی کے اعتبار سے یہ اخبار انگلینڈ کے ہفتہ وار اخبارات کا ہم سر تھا۔اس کا مطالع ایک عام فیشن بن گیا تھا۔اس کے پڑھنے والے میں ہندوستانی اور انگریز دونوں ہی شامل تھے۔'کا مریڈ' میں ''حالاتِ حاضرہ پر گپ'' کے عنوان سے طنز و مزاح کا ایک مخصوص کالم ہوتا تھا جو بے حد مقبول تھا۔اسے ولایت علی بمبوق لکھا کرتے تھے۔

اس میں جن مقتدر اشخاص کی چیزیں شائع ہوتی تھیں ان میں ایک سروجنی نائیڈو بھی تھیں۔کا مریڈ کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے خریداروں کی تعداد کوئی آٹھ ہزار تھی۔کا مریڈ کے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ انگلینڈ میں بھی تھا اور وہاں اس کے کوئی دو تین سو خریدار تھے۔کا مریڈ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے ہر شمارے کا بے چینی سے انتظار کیا جاتا تھا۔کا مریڈ کو یہ مقبولیت دراصل محمد علی جوہر کی قوتِ انشا پردازی کی بدولت حاصل ہوئی۔سلیم قدوائی لکھتے ہیں:۔

''ان کی طرز تحریر میں اہل زبان کے انداز پائے جاتے تھے۔۔۔مزاح اور ہجو ملیح کی چاشنی میں محمد علی کی تحریر کو نہایت پر لطف اور زوردار بنا دیتی تھی۔''

کا مریڈ اپنے وقت کا بے حد مقبول ہفتہ روزہ تھا، بقول ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی'' کا مریڈ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ لارڈ ہارڈینگ (وائسرائے) کے نام جو اعزازی پرچہ جاتا تھا اس کو وہ خود پہلے پڑھتے تھے اور

لیڈی ہارڈنگ انتظار نہیں کرسکتی تھیں اس لیے انھوں نے اپنے نام ایک الگ پرچہ چندہ دے کر جاری کرایا۔ جب ہندوستان سے اعلیٰ طبقہ یوروپ جاتا تو تحفہ میں کامریڈ کے فائل لے جاتا۔ چنانچہ ہندوستان کے وزیر مالیات یہی تحفہ لے کر یوروپ گئے۔ میر محفوظ علی کا بیان ہے کہ لارڈ ہارڈنگ کی بیگم صاحبہ وقتاً فوقتاً ٹیلی فون پر پوچھتی تھیں کہ کامریڈ کس وقت چھپ کر ان کے پاس پہنچ جائے گا''۔

کامریڈ اپنی مقبولیت اور قومی وملی خدمات کے باوجود حکومت کے عتاب سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ دارالسلطنت کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد 1912 میں دہلی منتقل ہوگیا لیکن دہلی آنا اسے راس نہ آیا اور 26 ستمبر 1914 کے شمارے میں the choici of the toraks دی چوائس آف دی ٹرکس، کے جواب لکھنے کے سبب کامریڈ کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اس طرح 14 جنوری 1911 سے 4 ستمبر 1912 کلکتہ سے اور 12 اکتوبر 1912 سے نومبر 1914 تک دہلی سے نکلنے کے بعد کامریڈ بند ہوگیا اور دس سال تک بند رہا۔ 31 اکتوبر 1924 سے دوبارہ کامریڈ کی اشاعت شروع ہوئی۔

کامریڈ غیر مسلسل اشاعت کے باوجود مزید پانچ برس شائع ہوا اور آخر کار 12 جنوری 1926 کو ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ اپنی اس مختصر عمر میں اس نے صحافت اور قومی سیاست پر جو اثرات مرتب کیے وہ تاریخی ہیں۔ اس نے جہاں ایک طرف مسلمانوں میں قومی بیداری کے ساتھ ان کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ دیتا تھا تو دوسری طرف قومی اور بین الاقوامی مسائل پر محمد علی جوہر کی تحریریں خاص وعام کی رہنمائی کرتی تھیں۔ جہاں تک قومی اور سیاسی زندگی میں کامریڈ کی خدمات کا تعلق ہے کامریڈ نے اولاً ہندوستانی مسلمانوں کو قومی مفادات کے تحت ایک قومی پالیسی پر متفق کیا اور دوسرے ہندوستان کی آزادی اور سوراج کے مطالبات کو عام کیا۔ یہ دونوں خدمات ہماری آزادی کی تاریخ میں ایک ناقابل فراموش باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مولانا نے کامریڈ جن مقاصد کے تحت جاری کیا تھا، ان کی تکمیل کے لئے انھوں نے اردو میں ایک روزنامہ ''ہمدرد'' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ کامریڈ صرف انگریزی داں حلقوں تک محدود تھا۔ کامریڈ کی صحافت اعلا ترین تھی جس کا نوٹس انگلینڈ میں بھی لیا گیا ہمدرد کی اشاعت کا مقصد ہندوستان کی ایک بڑی آبادی کی ذہنی وفکری تربیت تھا جن کی زبان اردو تھی۔ چنانچہ 23 فروری 1913ء کو کوچہ چیلان دہلی سے روزنامہ ''ہمدرد'' کا اجراء عمل میں آیا۔ ہمدرد کی صحافت بظاہر اس کے پائے کی نہ تھی لیکن اس کے ذریعے ان کے خیالات وافکار کی اشاعت کا دائرہ فطری طور پر وسیع ہوگیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا خیال ہے کہ 'ہمدرد' پہلے 'نقیب ہمدرد' کے نام سے ایک مختصر رسالے کی شکل میں جاری

ہوا مگر ''جامعہ'' کے محمد علی نمبر حصہ دوم میں اس سے اختلاف کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مولانا نے جس اردو روزنامے کی عارضی طور پر ابتدا کی اس کا نام ہمدرد ہی تھا، کچھ اور نہیں۔ اور اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ عارضی اخبار جو 23 فروری 1913 سے 13 مئی 1913 تک یک ورقہ اور اس کے بعد 31 مئی 1913 تک دو ورقہ نکلا۔ اس پر جلد کی جگہ'' سلسلۂ خاص'' لکھا ہوتا تھا اور یکم جون 1913 سے جب اصل اخبار نکلا تو اس پر جلد نمبر 1 لکھا گیا۔ ہمدرد کے لیے بہتر سے بہتر اسٹاف کا اہتمام کیا گیا اور اس کے لیے سیاسی، علمی، ادبی، تہذیبی وغیرہ موضوعات پر نامور ماہر قلم حضرات کے مضامین حاصل کرنے اور مختلف مرکزی مقامات پر خصوصی وقائع نگار مقرر کرنے کی کوشش کی گئی۔ مولانا دریا آبادی کے الفاظ میں اردو کے کسی روزنامے میں اس وقت تک نہ سب ایڈیٹروں اور مترجموں کی اتنی تعداد تھی اور نہ قابلیت کے اعتبار سے اتنا بہتر اسٹاف کہیں اور جمع تھا۔ غرض کچھ نہ ہونے پر بھی ہمدرد کا اسٹاف کیفیت اور کمیت دونوں حیثیتوں سے اپنی نظیر آپ تھا۔ محمد علی کاغذ، چھپائی وغیرہ ظاہری لوازم کے اعتبار سے ہمدرد کو 'کامریڈ' ہی کی سطح پر دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہمدرد کے لیے لیتھو کی بجائے ٹائپ کا انتظام کیا اور خوش نما نئے ٹائپ کے لیے بیروت اور مصر آرڈر بھیجا، مگر ہمدرد کے قارئین کی پسند اور دباؤ نے انھیں ٹائپ کی جگہ انھیں لیتھو میں ہی اخبار کی اشاعت پر مجبور کیا۔ ہمدرد کے پہلے مدیر اردو کے مشہور انشا پرداز ادیب اور ناول نگار عبدالحلیم شرر مقرر ہوئے۔ ہمدرد کی صحافت کے سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریابادی رقم طراز ہیں:۔

> ''ہمدرد غریب میں نہ کبھی سنسنی خیز سرخیاں دی گئیں نہ ایسی خبریں شائع ہونے پائیں جو نوجوانوں کے جذبات کے لیے ہیجان انگیز ہوتیں، مالک ہمدرد کا حکم اور قطعی حکم تھا کہ بس معلومات ہی زیادہ سے زیادہ تعداد میں اور زیادہ سے زیادہ شستہ اور شریفانہ انداز میں قارئین تک پہنچائی جائیں..... اخبار یہاں تجارت اور دکانداری کی کوئی قسم نہ تھی۔''

محمد علی کے صحافتی معیار، انداز اور طریق کار کے بارے میں قاضی عبدالغفار نے جو ہمدرد کی ادارت سے وابستہ رہے تھے، کچھ اہم چشم دید معلومات فراہم کی ہیں جو ان کی شخصیت اور کارگزاریوں کے اس پہلو کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے میں معاون ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صحافت محمد علی کی زندگی کا ایک اہم وہ روشن ترین کارنامہ ہے۔ اور اس کے زیادہ تفصیلی اور عمیق مطالعے کی ضرورت ہے۔

قاضی صاحب ہمدرد کے بارے میں اپنے تاثرات اور خیالات کا زیادہ واضح انداز میں اس طرح اظہار کرتے

ہیں:۔

''ہمدرد، پہلا روزنامہ تھا جس کے مضامین کا معیار اس زمانے کی عام صحافت سے بہت زیادہ بلند تھا۔ بہت سے مشہور شعرا اور ادیبوں کو جو صحافت سے دور رہتے تھے، محمد علی کی شخصیت نے پہلی دفعہ ہمدرد کے صفحات پر پیش کیا۔ حالی، اقبال اور شبلی کی نظمیں اور پریم چند کے افسانے غالباً پہلی دفعہ ایک اردو کے روزنامے میں شائع ہوئے۔ طنز اور مزاح نگاری کا ایک ایسا معیار ہمدرد نے قائم کیا جس کا اس سے پہلے اردو صحافت میں کوئی وجود نہ تھا۔''

مولانا کی یہ کوشش تھی کے اس وقت کے مشاہیر، ادبا و شعرا کو اس اخبار سے منسلک کیا جائے ،اس مقصد کے پیشِ نظر شعبہء ادارت قائم کیا جو ملک کے اہم ترین اہلِ قلم پر مشتمل تھا۔ان میں مولانا عبدالحلیم شرر، سید جالب دہلوی، قاضی عبدالغفار، سید ہاشم فرید آبادی، محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری، قاری عباس حسین گورکھپوری، قاری عبدالعزیز منصور پوری، سید محمد جعفری، معید احمد، عبدا لہادی خاں، اور حسن ریاض خاں وغیرہ کے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ملک کے مشہور آرٹسٹ اور کارٹونسٹ سمیع بھی ہمدرد کے عملے میں شامل تھے۔

مولانا نے اس اخبار کے معیار اور خبروں کی ترتیب و تنظیم پر خصوصی توجہ دی تھی اس کے تحت مشہور خبر رساں ایجنسیوں مثلاً رائٹر اور ایسوسی ایٹیڈ پریس کی خدمات حاصل کیں اور ملک و بیرونِ ملک کے موقر انگریزی اخبارات کی مدد سے بھی خبریں تیار کی جاتی تھیں۔

مولانا محمد علی خبروں پر تبصرے یا تجزیے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ خبروں کو جیوں کا تیوں پیش کرنا ضروری سمجھتے تھے ۔بیسویں صدی کے اوائل میں اس طرح کی روایت شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اسی طرح وہ خودنمائی یا خودتشہیری سے کوسوں دور تھے۔ ہمدرد سے قبل اردو صحافت اصلاً شخصی صحافت تھی ۔ مدیر یا اڈیٹر کی پبلیسیٹی کرنے اور اس کی ساکھ قائم کرنے سب سے موثر ذریعہ تھی۔ اس کے علاوہ اخبار کے مدیروں کے نام کے ساتھ تعظیمی آداب و القاب استعمال کرنے کا رواج عام تھا۔ محمد علی جوہر نے اس روایت کو نہ صرف توڑا بلکہ صحافی کو ایک ذمہ دار اور تعمیری فکر و خیال کا مرقع قرار دیتے ہوئے تمام طرح کی نمائشوں سے دور رہنے کی طرح ڈالی۔

ہمدرد میں شامل مختلف مضامین اور عنوانات کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جوہر کے نزدیک صحافت کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ وہ ہندوستانی سیاست کے نشیب و فراز، ہندو مسلم اتحاد، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل، عالم اسلام کی صورتحال اور بین الاقوامی سیاسی اور معاشرتی حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مولانا کی گہری مذہبیت نے انھیں امن اور آشتی کا جویا بنا دیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے کبھی بھی مسلمانوں کو منافرت کا درس نہیں دیا اور وہ متحدہ قومیت کے زبردست حامی تھے۔

## اپنی معلومات کی جانچ:۔

سوال نمبر 1۔ مولانا محمد علی جوہر کی پیدائش کب ہوئی؟

(الف) 1878ء (ب) 1876ء (ج) 1879ء (د) 1877ء

سوال نمبر 2۔ مولانا محمد علی جوہر کے والد کا انتقال کیسے ہوا؟

(الف) چھت سے گرنے کی وجہ سے (ب) قتل ہوا (ج) فسادات کے درمیان (د) ہیضے کی وجہ سے

سوال نمبر 3۔ محمد علی جوہر کی والدہ کس نام سے مشہور تھیں؟

(الف) اصغری (ب) بی امّاں (ج) بواجی (د) بی بی صاحبہ

سوال نمبر 4۔ علی برادران کسے کہا جاتا ہے؟

(الف) جوہر علی اور گوہر علی (ب) امام علی اور سلیمان علی (ج) محمد علی اور شوکت علی (د) رضا علی اور شوکت علی

سوال نمبر 5۔ پہلی جنگ عظیم کا آغاز کب ہوا؟

(الف) جنوری 1916ء (ب) جولائی 1915ء (ج) نومبر 1914ء (د) جولائی 1914ء

سوال نمبر 6۔ علی برادران مہرولی میں کب نظر بند کیے گئے تھے؟

(الف) 15 مئی 1914ء (ب) 14 مئی 1914ء (ج) 17 مئی 1915ء (د) 16 مئی 1915ء

سوال نمبر 7۔ ہفتہ وار اخبار ''کامریڈ'' کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا؟

(الف) 14 جنوری 1911ء (ب) 14 فروری 1911ء (ج) 14 مارچ 1911ء (د) 14 اپریل 1911ء

سوال نمبر 8۔ ''ہمدرد'' کا اجرا کب عمل میں آیا؟

(الف) 24 فروری 1914ء (ب) 23 فروری 1913ء (ج) 18 اگست 1912ء (د) 16 اگست 1918ء

سوال نمبر 9۔ بلقان کی سلطنتوں نے ''خلافت عثمانیہ'' کے خلاف کب بغاوت کی تھی؟

(الف) اکتوبر 1912ء (ب) نومبر 1915ء (ج) دسمبر 1914ء (د) اکتوبر 1913ء

سوال نمبر 10۔ محمد علی جوہر کے والد کا نام کیا تھا؟

(الف) عبدالعلیم خان (ب) عبدالحلیم خان (ج) عبدالعلی خان (د) عبدالرحیم خان

سوال نمبر 11۔ محمد علی جوہر تعلیم کے لیے انگلینڈ میں کتنے سال رہے؟

(الف) 4 سال (ب) 5 سال (ج) 6 سال (د) 3 سال

سوال نمبر 12۔ محمد علی جوہر کی شادی کب ہوئی؟

(الف) 10 نومبر 1903ء (ب) 5 نومبر 1904ء (ج) 5 فروری 1902ء (د) 25 فروری 1902ء

سوال نمبر 13۔ ولایت سے محمد علی جوہر ہندوستان کب لوٹے؟

(الف) 1904ء (ب) 1905ء (ج) 1906ء (د) 1902ء

سوال نمبر 14۔ محمد علی جوہر ریاست بڑودہ کے کمشنر کب مقرر ہوئے؟

(الف) 1902ء (ب) 1903ء (ج) 1904ء (د) 1905ء

سوال نمبر 15۔ مولانا محمد علی جوہر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن کب تشریف لے گئے؟

(الف) دسمبر 1930ء (ب) جنوری 1931ء (ج) اگست 1932ء (د) نومبر 1930ء

## 2.6: خلاصہ

محمد علی جوہر ہندوستان کی ان عظیم المرتبت شخصیتوں میں ایک ہیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی اور عوامی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیے۔ محمد علی جوہر کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، وہ ایک شاعر، ادیب، قومی رہنما کے علاوہ ممتاز صحافی بھی تھے۔ سیاسی سطح پر ان کا نام مہاتما گاندھی کے ساتھ لیا جاتا ہے، جنھوں نے حصول آزادی کے جدوجہد میں قائدانہ کردار ادا کیا اور مشترک قومیت کے تصور کا شدومد کے ساتھ پرچار کیا۔ مولانا محمد علی کے سامنے قومی اتحاد اور یک جہتی کا ایک واضح تصور تھا۔ وہ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور طبقوں کو ملک کے اعلیٰ مفاد کے تحت ایک دوسرے سے قریب لانا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے فروغ پر بطور خاص توجہ دی اور اس باب میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔

محمد علی ایک اعلیٰ درجے کے صحافی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے انگریزی ہفتہ وار ''کامریڈ'' اور ''اردو روزنامہ

ہمدرد‘‘ کے ذریعے صحافت نگاری کا جو اعلیٰ نمونہ پیش کیا اس سے نہ صرف اردو صحافت کا معیار و وقار بلند ہوا بلکہ اس سے جدید اور عصری تقاضوں کے تحت اردو صحافت ایک نئی جست لگائی۔ انگریز انشا پر بالخصوص انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی اور وہ انگریزی کے ایک زوردار ادیب اور صحافی تھے جن کی انگریزی دانی کا شہرہ انگلینڈ تک پہنچ چکا تھا۔ مولانا محمد علی انگریزی کے ساتھ اردو کے بھی اعلیٰ درجے کے انشا پرداز تھے۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تقریر ملکہ رکھتے تھے اور ایک شعلہ بیان مقرری کے حیثیت سے مشہور ہوئے۔

## 2.7 معروضی سوالات کے جوابات:

1۔(الف)، 2۔(د)، 3۔(ب)، 4۔(ج)۔ 5۔(د)، 6۔(ج)، 7۔(الف)، 8۔(ب)، 9۔(د)، 10۔(ج)، 11۔(الف)

12۔(ج)، 13۔(د)، 14۔(ب)، 15۔(د)

## 2.8 نمونۂ امتحانی سوالات

سوال نمبر 1۔ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر 2۔ محمد علی جوہر کی قومی وملّی خدمات پر ایک مضمون سپرد قلم کیجیے؟

سوال نمبر 3۔ محمد علی جوہر کی صحافتی خدمات پر اظہار خیال کیجیے؟

سوال نمبر 4۔ محمد علی جوہر کی سیرت کی خصوصیات بیان کیجیے؟

سوال نمبر 5۔ بی امّاں کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے؟

## 2.9 فرہنگ

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| ساخت | بناوٹ، ترکیب | توقع | امید، بھروسا، آسرا |
| صحافت | اخبار نویسی | حب الوطنی | وطن کی محبت |
| فروغ | سرفرازی، ترجیح | جدید طرز | نئی روش |
| صعوبتیں | مصیبتیں | آباواجداد | باپ دادا |
| فتوحات | جمع فتوح کی | بودوباش | رہنا سہنا، سکونت |

| | | | |
|---|---|---|---|
| فیاضی | سخاوت | سنگین | سخت، پتھر کا بنا ہوا |
| مالی بحران | روپئے پیسے کی کمی | کسر | کمی |
| صفات | خوبی | قیادت | رہنمائی |
| استقلال | ثابت قدمی | منہمک | کسی کام پر بہت کوشش کرنے والا، انہماک |
| تعصب | حمایت غلط طرف داری | توہم | وہم میں پڑنا، شک |
| خوداعتمادی | بھروسا، اپنے آپ پر بھروسا | سپرد قلم | لکھا |
| اعزاز | عزت، توقیر | وضع قطع | تراش خراش |
| دیانت داری | ایمان داری | ظلم و جبر | زیادتی |
| اجراء | جاری کرنا | جرأت | ہمت |
| کامریڈ | جلیس، ہم نشین | حتی الامکان | جہاں تک ممکن ہو |
| نظر بند | قیدی | اسیر | قیدی |
| منعقد | انعقاد پانے والا | تجویز | رائے، تدبیر، تصفیہ |
| ذیابطیس | شوگر | عارضہ | مرض، بیماری |
| فلاح و بہبود | سلامتی، بھلائی | ارمغان آزادی | آزادی کا تحفہ |
| ملک عدم | آخرت | امتیاز | فرق، شناخت، تمیز |
| معاصرین | ہم عصر | مبرّیٰ | پاک، بے زار |
| استقامت | استقلال، کسی پر مضبوطی سے قائم رہنا | سرشت | خمیر، طبیعت |
| ظرافت | شوخی | آہنی | لوہے جیسا |
| جابرانہ | ظالمانہ رویہ | قاہر | قہر کرنے والا، غالب |
| احتجاج | اختلاف کا اظہار | صادر | نافذ |
| تصفیہ | فیصلہ، صفائی | اضطراب | گھبراہٹ، بے قراری |

| | | | |
|---|---|---|---|
| عتاب | عذات | تردید | ردکرنا |
| مسترد | ردکردینا | سفارش | بھلائی کا کلمہ کہنا |
| ترکِ موالات | عدم تعاون | تخیل | خیال کرنا |
| حُرّیت | آزادی، کسی کا غلام نہ ہونا | شعلہ نوائی | آگ کی لپٹ جیسی آواز |
| استعمار | نوآبادی | ہم آہنگ | وہ جن کی ایک آواز ہو |
| اشتعال | بھڑکنا، شعلہ اٹھنا | اجلاس | جلسہ، نشست، دربار |
| ارتقاء | اوپر چڑھنا، ترقی کرنا | متمول | دولت مند |
| پایۂ تخت | دارالسلطنت | قاصر | مجبور |
| براہ راست | سیدھے | بالغ نظری | شعور کی منزل، باشعور |
| معروضیت | حقیقت پسندی، غیر جذباتیب | مطامح | مطمع کی جمع، نظر پڑنے کی جگہ |
| اقتباس | روشنی لینا، کسی عبارت سے کوئی مفید مطلب ٹکڑا لے لینا | امتزاج | ملانا، آمیزش کرنا |
| نادر | عمدہ، عجیب | منفعت | نفع، فائدہ |
| تج دینا | چھوڑ دینا | لرزش | کپ کپاہٹ |
| نشیب وفراز | اونچ نیچ | حاکم | حکم کرنے والا |
| محکوم | جس پر حکم کیا جائے | معجون مرکب | کئی دواؤں سے مل کر بنی ہوئی دوا |
| بارِگراں | بھاری بوجھ | حجم | موٹائی |
| سطح | ہر چیز کا بالائی حصّہ | | |

## 2.10: سفارش کردہ کتابیں


1۔مولانا محمد علی جوہر: شخصیت اور خدمات۔رشید احمد صدیقی

2۔مولانا محمد علی نمبر۔حصہ اوّل، حصہ دوم۔جامعہ ملیہ

3۔ہندوستان کی سیاسی بیداری میں محمد علی کا حصہ۔خلیق احمد نظامی

4۔محمد علی جوہر: شخص اور شاعر۔آفتاب احمد آفاقی

## اکائی: 2.0 مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیتِ صحافی

## ساخت:


2.0 اغراض ومقاصد

2.1 تمہید

2.2 مولانا آزاد کی حالات زندگی

2.3 جنگ آزادی میں مولانا آزاد کا کردار

2.4 مولانا آزاد بحیثیت صحافی

2.5 مولانا آزاد کی صحافت کے امتیازات

2.6 خلاصہ

2.7 معروضی سوالوں کے جوابات

2.8 نمونۂ امتحانی سوالات

2.9 فرہنگ

2.10 سفارش کردہ کتابیں


## 2.0: اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ:

☆ مولانا آزاد کی شخصیت وسیرت کے مختلف گوشوں سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

☆ مولانا آزاد کی علمی وادبی خدمات اوران کے کارناموں سے متعلق تفصیلات فراہم ہوسکیں گی۔

☆ مولانا آزاد کی صحافتی خدمات اوراردو صحافت کے فروغ میں ان کے کردار سے متعارف ہوسکیں گے۔

☆ مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت اورتحریک آزادی میں ان کے قائدانہ کردار کا علم حاصل ہوگا۔

## 2.1: تمہید

مولانا آزاد کی شخصیت کی کئی جہتیں تھیں وہ اگر مجاہد آزادی تھے تو عالم دین بھی تھے انھیں قرآن، فقہ، علم الکلام اور علم حدیث پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ فلسفی تھے، مفکر تھے، مدبر تھے، تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو انقلاب برپا کر دیا۔ ایسی روایتوں کو جنم دیا جن سے اردو صحافت نا آشنا تھی۔ مولانا کا شمار اردو کے اعلیٰ ترین انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔

اگر ان کا اسلوب تحریر منفرد تھا تو تقریر میں بھی ان کا ثانی ملنا مشکل تھا ان جیسے شعلہ نوا اور جادو بیاں ہندوستان نے بہت کم پیدا کیے۔ ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی مولانا کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جدید ہندوستان کی تعمیر اور ترقی میں مولانا آزاد نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔

## 2.2: مولانا آزاد کی حالات زندگی

مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام محی الدین تھا۔ وہ 1888ء میں مکّہ معظّمہ میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام خیرالدین تھا جن کی پیدائش 1831ء میں دہلی میں ہوئی تھی لیکن 1856ء میں ہجرت کر کے مکّہ معظّمہ میں سکونت اختیار کر لی اور انھوں نے اپنے لیے وہیں مکان بنوایا۔ 1866ء میں مکّہ معظّمہ کے ایک معزز خاندان میں مولانا خیرالدین کی شادی ہوئی۔ مولانا آزاد کے آبا و اجداد بابر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ پہلے انھوں نے آگرہ کو اپنا مسکن بنایا بعد میں دہلی منتقل ہو گئے۔ ان کے خاندان کے لوگ علمی ذوق اور سیاسی بصیرت کے علاوہ انتظامی امور سے واقفیت رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ مغلیہ سلطنت کے متعدد بادشاہوں کے دربار میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ اکبر کے زمانے میں مولانا جلال الدین نے اپنے علم کی بدولت جو شہرت پائی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین اپنی عربی دانی اور تصنیف و تالیف کے باعث مشہور تھے۔ 1893ء میں جب مولانا آزاد کی عمر تقریباً پانچ برس تھی تب شیخ عبداللہ نامی ایک بزرگ نے حرم شریف میں پہلی بسم اللہ کی رسم ادا کرائی۔ ایک دو سال میں انھوں نے قرآن شریف ختم کر لیا اور سورہ یٰسین اور سورہ قاف وغیرہ حفظ کر لی تھی۔ ابتدائی تعلیم ان کے والد نے دی اس کے بعد مولوی محمد یعقوب نے مولانا آزاد اور ان کے بھائی کو عربی اور منطق پڑھائی۔ جب کہ فارسی اور عربی خود ان کے والد پڑھاتے تھے۔ انھوں نے ان دونوں زبانوں پر اتنی زیادہ توجہ دی کہ اردو بالکل نظر انداز ہو گئی۔ مولانا کو اردو پڑھنے کا خود شوق پیدا ہوا مکّہ معظّمہ میں مولانا کو اردو پڑھانا شروع کر دیا گیا تھا۔ ابھی وہ محض دس برس کے تھے کہ ان کے والد مکّے میں گر پڑے اور بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس وقت مکّے میں علاج کا

معقول انتظام نہیں تھا چناں چہ علاج کی غرض سے 1896ء میں پورے خاندان کے ساتھ ہندوستان واپسی ہوئی اور کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی۔ کلکتہ پہنچنے پر انھوں نے اپنی بڑی بہن آبرو بیگم اور باہر حافظ بخاری سے پڑھی۔ اس کے علاوہ ان کے مرید محمد امین اور محمد اکرام اللہ نے داستانوں، ناولوں کے مطالعے میں خاصی مدد کی۔ علاوہ ازیں انگریزی، فرانسیسی اور ترکی میں اپنی محنت اور ذوق وشوق اور لگن سے استعداد پیدا کر لی۔ ہر چند کہ مولانا آزاد کے والد عقائد و افکار میں اس قدر سخت تھے کہ معمولی سے انحراف کو بھی کفر تسلیم کرتے تھے۔ ان کی تعلیم بھی موروثی عقائد کے عین مطابق ہوئی تھی اور ماحول چاروں طرف تقلید اور قدامت پسندی سے گھرا ہوا تھا۔ گھر میں عزیزوں اور بزرگوں کے علاوہ وہ لوگ تھے جو اس خاندان کے مرید اور معتقد تھے۔ وہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر مولانا کے ہاتھ پیر چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے تھے۔ قدرت نے مولانا آزاد کو ایسی طبیعت عطا کی تھی کہ وہ اس ماحول سے باہر نکلنا چاہتے تھے۔ مختلف علوم اور خاص طور سے فلسفے کے مطالعے نے مولانا کے ذہن وفکر کے دریچے کھول دیے۔ تقلید اور روایت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا جو بعد میں ان کی ادبی وسیاسی زندگی میں نئی عمارت کی تعمیر وتشکیل میں نعمت ثابت ہوئی۔ بقول مولانا آزاد مذہب کی وہ پرانی دنیا جسکی مافوق الفطرت کاروائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی، اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بے رنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔

مولانا آزاد کی ادبی زندگی کا آغاز شعروشاعری سے ہوا بعد میں نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ دس گیارہ برس کی عمر میں انھوں نے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ انھیں مولوی فاروق چریا کوٹی کے شاگرد مولوی عبدالواحد سہسرامی کی صحبت میں رہ کر شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ شروع میں بمبئی سے شائع ہونے والا گلدستہ ''ارمغان فرح'' میں شائع ہوتے تھے۔ مولانا عبدالواحد نے ہی ان کے لیے ''آزاد'' تخلص تجویز کیا تھا جو انھیں پسند آیا۔ اس کے بعد 1899ء میں مختلف شعرا کے کلام کو یکجا کر کے ایک گلدستہ ''نیرنگ خیال'' کے نام سے جاری کیا۔ یہ ان کا اولین مرتبہ گلدستہ تھا جسے ان کی صحافت کی پہلی اینٹ بھی کہنا چاہیے۔ 1900ء کے اواخر میں ''المصباح'' کی ادارت کی۔ اس کے علاوہ مختلف ادارۂ تحریر میں شریک رہے جن میں ''احسن الاخبار''، ''خدنگ نظر'' بطور خاص ہیں۔ 1905ء میں انھوں نے ''لسان الصدق'' شائع کیا۔ پھر مولانا شبلی کی کوششوں سے انھوں نے ''الندوۃ'' کی ادارت کی ذمہ داری قبول کی۔ ''الندوۃ'' سے علاحدگی کے بعد امرتسر سے شائع ہونے والا سہ روزہ ''وکیل'' سے منسلک ہو گئے، بعد میں اس سے بھی الگ ہو گئے۔ لیکن اس عرصے میں اردو صحافت نگاری کا خاصہ تجربہ حاصل کر چکے تھے اور ان کی شہرت ملک گیر پیمانے پر ہو چکی تھی۔

1899ء میں ان کی والدہ کا کلکتے میں انتقال ہوگیا جبکہ 1908ء میں ان کے والد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ 1907ء میں مولانا آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی۔ وہ ایک سلیقہ شعار بیوی، خانہ داری کے امور سے واقف مہمان نواز خاتون تھیں۔ مولانا آزاد کی سیاسی اور قید و بند کی زندگی نے اپنی وفا شعار بیوی کی طرف توجہ کرنے کا وقت ہی نہیں دیا۔ چناں چہ شوہر سے مسلسل جدائی، تنہائی اور مالی مشکلات نے دق جیسے موذی مرض میں مبتلا کر دیا اور آخر کار 9اپریل 1943ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وطن کی آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد میں زلیخا بیگم کی قربانی کسی بھی مجاہد آزادی سے کم نہیں ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جنگ آزادی کی جد و جہد کے لے تیز ہو چکی تھی۔ 1885ء میں کانگریس کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ لیکن اس وقت تک بدرالدین طیب جی کے علاوہ مسلمانوں میں سیاسی قائد دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ مولانا آزاد کو اس کا شدید احساس تھا۔ چناں چہ 1908ء میں مولانا نے عراق، مصر، شام اور ترکی کا سفر کیا اور وہاں کے انقلابی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ کچھ سے ان کی دوستی ہوگئی جو ہندوستان واپس آنے کے بعد بھی کئی سال تک باقی رہی۔ ان تحریک کے رہنماؤں سے قربت کے بعد مولانا کو یہ یقین ہو گیا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو شامل ہونا ضروری ہے۔ مولانا نے فیصلہ کر لیا کہ ہندوستان پہنچ کر وہ پہلے سے زیادہ سیاست میں حصہ لیں گے۔ مولانا کو یہ بھی احساس ہوا کہ مسلمانوں کو خواب گراں سے جگانے اور ان میں انقلابی جذبہ پیدا کرنے کے لیے ایک اخبار جاری کرنا ضروری ہے اس مقصد کے تحت مولانا نے جون 1912ء میں ہفت روزہ ''الہلال'' جاری کیا۔ اردو صحافت کی تاریخ میں یہ پہلا ہفت روزہ تھا جس کے اشاعت 26 ہزار کا پیاں فی شمار پہنچیں۔ مسلمانوں میں ''الہلال'' کی مقبولیت اور اس کے سیاسی مضامین سے حکومت خائف ہوگئی۔ چناں چہ 18 ستمبر 1913ء کو ''الہلال'' کی دو ہزار کی ضمانت طلب کر دی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس اقدام سے ڈر کر مولانا اپنی پالیسی بدل لیں گے لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے دو ہزار روپئے بطور ضمانت جمع کرا دیے اور اخبار کی پالیسی میں کوئی فرق نہیں کیا۔ حکومت نے کچھ ہی دن بعد دو ہزار کی ضمانت ضبط کر لی، اور دس ہزار روپئے کی مزید ضمانت طلب کی۔ بہت جلد یہ ضمانت بھی ضبط کر لی گئی۔ حکومت کا کوئی بس نہ چلا تو اس نے ''الہلال'' پریس ضبط کر لیا۔ مولانا ہمت نہیں ہارے۔ پانچ مہینے بعد انھوں نے ''البلاغ'' پریس قائم کیا اور ''البلاغ'' نام سے ایک اخبار جاری کر دیا۔ حکومت بنگال نے جب دیکھا کہ مولانا پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوا تو انھوں نے دہلی، پنجاب، یوپی اور ممبئی کی حکومتوں نے اپنے صوبوں کے حدود میں مولانا کے داخلے پر پابندی عاید کر دی۔ بعد میں وہ رانچی میں نظر بند کیے گئے جہاں یکم جنوری 1920ء کو رہائی ملی۔ اس کے بعد وہ ''خلافت

تحریک'' سے وابستہ ہو گئے اور اسے ایک نئی بلندی عطا کی۔اسی طرح کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ان کے بعض اہم فیصلے تحریک آزادی کو تقویت عطا کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔مولانا آزاد آزادی کے بعد پہلے وزیر تعلیم مقرر ہوئے جن کی کوششوں سے ہندوستان کے محکمۂ تعلیم میں کئی نئے دروازے کھلے۔انھوں نے جدید سائنسی اور سماجی علوم، تاریخ، تہذیب اور کھیل ثقافت پر بھی خصوصی توجہ دے کر تعلیم کے میدان میں ہندوستان کو ایک نئی راہ دکھائی۔اس کے پہلو بہ پہلو اردو زبان ادب کی ترقی و ترویج میں حصہ لیتے رہے۔نیز اپنی ادبی سرگرمیوں کی بدولت متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ان میں ''تذکرہ''، ''غبار خاطر''، ''خطبات آزاد'' اور ''ترجمان القرآن'' کو بطور خاص اہمیت حاصل ہے۔یہ کتابیں اردو میں اضافے کا حکم رکھتی ہیں۔اس لحاظ سے مولانا آزاد ہندوستان میں جدید اور عصری تعلیم و تدریس کے بانیوں میں شمار کیے جائیں گے۔مولانا آزاد آخری دم تک قوم و ملّت کی فلاح و بہبود کے لیے انتھک کوشش کرتے رہے

۔

بلا شبہ مولانا آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔طویل مدّت تک ملک کی آزادی اور تعمیر جدید میں حصہ لینے والا بھارت کا یہ سپوت 19 فروری 1958ء کی صبح جب بستر سے اُٹھ کر غسل خانے گیا تو اچانک فالج کا حملہ ہوا۔یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ تین دن تک مولانا بے ہوش رہے۔آخر 22 فروری کو دن میں دو بج کر دس منٹ پر ہندوستان کی یہ روشن ترین شمع گل ہوگئی۔23 فروری کی سہ پہر تین بجے مولانا احمد سعید نے دہلی کے پریڈ گراونڈ میں نمازِ جنازہ پڑھائی اور اسی گراونڈ میں جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان انھیں دفن کر دیا گیا۔

## 2.3: جنگِ آزادی میں مولانا آزاد کا کردار

مولانا نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا غلامی کا زمانہ تھا برطانوی سامراج ہندوستان کا استحصال کر رہا تھا ایک طرف سامراج خود کو مضبوط کرنے میں مصروف تھا تو دوسری طرف قوم خود کو آزادی کے لئے کوششیں کر رہی تھی۔ایسے موقع پر مولانا جیسے ذہیں، حساس، ایماندار، حق پرست اور حوصلہ مند انسان کے لئے کیسے ممکن تھا وہ تحریک آزادی سے دامن بچائے رہتا۔اگر مولانا آزاد اپنے خاندانی طریقوں کو اختیار کرتے تو ان کی ساری زندگی عیش و آرام میں گزرتی رہتی۔دولت، شہرت، عزت میں کسی طرح کی کمی نہیں تھی لیکن مولانا کی عظمت، انسان دوستی، عقلیت پسندی اور فکر و نظر کی بلندی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ انھوں نے اپنے لیے دار و رسن کا راستہ منتخب کیا۔

مولانا نے سیاست کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ہی ہندوستان کی سیاست کے سب سے بڑے مرض کی تشخیص کر لی تھی۔ان کا عقیدہ تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو

تفرقہ پیدا کیا ہے وہ ان دونوں مذہبی گروہوں ہی کے لیے نہیں، پوری قوم کے لیے خطرناک ہے۔ جو ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے لیے اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ دراصل انگریزوں کے زرخرید غلام ہیں۔ اور اپنے مالکوں کے دیے ہوئے کام کو پوری ایمانداری، خلوص اور لگن کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے مذہبی گروہوں میں جتنی نفرت پیدا ہوگی اور ان میں آپس میں جتنا فاصلہ پیدا ہوگا، اتنی ہی ہندوستان پر برطانوی حکومت کی گرفت مضبوط ہوگی اور اتنی ہی ہندوستان کے پیروں میں پڑی غلامی کی زنجیریں مضبوط ہوں گی۔ متحدہ قومیت مولانا کا عقیدہ تھا ان کی ساری زندگی ہندو مسلم اتحاد کا اعلاترین نمونہ تھی۔ انھوں نے اس اتحاد کے لیے خود بھی جدوجہد کیا اور دوسروں کو بھی ترغیب دی۔

مولانا آزاد تحریک آزادی کے مجاہد تھے۔ بہ قول ڈاکٹر محمد یٰسین ''ان کے اندر ٹیپو سلطان کی تڑپ، سرسید کا خلوص اور جمال الدین افغانی کا جوش کارفرما تھا''۔ 1920ء کے قریب ان کی ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب گاندھی جی نے جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپس آکر کانگریس کی قیادت کی باگ ڈور سنبھالی۔ گاندھی جی کی طرح مولانا آزاد بھی آخری وقت تک ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور اس مہم میں انھوں نے ہر طرح کی صعوبتیں اٹھائیں۔ ان کی سیاسی عظمت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانی مزاج کے مطابق مذہب کو سیاست کی اساس سمجھا اور متحدہ قومیت اور سیکولرزم کے تصورات کو فلسفۂ حیات بنانے کی تلقین کی۔

مولانا آزاد قومی اتحاد کو ایمان کا ایک حصہ تصور کرتے تھے۔ انھوں نے 1913ء میں ہی یہ اعلان کیا تھا کہ ''اگر بادلوں سے اتر کر ایک فرشتہ قطب مینار کی چوٹی پر کھڑا ہو کر یہ کہے کہ ہندوستان آزاد ہوسکتا ہے لیکن اس کی قیمت علیحدہ قومیت ہوگی تو میں ہرگز اس آزادی کو پسند نہ کروں گا۔ کیوں کہ اس سے انسانیت کو زبردست نقصان پہنچے گا۔''

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت کا یہ بین ثبوت ہے کہ 1905ء میں جب لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کی تجویز پیش کی تو سارے ملک میں اس کے خلاف زبردست احتجاج ہوا۔ بنگال کے انقلابی، مسلمانوں پر بھروسا نہیں کرتے تھے اور انھیں اپنی جماعت میں نہیں شامل کرنا چاہتے تھے۔ مولانا آزاد نے نہ صرف ان انقلابیوں سے رابطہ قائم کیا بلکہ جلد اپنا ہم خیال بھی بنالیا۔ اس کے علاوہ عراق، مصر اور ترکی کی سیاحت کے بعد یہ محسوس کیا کہ مسلمان قومی تحریک سے الگ رہ کر ہندوستان میں باعزت زندگی نہیں گزار سکتا۔ چناں چہ ''الہلال'' کا اجرا عمل میں آیا۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو سیاسی طور پر بیدار کرنا تھا۔ اور اس طرح صحافت کے ذریعے مولانا سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے اس کے ذریعے آزادی کی جدوجہد کی لے کو تیز کرنے اور آزادی کے متوالوں میں جوش اور جذبہ بھرنے کے علاوہ قومی

یک جہتی کے فروغ کا وسیلہ صحافت کو تصور کیا۔اس جد و جہد کے دوران وہ علم و فضل اور مذہب کو نہیں بھولے۔ اگر ''الہلال'' ایک طرف ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تربیت کر رہا تھا تو دوسری طرف انھیں مذہبی تعلیم بھی دے رہا تھا، جو انگریزوں کی نیندیں اڑانے کا محرک ثابت ہوا۔ ''الہلال'' کے سیاسی مضامین سے انگریزی حکومت اس قدر خائف ہوئی کہ 18 ستمبر 1913ء کو اس کی 2000 کی ضمانت ضبط کر لی، لیکن اس کے باوجود مولانا کی پالیسی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔اس کے بعد حکومت نے ''الہلال'' پریس ضبط کر لیا۔ بعد میں مولانا نے ''البلاغ'' نامی ایک اخبار جاری کیا۔حکومت بنگال نے دیکھا کہ مولانا پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوا، تو دہلی، پنجاب، یوپی اور ممبئی کی حکومتوں نے اپنے صوبے کے حدود میں مولانا کے داخلے پر پابندی عاید کر دی تھی۔اب بہار جانے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔مولانا کی پہلی گرفتاری 1916ء میں پیش آئی اور انھیں پہلی بار بنگال چھوڑنے کا حکم ہوا چنانچہ 30 مارچ 1916ء کو مولانا کلکتے سے جلاوطن ہو کر رانچی پہنچ گئے۔مولانا کی جلاوطنی سے ان کے احباب اور مداح بے حد رنجیدہ ہوئے اور ان کی جلاوطنی کو ختم کرنے کی غرض سے ساٹھ ہزار دستخطوں پر مشتمل ایک میمورنڈم پیش کیا گیا لیکن مولانا آزاد کو رانچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ ہر چند کہ رانچی میں ان کے جلاوطنی کے دن بہت برے تھے لیکن سب سے زیادہ دینی اور علمی کام مولانا نے یہیں کیا۔وہ اپنے سیاسی نظریات اور پر جوش صحافت کی بنا پر نظر بند کیے گئے۔مگر جنوری 1920ء میں جب وہ رہا ہوئے تو پھر ''خلافت تحریک'' کے روح رواں بن گئے۔

ستمبر 1920ء میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تجویز پیش کر دی اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔اس زمانے میں جب مولانا جیل میں تھے کونسل ممبری کے سوال پر کانگریس میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ رہائی کے بعد مولانا نے دونوں گروہوں کے درمیان سمجھوتے کی کوشش کی اور بالآخر 1923ء کے خصوصی اجلاس میں دونوں دھڑوں کے درمیان مفاہمت ہو گئی اور مولانا اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔

اگر چہ مولانا کو گاندھی جی سے بہت سے معاملوں میں اختلاف تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ گاندھی جی سے بہت متاثر تھے اور خود گاندھی جی پر مولانا کی شخصیت کا گہرا اثر تھا۔ جب مولانا رانچی میں نظر بند تھے تو گاندھی جی ملاقات کی غرض سے رانچی گئے لیکن حکومت بہار نے ملنے کی اجازت نہیں دی۔جنوری 1920ء میں مولانا دہلی آئے اور حکیم اجمل خاں کے گھر پر گاندھی جی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی مسلمانوں میں ''خلافت تحریک'' زور پکڑ چکی تھی اور گاندھی جی اور لوک مانیہ تلک کے علاوہ کئی دوسرے کانگریس رہنماؤں کی تائید حاصل تھی۔مولانا آزاد نے ''خلافت تحریک'' سے عام مسلمانوں کو جوڑنے اور ہندوستان کے تمام لیڈروں سے اس کی حمایت حاصل

کرنے میں بڑی دانشمندی سے کام لیا۔ان کے نزدیک ''خلافت تحریک'' سے وابستگی ایک دینی فریضہ تھا۔چنانچہ اسے انگریزوں کے خلاف ایک محاذ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔مولانا آزاد جنگِ آزادی کے قائدین میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔وہ پکّے کانگریسی تھے اور گاندھی ونہرو کا دل سے احترام کرتے تھے۔اس لیے کانگریس کے تمام پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے اور اس کے اہم فیصلوں میں مولانا آزاد موجود رہتے تھے۔

دسمبر 1929ء میں کانگریس کے لاہور کے جلسے کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو نے کی تھی اور 26 جنوری 1930ء کو دریائے راوی کے کنارے مکمل آزادی کا وہ تاریخی اعلان پڑھا گیا جو بعد میں ہمارے جمہوریہ کا سنگ بنیاد بنا۔اس اعلان کا مسوّدہ تیار کرنے میں مولانا آزاد کا بھی ہاتھ تھا۔1940ء کے رام گڑھ میں ہوئے کانگریس کے تاریخی اجلاس کے لیے مولانا کا جب انتخاب کیا گیا اس وقت سیاسی اعتبار سے بڑا اہم دور تھا اس لیے محمد علی جناح کا اثر ورسوخ مسلمانوں میں بڑھ رہا تھا اور وہ یہ دعوے کر رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کے واحد نمائندے ہیں۔انگریز حکّام ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر کے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل پیرا تھے اور بڑی حد تک کامیاب ہوتے نظر آ رہے تھے۔دوسری طرف کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہے۔محمد علی جناح نے مولانا آزاد کے لیے کانگریس کا ''نمائشی آدمی'' کی تضحیک آمیز اصطلاح استعمال کرنی شروع کر دی تھی مگر مولانا آزاد کردار اور مسلک کے اعتبار سے لوہے کے آدمی تھے۔وہ انگریزوں کی چالوں کو سمجھتے تھے۔انھیں حب الوطنی سب سے زیادہ عزیز تھی اور انھوں نے اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ ان کے گمراہ سیاسی مخالف انھیں کیا کہتے ہیں۔انھوں نے ایک اخباری نمائندے سے کہا کہ:۔

> ''جناح مجھے کیا سمجھتا ہے مجھے اس کی مطلق پرواہ نہیں نہ ہی اس کی آواز مسلمانوں کی آواز ہے، مجھے اپنا وطن جان سے عزیز ہے اور اس قسم کے سستے اور رکیک جملے مجھے مشتعل نہیں کر سکتے۔''

مولانا آزاد جنگِ آزادی کے متوالے تھے اور اسے حاصل کرنے میں آنے والی تمام مشکلات اور رکاوٹوں کو اپنے بلند عزائم وحوصلوں سے دور کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ ان کی عملی یا تحریری زندگی ملک وملّت کے لیے وقف تھی۔انگریز مخالف سرگرمیوں میں حصہ لینے اور جنگِ آزادی کی جدوجہد کو تیز کرنے کے الزام میں انھیں اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ قید وبند کی صعوبتوں میں گزارنا پڑا۔اس ضمن میں 10 دسمبر 1921ء کو مولانا کو پہلی بار سیاسی الزامات کے تحت کلکتہ جیل میں ڈالا گیا اور بعد میں ایک سال کی سزا سنائی گئی۔اس کے علاوہ 1941ء میں مولانا نینی جیل میں بند

کیے گئے اور دسمبر 1941ء میں رہا ہوئے۔ 8 اگست 1942ء کو کانگریس کا جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا جس میں ''انگریزو ہندوستان چھوڑو'' کی تجویز منظور کی گئی۔ اسی لیے 9 اگست کی صبح حکومت نے کانگریس کے کئی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ان رہنماؤں میں مولانا آزاد بھی شامل تھے۔ جنھیں 9 اگست 1942ء کو گرفتار کر کے احمد نگر کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ بعد میں انھیں بانکوڑا (بنگال) میں منتقل کیا گیا جہاں 15 جون 1945ء کو وہ رہا کیے گئے۔ مولانا آزاد نے احمد نگر قلعے میں نظر بندی کے دوران اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام جو خطوط بھیجے وہ آج اردو ادب میں ''غبار خاطر'' کے نام سے لازوال تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔ ۔مولانا آزاد کا مجموعی طور پر 9 برس 7 ماہ اور 24 دنوں تک یعنی کل زندگی کا ساتواں حصہ جیل میں گزرا۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانے کے اندر گزرا۔

## 2.4: مولانا آزاد بحیثیتِ صحافی

مولانا آزاد نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا، اس وقت ان کی عمر 11 برس کی تھی۔ لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ اس عمر میں انھوں نے شاعری کے ساتھ گلدستہ کی اشاعت کی غرض سے مصرعہ طرح دے کر ملک کے مختلف شعرا سے غزلیں منگوائیں اور نومبر 1899ء میں ''نیرنگِ عالم'' کے نام سے ایک ماہانہ گلدستہ کلکتہ سے جاری کیا۔ بعد میں ''المصباح'' بھی جاری کیا۔ یہ دونوں ان کے صحافتی مشق کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان میں ان کی صحافتی زندگی کے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے 1903ء میں کلکتے سے ایک ماہنامہ ''لسان الصدق'' جاری کیا ،اس وقت ان کی عمر 15 برس سے کچھ زیادہ تھی۔ یہ ماہنامہ متذکرہ دونوں پرچوں سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ اس میں مولانا آزاد کی صحافتی صلاحیتیں بے حد پختہ نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنے پہلے شمارے میں اس کی اشاعت کا جو مقصد بیان کیا ہے اس سے ان کی علمی، ادبی، صحافتی، سیاسی اور قومی وملّی بصیرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان مقصد کو اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے:۔

1۔ سوشل رفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کا اصلاح کرنا۔

2۔ ترقیِ اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔

3۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگلہ میں

4۔ تنقید یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو۔

ان مقاصد سے مولانا آزاد کی علمی سنجیدگی کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''لسان الصدق'' نے اردو صحافت کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا اور اپنے معیاری مضامین و اندازِ تحریر کے باعث جلد ہی معتبر

رسالہ تصور کیا جانے لگا۔اس کے مضامین کے معیار اور خطیبانہ انداز نے انجمن حمایت اسلام سے وابستہ افراد کو بے حد متاثر کیا۔ چناں چہ انھوں نے اپنے 1904ء کے سالانہ جلسے میں مولانا آزاد کو اجلاس کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ یہ رسالہ کوئی اٹھارہ مہینے تک جاری رہا اس کے بعد 1905ء میں مولانا شبلی نے انھیں لکھنؤ کے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماہانہ رسالے ''الندوۃ'' کی ترتیب و تدوین سے منسلک کر لیا۔مولانا آزاد اکتوبر 1905ء سے مارچ 1906ء تک ''الندوۃ'' سے وابستہ رہے اور اس کے بعد انھوں نے کسی وجہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔''لسان الصدق'' کے مضامین اور اس کے اداریے نے مولانا آزاد کی شہرت دور دور تک پھیلا دی اور ان کے مدّاحوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔یہی وجہ ہے کہ ''الندوۃ'' سے الگ ہونے کے بعد وہ شیخ غلام محمد کے سہ روزہ اخبار ''وکیل'' جو امرتسر سے شائع ہوتا تھا، کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی اور ان کی کوششوں سے اس میں خوشگوار تبدیلیاں واقع ہوئیں۔لیکن یہ سلسلہ بھی بہت دنوں تک نہ چل سکا اور انھیں امرتسر سے واپس جانا پڑا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں انسانی آزادی کے اس بنیادی حق کی وکالت اور غیر مصلحت پسندانہ حمایت پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ، جسے آج انسانی معاشرے کا بنیادی تقاضا تصور کیا جاتا ہے۔اس کے لیے ریاضتوں کے ساتھ ساتھ رواداری، صبر و ضبط اور مذہبی حق پسندی کا تصور ان کے پیشِ نظر رہا ہے۔

سرسید کی اصلاحی تحریک کے آغاز و فروغ کے بعد، اردو صحافت کی روایات کی توسیع و ترقی کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام کی شخصیت بے حد اہم اور ممتاز ہے جنھوں ایک ایسی حیات آفریں نثر قلم بند کی جس کے پیش نظر سجاد انصاری نے انھیں ''فوق البشر'' قرار دیتے ہوئے تحریر کیا کہ ''اگر قران نہ نازل ہو چکا ہوتا تو مولانہ ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم۔'' موت و حیات کے تین مراحل سے گزرنے والے اخبار ''الہلال'' کا پہلا اجرا ۱۳/جولائی ۱۹۱۲ء کو ہوا۔18 نومبر 1914ء تک یہ نکلتا رہا۔پھر بند ہو گیا۔دوبارہ یہ 12/نومبر 1915ء کو ''البلاغ'' کی صورت میں سامنے آیا۔''البلاغ'' 31/1916ء تک جاری رہا۔گیارہ سال کے وقفے کے بعد 10/جون 1927ء کو پھر ''الہال'' کی تجدید ہوئی اور اسی سال 9/دسمبر 1927ء کو بند ہو گیا۔

## اپنی معلومات کی جانچ:۔

سوال نمبر 1۔مولانا آزاد کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(الف) مدینہ (ب) ہندوستان (ج) مکّہ (د) بغداد

سوال نمبر2۔رسالہ ''الہلال'' کا اجرا کس سنہ میں ہوا؟

(الف)31اگست` 1913 (ب)13جولائی 1912 (ج)20نومبر 1914 (د)31جولائی1912

سوال نمبر3۔مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام کیا تھا؟

(الف)محی الدین (ب)معین الدین (ج)معید الدین (د)معراج الدین

سوال نمبر4۔ابوالکلام آزاد کے آباواجداد کس بادشاہ کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے؟

(الف)۔اکبر (ب)۔بابر ج۔اورنگ زیب د۔ہمایوں

سوال نمبر5۔مولانا آزاد کی والدہ کا انتقال کب اور کہاں ہوا۔؟

الف۔1897ءفیض آباد ب۔1901ءدہلی ج۔1899ءکلکتہ د۔1902ءحیدرآباد

سوال نمبر6۔مولانا آزاد کی رسم بسم اللہ خوانی کس نے کرائی؟

الف۔شیخ نوراللہ ب۔شیخ حیات اللہ ج۔شیخ خلیق اللہ د۔شیخ عبداللہ

## 2.5: مولانا آزاد کی صحافت کے امتیازات

مولانا آزاد نے اپنی صحافت کو ملک وملت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر رکھا تھا۔صحافت کی راہ انھوں نے تجارت اور منفعت کی نیت سے اختیار نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے ذریعے وہ باطل اور ظلم کی تاریکیوں کو دور کر کے ایک نئی اور روشن صبح کا اجالا لانا چاہتے تھے،قومی اور ملی بیداری پیدا کرنے کے متمنّی تھے۔اور ایثار وقربانی کے جذبے کے ساتھ غفلتوں،کوتاہیوں اور مایوسیوں میں حیات پرور حوصلوں کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے صحافت کو ذریعہ وسیلہ بنایا اور 13 جولائی 1912ءکو''الہلال'' کا اجرا عمل میں آیا۔انھوں نے اس کے پہلے شمارے میں اپنے مقصد کی جو وضاحت کی وہ ہندوستانی معاشرے کی تعمیر وترقی کے لیے بے حد اہم تھی۔ان کے خیالات قابلِ توجہ ہیں۔

> ''آہ کاش مجھے وہ صورِ قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔اسی ایک صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگزشتگانِ خواب ذ لت ورسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیوں کہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کیونکہ تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے اور تمہیں موت کی جگہ حیات زوال کی جگہ عروج اور زلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے۔''

اسی شمارے میں اپنے ایثار پسندانہ اور مجاہدانہ نقطۂ نظر کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:۔

''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں ونقصان میں آئے ہیں صلہ وتحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت ودشنام کے طلب گار ہیں۔عیش کے پھول نہیں بلکہ خش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔''

مولانا آزاد کے نزدیک اخبار دولت یا شہرت کا ذریعہ نہ تھا بلکہ وہ ایک اعلیٰ نصب العین کو حاصل کرنے کا موثر ذریعہ تھا۔وہ فن صحافت کو ایک ذمہ دارانہ فعل تصور کرتے تھے اور صحافی کا بنیادی کام خیر کی تلاش قرار دیتے تھے۔چنانچہ جب ایک رئیس کی طرف سے ایک خطیر رقم کا چیک بہ طور اعانت بھیجا گیا تو مولانا نے یہ چیک واپس کرتے ہوئے لکھا :۔

''ہمارے عقیدے میں تو جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہو، وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لیے ایک دھبہ اور سرتاسر عار ہے ہم اخبار نویسوں کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں۔

پس اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباو سے آزاد ہونا چاہیے اور چاندی سونے کا سایہ بھی اس کے لیے سمِ قاتل ہے۔جو اخبار نویس رئیسوں کی فیاضیوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی عطیہ اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نورِ ایماں کو بیچیں بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر اور قلندروں کی کشتی کی جگہ قلم دان سے لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور ہر گلی کوچہ ''کام ایڈیٹر کا'' کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔''

مولانا سمجھتے تھے کہ صحافت رائے عامّہ میں انقلاب برپا کرنے کا ایک موثر اور طاقتور وسیلہ ہے اور اس کے ذریعے قومی اور ملّی زندگی میں ایک نئے عزم جذبات کو پیدا کیا جاسکتا ہے۔اس کی صراحت انھوں نے ۲۷/جولائی ۱۹۱۲ء کے ''الہلال'' میں ان لفظوں میں کی ہے:۔

''نہ صرف علم وادب کی ترقی کے لیے بلکہ قومی اور اجتماعی زندگی کی نشوونما کے لیے

ان کا (مطبوعات) کا ناگزیر ہے۔علم وادب کی صحیح ترقی بجائے خود قوم کے اجتماعی ذہن وفکر کی ترقی ہے۔جیسی جیسی اس کی سطح بلند ہوگی اتنی ہی قومی زندگی کی سطح بھی بلند ہوتی جائے گی جہاں تک پریس اور صحافت کا تعلق ہے دنیا اس قدر آگے نکل چکی ہے کہ اب دس برس پیشتر کی صحافت صدیوں کی پرانی چیز معلوم ہوتی ہے۔قومی زندگی کی تعمیر کے لیے ایک بنیاد کی اینٹ زبان ہے۔زبان کی ترقی کے لیے پہلی چیز اس کی ادبیات ہیں۔ادبیات کی نشو ونما اعلیٰ درجے کے رسائل و مطبوعات کے بغیر ممکن نہیں۔''

سیاسی بیداری، حب الوطنی اور قوم دوستی کے احساسات کو چھیڑ کر، مولانا نے حرّیت پسندوں کے جوش وخروش کو آگے بڑھایا اور آزادی کی طلب کو قوم کی ایک فطری طلب بنا دیا۔دسمبر 1912ء کے ''الہلال'' کے یہ جملے آج بھی مولانا کے حرّیت پسندانہ محکم عزائم کی یاد دلاتے ہیں:

''ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدّ وجہد کرنا داخلِ حب الوطنی ہے ۔لیکن مسلمانوں کے لیے ایک فرض دینی ہے اور داخل جہاد فی سبیل اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنا دیا ہے اور جہاد کے معنٰی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند واستبدادِ غلامی توڑنے کے لیے کی جائے۔''

یہ وہ دعوتِ فکر وعمل تھی جسے پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک ''نئی دعوت'' قرار دیتے ہوئے ''The Discovery of India'' میں لکھا تھا:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار ''الہلال'' سے مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔یہ ایک ایسا اندازِ خطاب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجے سے واقف تھے۔سرسید، محسن الملک نذیر احمد اور حالی کے اندازِ بیاں کے علاوہ ہوا کا کوئی زیادہ گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا ''الہلال'' مسلمانوں کے کسی بھی مکتبِ خیال سے اتفاق نہیں رکھتا تھا۔بلکہ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔''

واقعہ یہ ہے کہ ''الہلال'' اردو صحافت کی تاریخ میں ایک سنگِ میل بن گیا تھا۔مولانا نے ''الہلال'' کے ذریعے

اس کی تلقین وتاکید کی کہ مسلمانوں کے سر صرف خدائے واحد کے سامنے جھکتے ہیں وہی عظمت و جبروت کا حامل اور پرستش کے لائق ہے۔خدا کی زمین پر حق وصداقت کی شہادت اور حمایت مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔مولانا نے اپنے ان خیالات کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ ہندوستان کے مسلم معاشرے میں جمود اور تعطل کی جو فضا تھی تیزی کے ساتھ ختم ہونے لگی اور ایک نیا عوامی ماحول، برطانوی استبداد سے متصادم ہونے کے لیے تیار ہونے لگا۔''الہال'' کے اسی حرّیت مندانہ کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے خود مولانا نے لکھا ہے:۔

> ''الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی وسیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کردی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ ان کی مخالفت کے لیے بیور وکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔گورنمنٹ کی تفرقہ اندازانہ پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اگر آزاد ہوگیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی۔مگر''الہلال'' نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں سے مل جانے کی دعوت دی۔اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ خلافت وسوراج ہے۔''

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ''الہلال'' کی یہ صدائے حق ،جتنی مقبول ہوتی گئی ایوان اقتدار اتنا ہی متزلزل ہوتا گیا۔کئی مرتبہ زرضمانت کی طلبی اور ضبطی ہوگئی۔ ہندوستانی صحافت پر برطانوی اقتدار کے اس حملے کا مولانا نے جس جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا، وہ بھی ہماری صحافتی تاریخ کا ایک کارنامہ ہے۔

''الہلال'' سے 1913ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولانا نے پہلے یہ خبر شائع کرنے میں تامل کیا لیکن جب اطراف ملک سے پے در پے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو 24 ستمبر 1913ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا''ابتدائے عشق''۔

> ''انسان صرف کام کے لیے بنایا گیا پس اس کو چاہیے کہ اپنے کام میں مصروف رہے۔یہ بہت ہی ادنیٰ درجے کی اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکّام وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔''

مولانا آزاد نے اس ضمن میں یہ اصول پیش کیا کہ حق وصداقت کی راہ میں کامیابی کے لیے کانٹوں سے الجھنا لازم ہے۔ باطل کے پاس خواہ ساز وسامان کچھ بھی ہو اور وقتی کامیابی اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دے لیکن بالآخر اُسے ناکامی اور محرومی ہاتھ لگے گی۔

آخر میں وضاحت کی کہ 18 ستمبر کو دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی جسے 27 تک داخل کرنے کی مہلت تھی لیکن 23 ہی کو یہ رقم داخل کر دی گئی:۔

''ضمانت کا روپیہ تو اس تاریخ سے بہ طور ایک سرکاری امانت کے علیحدہ رکھ دیا گیا تھا جس دن ''الہلال'' پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لیے روپیہ نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے اور اب تو وقت آ گیا تھا۔ اگر کوئی مانگنے کے لیے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لیے آگے بڑھتے ..... بڑی فکر یہ تھی کہ جب محرومیِ قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوئی تو آئندہ کی فکر کے لیے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟''

اس اقدام کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ مولانا کی عملی سرگرمیوں پر پابندی عاید کرنے کے لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا اور نظر بندیاں بھی ہوئیں۔ مولانا نے تمام سختیوں اور آزمائشوں کو جس خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا، اس کی تاریخ ساز مثال ہمارے سامنے ہے۔ مولانا کی صحافت نے عوامی ذہن کی تربیت میں جو غیر معمولی کامیابی حاصل کی، اس کا اصل سبب، ان کا شفّاف نقطۂ نظر اور صالح نصب العین ہی تھا۔ انھوں نے کالی گھٹاؤں کے پیچھے چمکتے ہوئے سورج کو گویا دیکھ لیا تھا۔ اس لیے ان کے افکار وخیالات میں کہیں کوئی تشکیک نہیں ملتی۔ یکم جولائی 1913ء کے ''الہلال'' کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:۔

''پس سفر سے پہلے زادِ راہ کی فکر کر لو اور طوفان سے پہلے کشتی بنا لو کیوں کہ سفر نزدیک ہے اور طوفان کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں۔ جن کے پاس زادِ راہ نہ ہوگا وہ بھوکے مریں گے اور جن کے پاس کشتی نہ ہوگی وہ سیلاب میں غرق ہو جائیں گے۔ جب تم دیکھتے ہو کہ مطلع غبار آلود ہے اور دن کی روشنی بدلیوں میں چُھپ گئی تو تم سمجھتے ہو کہ برق وباراں کا وقت آ گیا، پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیائے امن و سلامتی کا مطلع غبار آلود ہو رہا ہے۔ دین الٰہی کی روشنی ظلمت کفر وطغیاں میں چھپ

رہی ہے۔ مگر تم یقین نہیں کرتے کہ موسم بدلنے والا ہے اور تیار نہیں ہوتے کہ انسانی بادشاہتوں سے کٹ کر خدا کے سخت جلال کی منادی پھر بلند ہو اور اس کی زمین صرف اسی کے لیے ہو جائے۔''

یہ اندازِ تحریر اس کی وضاحت کرتا ہے کہ مولانا کی صحافت، سیاسی سرگرمی سے زیادہ ایمان کی گرمی پھیلا رہی تھی۔ انھوں نے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا سخت احتساب کرتے ہوئے معاشرتی گمراہیوں کی اصلاح کی کاوش بھی کی اور اس سلسلے میں عوام و خواص کی خوشی اور ناخوشی کی پروا کیے بغیر اپنے مصلحانہ تصور کو دردمندانہ اور مخلصانہ جذبے کے ساتھ پیش کیا۔ یہ عبارت ملاحظہ ہو:۔

''ہم نے اپنی تمام خوبیاں گنوا دی اور دنیا کی مغفوف قوموں کی تمام برائیاں سیکھ لیں۔ ہم اپنوں کے آگے سرکش ہو گئے اور غیروں کے سامنے ذلّت سے جھکنے لگے۔ ہم نے اپنے پروردگار کے آگے دستِ سوال نہیں بڑھایا لیکن بندوں کے دسترخوان کے گرے ہوئے ٹکڑے چننے لگے۔ ہم نے شہنشاہِ راض وسماں کی خدا وندی سے نافرمانی کی مگر زمین کے چند جزیروں کے مالکوں کو اپنا خداوند سمجھ لیا۔ ہم پورے دن میں ایک بار بھی خدا کا نام ہیبت اور خوف کے ساتھ نہیں لیتے پر سینکڑوں مرتبہ اپنے غیر مسلم حاکموں کے تصور سے لرزتے اور کانپتے رہتے ہیں۔''

ابوالکلام آزاد کی صحافت نے ملک و ملّت کو جو پیغام دیا، اس پر آج بھی عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسّلام، حامد علی صدیقی، عبدالواحد کانپوری اور مولانا عبداللہ عمادی جیسی ممتاز شخصیتوں نے مولانا ابوالکلام کی معیت اور رفاقت میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی صحافت کو ہندوستان کی قومی اور ملّی زندگی کے لیے چراغ راہ بنانے میں اہم حصہ لیا ہے۔ مولانا کی صحافیانہ قیادت میں ان حضرات نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور باطل اوہام اور فرسودہ تصورات کا قلع قمع کر کے آزادی کی تحریک کو منزلِ مراد تک پہنچانے کے لیے کامیاب مجاہدے کیے۔

## اپنی معلومات کی جانچ:۔

سوال نمبر 7۔ ''لسان الصدق'' جاری کرتے وقت مولانا آزاد کی عمر کتنی تھی؟

(الف) (ب) (ج 16 ) سال (د)15 سال

سوال نمبر 8۔ غبارِ خاطر مجموعہ ہے؟

(الف)۔ مضامین کا (ب)۔ خطوط کا (ج)۔ غزلوں کا (د)۔ افسانوں کا

سوال نمبر 9۔ بھارت چھوڑ و اندولن کے تحت مولانا آزاد کب اور کہاں کے جیل میں بند کیے گئے؟

(الف) 9 اگست 1922ء قلعہ احمد نگر (ب) 12 اگست 1921ء ہزاری باغ (ج) تہاڑ جیل (د) سنٹرل جیل الہ آباد

سوال نمبر 10۔ مولانا آزاد کی اہلیہ کا نام کیا تھا؟

(الف) احمدی بیگم (ب) زلیخا بیگم (ج) منیزہ بیگم (د) جمیلہ بیگم

سوال نمبر 11۔ مولانا آزاد کے ماہنامہ 'لسان الصدق' کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

(الف) مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح (ب) ہندو مسلم اتحاد (ج) مسلمانوں کو باروزگار بنانا (د) سرسید کے مشن کی مخالفت

سوال نمبر 12۔ مولانا آزاد کس سنہ میں ماہنامہ الندوۃ سے منسلک ہوئے؟

(الف) 1904ء میں (ب) 1906ء میں (ج) 1905ء میں (د) 1907ء میں

سوال نمبر 13۔ اخبار ''وکیل'' کہاں سے شائع ہوتا تھا؟

(الف) دہلی (ب) کلکتہ (ج) بمبئی (د) امرتسر

سوال نمبر 14۔ ''البلاغ'' کا اجرا کب عمل میں آیا؟

(الف) 12 نومبر 1915ء (ب) 20 نومبر 1915ء (ج) 12 نومبر 1916ء (د) 12 جنوری 1918ء

سوال نمبر 15۔ مولانا آزاد کا سنہ وفات کب ہے؟

(الف) 1952ء (ب) 1957ء (ج) 1958ء (د) 1960ء

## 2.6: خلاصہ

مولانا ابوالکلام کی پیدائش مکّہ میں ہوئی، ابتدائی چند برسوں تک مکّہ میں ہی رہے ابتدائی تعلیم والدین سے حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ کلکتہ آ گئے۔ مولانا آزاد کی ذہنی و فکری نشو و نما والدین اور گھر کے ماحول کے علاوہ اس وقت کی کئی اہم سیاسی و سماجی شخصیات کے زیر اثر ہوئی۔

مولانا آزاد کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی ان کی سرگرمیوں کے متعدد میدان تھے اور وہ ہر جگہ منفرد مقام کے حامل

تھے۔ وہ صحافی تھے، ادیب اور انشا پرداز تھے، عالم دین تھے، مفسر قرآن تھے، مفکر اور دانشور تھے، سیاست داں تھے تحریک آزادی کے ممتاز سپاہی تھے۔ مولانا آزاد نے ملک کی سیاسی جدوجہد میں ایک فیصلہ کن حصہ لیا اور قومی زندگی میں بہت سے ایسے موڑ آئے جس میں انھوں نے گاندھی اور نہرو کے دوش بدوش انقلابی قیادت کی۔ انھوں نے جنگِ آزادی کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا، اور اپنی صحافتی صلاحیتوں کو قومی وملّی خدمات کے لئے وقف کر دیا تھا۔ آزادی کے بعد وہ ملک کے پہلے وزیرِ تعلیم بنائے گئے۔ انھوں نے اس اہم عہدے پر رہتے ہوئے تعلیم کے میدان میں کئی اہم اصلاحیں کیں۔ سائنس اور جدید تعلیم کے فروغ میں خصوصی دلچسپی لی۔ بلا شبہ وہ جدید ہندوستان کے معماروں میں سے ایک تھے۔

## 2.7: معروضی سوالات کے جوابات

سوال نمبر۔1 (ج)، 2 (ب)، 3 (الف)، 4(ب)، 5 (ج)، 6(د)، 7(د)، 8(ب)، 9(الف)، 10۔(ب)، 11(الف)، 12(ج)، 13(د)، 14(الف)، 15(ج)

## 2.8: نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1۔ مولانا آزاد کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر 2۔ جنگِ آزادی میں مولانا آزاد کے کردار پر اظہار خیال کیجیے؟

سوال نمبر 3۔ مولانا آزاد بحیثیت صحافی مضمون قلم بند کیجیے؟

سوال نمبر 4۔ مولانا آزاد کی ادبی خدمات کا مختصراً تعارف پیش کیجیے؟

سوال نمبر 5۔ مولانا آزاد نے اردو صحافت کو ایک نئی راہ دکھائی بحث کیجیے؟

## 2.9: فرہنگ

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| بصیرت | آگاہی، دانائی | صحافت | اخبار نویسی |
| آشنا | واقف، جان پہچان | سکونت | بود و باش، قیام |
| استعداد | قابلیت، لیاقت | انحراف | پھر جانا، مخالفت کرنا |

| | | | |
|---|---|---|---|
| جدوجہد | کوشش | حربے | ہتھیار |
| وساطت | وسیلہ، ذریعہ | ضبط | تحمل، برداشت |
| مداح | تعریف کرنے والا | حمایت | طرف داری |
| مشتعل | شعلہ زن، بھڑکتا ہوا | ممتاز | عزت دیا ہوا، نامور |
| تجدید | ایجاد، اختراع، نیا پن | منفعت | نفع، فائدہ |
| فلاح | نجات، بھلائی | بہبود | بہتری، بھلائی |
| صدائے رعد | بجلی کی سی آواز | دشنام | گالی گلوج، برا نام |
| خطیر | کثیر، بڑا، بہت | عار | غیرت، شرم |
| پرستش | عبادت، پوجا | جمود | بے حسی، ٹھہراؤ، بے حرمتی |
| تعطل | بے کار، کام بند | استبداد | ضد، ہٹ |
| متصادم | ٹکرا جانے والا | اقتدار | طاقت ور ہونا، اختیار، مرتبہ |
| متزلزل | لرزنے والا، کانپنے والا | اقدام | پیش قدمی کرنا |
| ممنوع | ناجائز، ناروا | احتساب | گننا، شمار کرنا، مواخذہ |
| اوہام | وہم کی جمع، اندیشے، وسوسے | فرسودہ | گھسا ہوا، کہنہ |

## 2.10: سفارش کردہ کتابیں


1۔مولانا ابوالکلام فکر وفن: ملک زادہ منظور احمد۔

2۔مولانا آزاد ایک مطالعہ، مرتب۔ابوسلمان شاہجہاں پوری

3۔مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے، مرتب۔خلیق انجم

4۔ابوالکلام آزاد آزاد۔عبدالقوی دسنوی

5۔آزاد ایک صحافی۔عابد رضا بیدار۔


# اکائی نمبر-3 حسرتؔ موہانی بحیثیتِ صحافی

## ساخت:

3.0 اغراض ومقاصد
3.1 تمہید
3.2 حسرت موہانی: حالات زندگی
3.3 حسرت موہانی: شخصیت وکردار
3.4 حسرت موہانی بحیثیتِ صحافی
3.5 اپنی معلومات کی جانچ
3.6 خلاصہ
3.7 معروضی سوالات کے جوابات
3.8 نمونۂ امتحانی سوالات
3.9 فرہنگ
3.10 سفارش کردہ کتابیں

## 3.0: اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ:۔

☆ حسرتؔ موہانی کی زندگی کے حالات، ان کی شخصیت اور سیرت سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرسکیں گے۔
☆ حسرتؔ موہانی کی سیاسی زندگی اور تحریک آزادی کی جدوجہد میں ان کے کارنامے سے واقفیت حاصل ہوگی۔
☆ حسرتؔ موہانی کی صحافتی خدمات کے علاوہ ان کی صحافت کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔
☆ حسرتؔ موہانی کی مجاہدانہ زندگی اور قید وبند میں گزرے دنوں کا علم ہوگا۔

## 3.1 تمہید

مولانا حسرتؔ موہانی کا شمار بیسویں صدی کے ایک بلند پایہ شاعر، ادیب، صحافی اور مجاہد آزادی میں ہوتا ہے۔ حسرتؔ موہانی ان لوگوں میں تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا تمام حصہ قوم وملّت کی تعمیر اور اس کی فلاح وبہبود میں صرف

کیا۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی انگریز مخالف سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے بعد میں تحریک آزادی سے وابستہ ہوکر آزادی کی جدوجہد کی لہر کو تیز کرنے اور قومی وملّی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ حسرتؔ موہانی نے اپنے رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' کے ذریعہ جوانوں میں جوش و جذبہ پیدا کرنے اور انگریزوں کی ظلم و بربریت کو بے نقاب کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا۔ اس کی پاداش میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ حسرتؔ موہانی پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے مکمل آزادی کا نعرہ دیا تھا۔ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی حسرتؔ کے کارنامے ہماری ادبی تاریخ کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ ان کی غزلوں میں جہاں ندرت خیال پایا جاتا ہے وہیں کرشن بھگتی کے عناصر بھی موجود ہیں۔

## 3.2 حسرتؔ موہانی: حالات زندگی

حسرت موہانی کا اصل نام فضل الحسن تھا اور حسرتؔ تخلص۔ ان کی پیدائش سنہ 1881ء میں لکھنؤ سے متصل ضلع انّاؤ کے ایک قصبے موہان میں ہوئی۔ ابتدائی مذہبی تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے موہان ہی کے اردو مڈل اسکول میں داخلہ لے کر مڈل کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور وظیفے کے مستحق قرار پائے۔ ہائی اسکول کی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول، فتح پور میں حاصل کی۔ یہاں بھی انھوں نے کامیابی کا سابقہ رکارڈ برقرار رکھا اور سرکاری وظیفہ حاصل کر کے آئندہ سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ ایم۔اے۔او کالج اس وقت الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ چناں چہ اس یونیورسٹی سے سنہ 1901ء میں انٹرمیڈیٹ اور سنہ 1903ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران انھیں انگریز اساتذہ سے قریبی روابط اور مغربی علوم کے وسیع تر مطالعے کے نتیجے میں اقوامِ مغرب کی سیاست و معیشت کو بہ خوبی سمجھنے اور ان کے مضمرات پر غور کرنے کے بہترین مواقع حاصل ہوئے۔ انھوں نے اس زمانے میں کالج کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چناں چہ اگر ایک طرف ان کی نہایت متحرک اور فعال شخصیت کی بدولت شعبۂ اردو میں قائم انجمن اردوئے معلیٰ کی کارگزاریوں میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف انھوں نے یونین کے جلسوں میں پرجوش تقریریں کر کے اور ولولہ انگیز نظمیں سنا کر طلبہ میں قومی وقار کے تحفّظ اور حصولِ آزادی کے جذبے کو عام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

سنہ 1903ء جو ایم۔اے۔او کالج میں حسرتؔ کی طالب علمی کا آخری سال تھا، ان کی زندگی میں ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سالانہ امتحان میں شرکت سے کچھ ہی دن قبل پرنسپل مسٹر ماریسن سے بحث و تکرار کی بنا پر کالج سے ان کا اخراج عمل میں آچکا تھا۔ طالب علمانہ زندگی کے دوران باغیانہ اندازِ فکر کے اظہار کا یہ وہ آخری موقع تھا جس کے ساتھ ان کے مستقبل کا لائحۂ عمل متعین ہوگیا۔ اس کے بعد انگریز حکمرانوں کے خلاف بغاوت و سرکشی اور

مجاہدین آزادی کی حمایت وہم نوائی ان کا واحد مقصدِ زندگی اور درویشی وقلندری ان کا پسندیدہ مسلکِ حیات بن گئی۔ ڈپٹی کلکٹر سے کالج کی پروفیسری تک عیش وآسائش کے تمام وسائل کو خیر باد کہہ کر انھوں نے صحافت کا پیشہ اپنایا اور اسی سال جولائی میں ''اردوے معلیٰ'' کے نام سے ایک ماہ نامے کا اجرا کیا جو اردو صحافت اور ادب کی تاریخ میں کئی اعتبار سے انفرادیت اور اہمیت کا حامل ہے۔

''اردوے معلیٰ'' میں شروع ہی سے ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ سیاسی مضامین بھی شائع ہونے لگے تھے لیکن ابتدائی دور میں ان کا لہجہ کسی قدر نرم یا معتدل ہوتا تھا، تاہم اس کی تہ میں انگریز دشمنی کی ایسی چنگاریاں دبی ہوتی تھیں جو ہوا کی معمولی سی تحریک پر شعلۂ جوّالہ بن سکتی تھیں۔ رفتہ رفتہ حرفِ برہنہ کی شکل اختیار کرتی گئی تا آں کہ سنہ 1908ء کے کسی شمارے میں ''مصر میں انگریزوں کی حکمتِ عملی'' کے عنوان سے ایک ایسا مضمون شائع ہوا جس میں شورش کی لے بہت تیز اور بغاوت کا لہجہ نہایت پرزور تھا۔ یہ مضمون حسرتؔ کا لکھا ہوا نہ تھا لیکن انھوں نے اصل مضمون نگار کو حکومت کے عتاب سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کا نام شائع نہ کر کے بہ حیثیت ایڈیٹر ساری ذمے داری اپنے سر لے لی تھی۔ چناں چہ 23 جون سنہ 1908ء کو ان کے خلاف بغاوت پر اکسانے کی دفعہ کے تحت مقدمہ قائم ہوا اور 4 اگست کو دو سال قیدِ بامشقّت اور پانچ سو روپے جُرمانے کی سزا ہوگئی۔ علی گڑھ جیل میں چند دنوں کے عارضی قیام کے بعد انھیں الہ آباد سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ بعد میں والد کی دائر کردہ اپیل کے نتیجے میں ہائی کورٹ نے ان کی سزا میں ایک سال کی تخفیف کر دی۔ اسی دوران ان کے والد کا انتقال ہوگیا تو بڑے بھائی نے خاندان کی غیر منقسم جائداد کو نیلام سے محفوظ رکھنے کے لیے جُرمانے کی رقم اپنے پاس سے ادا کر دی۔ جہاں تک حسرتؔ کا تعلق ہے، وہ بہ ذات خود انگریز حکّام سے کسی قسم کی عرض معروض کے قائل اور حصولِ رعایت کے روادار نہ تھے۔ چناں چہ انھوں نے ایک سال کی باقی مدتِ سزا جس میں سرکاری ضابطوں کے تحت مزید کچھ دنوں کی تخفیف ہوگئی تھی، نہایت صبر وشکر کے ساتھ الہ آباد کی اسی جیل میں گزاری۔

حسرت موہانی کے عہد میں قید خانے میں سزا یافتہ مجرم رہتے تھے۔ ایسے مجرم جنھوں نے چوری کی تھی، ڈاکہ ڈالا تھا یا کوئی دوسرا قید خانوں میں اے کلاس، بی کلاس اور اسپیشل وارڈ کا کوئی وجود نہیں تھا چنانچہ مولانا کو جب جیل کی سزا ہوئی تو انھیں چور ڈاکو قاتل اور غنڈوں کے ساتھ رہنا پڑا۔ اگر چہ وہ بی اے تھے، شاعر تھے، مدیر تھے اور سیاسی رہنما تھے۔ ان کو عام قیدیوں کی طرح جیل کے موٹے جھوٹے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ جیل کا بدمزہ کھانا کھانا پڑتا تھا، وارڈن کی گالی، ہنٹر اور بدتمیزیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ مولانا سے چکی پسوائی جاتی تھی اور کولہو چلوایا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ

مولانا سے روزانہ ایک من گیہوں پسوایا جاتا تھا، مونج کی رسّیاں بٹوائی جاتی تھیں، بیل کی طرح کوئیں سے پانی کھنچوایا جاتا تھا۔ رمضان کے مہینے میں بھی ان کو ایک من گیہوں پیس کر دینا پڑتا تھا۔ اس مشقت کا ذکر انھوں نے مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی　　اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

بغیر افطاری اور سحری روزے رکھتے تھے اور جیل کی مشقت بھری زندگی بھی گزارتے تھے اس حال کا اظہار انھوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

کٹ گیا قید میں ماہ رمضان بھی حسرتؔ　　گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

یہ امر مسلّم ہے کہ آزادی کی جنگ میں بڑے بڑے رہنما کود پڑے اور آواز میں باغیانہ تیور اور انقلابی جوش بھر آیا۔ ہندوستان کی فضاؤں میں آزادی کے نعرے گونجنے لگے۔ محمد علی، شوکت علی زندہ باد، گاندھی جی کی جے، اللہ اکبر، ست سری اکال، انقلاب زندہ باد کی آوازوں سے سارا ہندوستان گونج اٹھا۔ گویا ایک انقلابی دور کا آغاز ہوا اور ہندوستان کا بچہ بچہ آزادی کا خواہاں ہو اس کے لیے لوگ جیل جانا اپنے لئے عزت کا سبب جانتے تھے مگر حسرتؔ اس دور میں بھی دوسروں سے الگ رہے وہ پکّے اور سچّے انقلابی تھے۔ آر پار کی لڑائی لڑنا چاہتے تھے۔ ان کے یہاں مصلحت کوشی بزدلی کا دوسرا نام تھا اسی لیے گاندھی جی سے جو عدم تشدد کے حامی تھے ان کی بہت زیادہ نہیں بنی۔ اگرچہ عام انقلابیوں اور مجاہدوں کے خیال میں گاندھی جی کا عدم جنگ لڑ رہا تھا۔ احمد آباد میں کانگریس کا ایک تاریخی اور ہنگامہ خیز اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں عدم تشدد کی خوبیاں اور برکتیں بیان کی جارہی تھیں جو مقرر آتا بس اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا مگر جب حسرتؔ موہانی آئے تو جلسے کا رنگ بدل گیا انھوں نے بہت مستحکم ڈھنگ سے ببانگ دہل اعلان فرمایا:۔

**''عدم تشدد ہمارے درد کا درماں نہیں ہے ہمیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے انگریز کے بڑے تشدد کے مقابلہ میں ہمیں بھی چھوٹے تشدد کا آغاز کرنا چاہیے وہ ہماری گردن کاٹ سکتا ہے ہم اس کا سر پھوڑ سکتے ہیں ہمیں طے کر لینا چاہیے کہ نہ ہم انگریز کو تسلیم کریں گے نہ اس کی حکومت کو نہ اس کے بنائے ہوئے آئین وقانون کو۔''**

گاندھی جی پر سکتہ طاری ہو گیا۔ حکیم اجمل خاں حیرت زدہ رہ گئے۔ جلسے کے کونے کونے سے اس تجویز کو منظور

کرنے کے لیے نعرے لگنے لگے۔ایک امر واقعہ ہے کہ گاندھی جی نے اس تجویز کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا اور اپنی ذات کا حوالہ دے کر اس تجویز کو مسترد کرا دیا ورنہ اس کا منظور ہونا یقینی تھا۔مولانا حسرتؔ موہانی اصولی طور پر عدم تشدد کے مخالف تھے۔اپنے ایک شعر میں انھوں نے فرمایا ہے۔

جسے کہتے ہیں اہنسا اک اصول خود کشی تھا عمل اس پہ نہ کوئی خاص کرتا نہ عوام کرتے

مولانا کے اس رویہ کو دیکھتے ہوئے حکومت ہند نے ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا پولیس ان کے پاس آئی اور گرفتاری کا وارنٹ دکھا کر بولی کہ چلیے آپ کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔مولانا نے جواب دیا کہ وہ رضا کارانہ طور پر گرفتار نہیں ہوں گے البتہ پولیس ان کو بزور گرفتار کر سکتی ہے۔پولیس آفیسر برابر گذارش کرتا رہا کہ گرفتاری دے دیجئے مگر مولانا اپنی بات پر قائم رہے۔حالاں کہ گرفتاری سے قبل انھیں تھانے سے عدالت میں پیش کیا گیا۔عدالت نے انھیں چھ برس قید بامشقت کی سزا سنائی۔

جب مولانا جیل چلے گئے تو ڈاکٹر انصاری نے بیگم حسرتؔ موہانی کو روزانہ کے مصارف کے لیے کچھ رقم منی آرڈر سے بھیجی بیگم حسرتؔ نے منی آرڈر واپس کر دیا اور ڈاکٹر انصاری کو لکھا کہ وہ انگریزوں کے دوست کی مدد قبول نہیں کر سکتیں۔ڈاکٹر انصاری نے علی گڑھ میں بیگم حسرتؔ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر بیگم صاحبہ نے ملنے سے انکار کر دیا۔

مولانا حسرتؔ موہانی کے انقلابی جوش وخروش سے کانگریس کے بڑے بڑے راہنما گھبراتے تھے۔ان کی دلی خواہش ہوئی کہ کانگریس کے اجلاسوں میں مولانا شامل نہ ہوں۔چنانچہ کانپور میں مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔اس اجلاس میں پنڈت موتی لال نہرو اور گاندھی جی جیسے بڑے رہنما بھی شریک ہو رہے تھے۔سبھوں کی خواہش تھی کہ مولانا اس جلسہ میں شریک نہ ہوں چنانچہ سازش کر کے انھیں ڈیلی گیٹ بننے نہیں دیا گیا مگر مولانا کب ہمت ہارنے والے تھے وہ راتوں رات فتح پور گئے اور ڈیلی گیٹ بننے میں کامیاب ہو گئے۔

1928ء میں قیصر باغ کی شاہی بارہ دری میں مہاراجہ سر علی خاں کی قیادت، ڈاکٹر انصاری کی صدارت اور موتی لال نہرو کی حمایت میں کل جماعتی کانفرنس (All Party Conference) ہو رہی تھی۔اجلاس شروع ہوا اور حسرتؔ موہانی کی مخالفت کا آغاز بھی ہوا۔وہ موتی لال سے بہت ناراض تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ نہرو رپورٹ میں Dominion State کو ہندوستانیوں کا مطمح نظر قرار دیا گیا تھا جبکہ مولانا حسرتؔ موہانی مکمل آزادی سے کم کسی بات پر رضامند نہیں تھے۔

مولانا حسرتؔ موہانی آزادی کے ایسے متوالے تھے کہ وہ اس کی حصولیابی کے لیے نہ تو پارٹی کا خیال کرتے تھے

اور نہ جماعت کا جہاں ہندوستانیوں کو اکٹھا دیکھتے اپنے خیالات بے جھجک پیش کرتے اور انگریزوں کے خلاف عام رائے بنانے کی سعی فرماتے۔ چنانچہ 1937ء آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں شریک ہوئے۔ محمد علی جناح کرسیٔ صدارت پر فائز تھے مسلم لیگ کے چوٹی کے لیڈر مسٹر فضل الرحمٰن، سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب سب موجود ہیں مگر جناح اعلان کرتے ہیں کہ مولانا حسرتؔ موہانی ایک تجویز پیش کریں گے۔ مولانا آئے اور مکمل آزادیٔ ہند کی تجویز پیش کر دی جبکہ مسلم لیگ کا نصب العین ڈومینن اسٹیٹ Dominion State کا تھا۔ تجویز کا پیش کرنا تھا کہ اجلاس میں موجود سارے لوگوں نے بیک زبان اس کی حمایت کی اور اسی وقت سے مسلم لیگ کا نصب العین مکمل آزادی ہو گیا۔ ملتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔

حسرتؔ موہانی نے 1945-1946ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ حسرتؔ موہانی مصلحت کوشی سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور ہمیشہ جرأت رندانہ کا ثبوت دیتے تھے اسی لیے تقسیم ہند کے بعد انھوں نے ہجرت کرنے کے بجائے ہندوستان میں رہنا پسند فرمایا۔ وہ جب تک زندہ رہے پسماندہ، ستم زدہ اور مسلمانوں کے لیے پارلیمنٹ میں جنگ جاری رکھی۔ انھوں نے ہمیشہ حق کو حق کہا اور اس کے اظہار میں خاموش رہنا گناہ سمجھا۔

قید سے رہائی کے بعد حسرتؔ کے بعض دوستوں اور بہی خواہوں نے انھیں مشورہ دیا کہ ''اردوے معلیٰ'' سیاست سے کنارہ کش ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو احتیاط اور نرم گوئی سے کام لے، لیکن حسرتؔ نے روزِ اوّل اپنے لیے جس راہ کا انتخاب کر لیا تھا، اس میں کسی قسم کی تبدیلی تو دور کی بات ہے، اس کے متعلق غور و فکر بھی ان کی شریعت میں جائز نہ تھا۔ وہ جس طرزِ زندگی کے قائل تھے اور جن اقدار پر ایمان رکھتے تھے، ان کا اندازہ ان کے اس شعر سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے:

حق سے بہ عذرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گریز　　اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر

یہی بات کسی اور موقعے پر انھوں نے اس طرح بھی کہی تھی:

**''یقین یا عقیدہ، عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے۔''**

اسی غیر متزلزل ایمان و یقین کی بنا پر سنہ 1910ء میں ''اردوے معلیٰ'' کے دوبارہ اجرا کے بعد بھی حسرتؔ کی

تمام سابقہ سرگرمیاں بہ دستور جاری رہیں۔ چناں چہ 13 مئی 1913ء کو پریس ایکٹ کی بعض دفعات کے خلاف ورزیوں کے الزام میں انھیں حکومت کی طرف سے یہ نوٹس ملا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر تین ہزار روپے بہ طور زرِ ضمانت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس جمع کر دیں۔ حسرتؔ کے لیے نہ تو اس خطیر رقم کی فراہمی ممکن تھی اور نہ حکمِ سرکار کی بجا آوری ان کے مزاج سے مطابقت رکھتی تھی، اس لیے انھوں نے ایک ہفتے کی اس مہلت کو غنیمت جانتے ہوئے جون کے مہینے کا پرچہ مرتب کر کے شائع کر دیا اور اس کے اداریے میں حکومت کے اس تازہ فیصلے کو نہایت سخت الفاظ اور درشت لہجے میں ہدفِ تنقید بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ''اردوے معلیٰ'' کی اشاعت کا اجازت نامہ منسوخ کر دیا گیا اور رسالہ بند ہو گیا۔

اس واقعے کے کچھ دنوں بعد ہی سنہ 1914ء میں کان پور میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، حسرتؔ بھی اس میں شریک ہوئے۔ اس کے ایک جلسے میں کان پور کی مسجد سے متعلق بعض امور کے تصفیے کے سلسلے میں لارڈ ہارڈنگ کے شکریے کی تجویز پیش کی گئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول اس نازک موقعے پر صرف دو نوجوانوں نے اس کی مخالفت میں بولنے کی جرأت دکھائی، ان میں سے ایک حسرتؔ موہانی تھے اور دوسرے مولوی عبدالودود بریلوی۔ وائسرائے کے شکریے کی تجویز پر حسرتؔ کا یہ ردِّعمل ایسا جرم نہ تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا، اس پر مستزاد یہ کہ اسی زمانے میں پہلی جنگِ عظیم بھی شروع ہو گئی۔ حالات کی اس نزاکت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ان کے خلاف نظر بندی کا حکم جاری کر دیا گیا۔ حسرتؔ اس قسم کے احکام کو خاطر میں لانے والے نہ تھے، چناں چہ وہ موقع بہ موقع اس کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ بالآخر سنہ 1916ء کے آغاز میں انھیں گرفتار کر کے للت پور جیل میں قید کر دیا گیا۔ یہ قیدِ فرنگ کا دوسرا دور تھا جو سنہ 1917ء کے اوائل میں ختم ہوا۔

حسرتؔ کی تیسری اور آخری گرفتاری تحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں 22 اپریل سنہ 1922ء کو عمل میں آئی۔ اس بار بھی ان کے لیے دو سال کی سزا تجویز ہوئی تھی، لیکن حسبِ سابق وقت سے پہلے ہی رہا کر دیے گئے۔ گرفتاریاں اس دور کے مجاہدینِ آزادی کا مقدر اور رات دن کا معمول تھیں، اس لیے بہ اعتبارِ ظاہر حسرتؔ کی رودادِ زندگی میں ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ اصل اہمیت اس خلافِ معمول اور بہیمانہ سلوک کی ہے جو اس زمانے میں اور بالخصوص پہلی گرفتاری کے بعد ان کے ساتھ روا رکھا گیا اور جسے وہ نہایت بے جگری اور صبر و ضبط کے ساتھ انگیز کرتے رہے۔ قید سے رہائی کے بعد انھوں نے اس سلسلے کے اپنے جو تجربات ''مشاہداتِ زنداں'' کے عنوان سے ''اردوے معلیٰ'' کے کئی شماروں میں بالاقساط قلم بند کیے تھے، وہ ان کے غیر معمولی عزم و استقامت اور آزادیِ وطن کے لیے بے مثال جذبۂ فداکاری و جاں نثاری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس سرگذشت کے ضمن میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

''صبح سے شام تک چکّی پیسنا بجائے خود ایک سخت مشکل کام تھا لیکن راقم الحروف کے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ابتدائے قید سے لے کر آخر تک کوئی کتاب، رسالہ یا اخبار کسی قسم کا پڑھنے کو نہ ملا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ شب و روز میں جس شخص کا تقریباً کل وقت شغلِ نوشت وخواند میں گزرتا ہو، اسے دفعتاً ان تمام دل چسپیوں سے یک قلم عرصۂ دراز کے لیے علیحدہ کر دینا کتنے بڑے جبر کی بات ہے۔''

(ماخوذ از ''قید فرنگ'' شائع کردہ مکتبہ نیا راہی، کراچی، اگست 1958ء، ص78)

''اردوئے معلیٰ'' کے نادر و نایاب کتب خانے کی بربادی بھی حسرتؔ کے لیے اس سے کچھ کم اذیت ناک واقعہ نہ تھی۔ یہ کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت ان کے اپنے اندازے کے مطابق تین چار ہزار روپے سے کسی طرح کم نہ تھی، زرِ جرمانہ کی وصولی کے نام پر صرف ساٹھ روپے میں نیلام کر دیا گیا تھا۔ اپنے عزیز ترین سرمایے کی اس تباہی پر حسرتؔ نے اس طرح خون کے آنسو بہائے ہیں:

''اس جرمانے کی بدولت کتب خانۂ ''اردوئے معلیٰ'' کی جو حالت ہوئی، اس کا بیان نہایت دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم الحروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دقّتوں سے بہم پہنچایا تھا، جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے دواوینِ شعرا وغیرہ کے تھے، جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی، ان سب کو پولس کے جاہل جوان ٹھیلوں میں بھر کے اس طرح سے لے گئے، جیسے کہ لکڑی یا بھُس لے جاتے ہیں۔ کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری، اس کا ذکر کرتے ہمارا دل دکھتا ہے۔''

(ایضاً ''قید فرنگ''، ص98)

قیدِ سخت کی سزا پانے والے مجرموں کو چکّی، ایک ہفتے، پندرہ روز، ایک مہینے یا زیادہ سے زیادہ تین مہینے پیسنا پڑتی تھی، اس کے بعد انھیں آسان مشقّتوں پر بھیج دیا جاتا تھا۔ حسرتؔ کے اپنے الفاظ میں یہ شرف انھی کو حاصل ہوا کہ

تقریباً سارا زمانۂ قید اسی ایک منحوس شغل میں گزارنا پڑا۔ جب رہائی کا وقت قریب آیا تو حکّام جیل کو احساس ہوا کہ ان کے ساتھ خلافِ قاعدہ اور خلافِ معمول زیادہ سختی برتی گئی ہے۔ چناں چہ ایک روز شام کے وقت نائب جیلر نے ان سے دریافت کیا کہ اگر تم کو کوئی دوسری مشقّت دی جائے تو تم اسے پسند کرو گے یا نہیں؟ حسرتؔ نے خلافِ توقع اس پیشکش کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ تخفیفِ اذّیت سے اس انکار کی کیا وجہ تھی، انھی کی زبانی سنیے:۔

> ''راقم الحروف کو ان کی نیت کا حال معلوم ہو گیا تھا کہ چند روز کے لیے کسی کارخانے بھیجنے سے اس کے سوا اور کوئی غرض نہیں ہے کہ مجھ سے تمام میعاد چکّی پسوانے کے الزام سے بچنے اور قسم کھانے کی گنجائش نکل آئے۔ پس میں نے تبدیلیِ مشقّت کے اس تحفے کو قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا۔''

( ایضاً

،''قید فرنگ''، ص98)

حسرتؔ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور کئی بار حج بیت اللہ کا شرف حاصل کرنے کے باوجود مذہبی سخت گیری انھیں چھو تک نہیں سکتی تھی۔ وہ جس طرح مختلف اولیاے کرام کے مزارات پر حاضری کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے، اسی طرح جنم اشٹمی کے موقعے پر متھرا جا کر کرشن جی کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرنا بھی ان کے معمولات میں شامل تھا۔ ان کے مجموعۂ کلام میں لوگ گیتوں کی شکل میں ایسی متعدّد نظمیں موجود ہیں جو ان کی اس کرشن بھکتی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان کی نظموں کا ایک ایک لفظ پریم رس میں ڈوبا ہوا ہے اور اُس والہانہ کیفیت سے مملو ہے جو گوپیوں کے اظہارِ عشق میں پائی جاتی ہے۔ حسرتؔ کی اس مذہبی رواداری اور کشادہ قلبی نے ان کی شخصیت کو انسان دوستی اور روشن خیالی کا ایک جیتا جاگتا مرقع بنا دیا تھا۔ احترامِ آدمیت ان کے نزدیک انسانیت کی سب سے اعلیٰ وارفع قدر تھی۔ وہ اس پر کس صدقِ دل کے ساتھ عامل تھے، اس کا اندازہ جیل کے ایک ساتھی اور مجاہدِ آزادی سوامی شوانند کے بارے میں ان کے مندرجہ ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے:۔

> ''حبّ وطن کے جرم میں سزایاب کتنے نوجوان آج فرنگی قید خانوں میں اس تکلیف اور کس مپرسی کی حالت میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں کہ ان کے چند اعزا واقربا کے سوا اور کسی شخص کو کبھی یاد تک نہ آتی ہوگی۔ جس طرح موت سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مرنے والے کی یاد دلوں سے فراموش ہو جاتی ہے،

اسی طرح ان گرفتارانِ بلا کو بھی لوگوں نے گویا مردہ سمجھ لیا ہے۔ حالاں کہ ان میں سے بعض مردانِ خدا اس درجے کے لوگ ہیں کہ صفاتِ انسانی ان کی ذاتِ پاک کے ساتھ نسبت رکھنے پر یقیناً فخر کرتے ہوں گے۔ وطن پرستی، حریت پسندی، آزاد خیالی، بلند حوصلگی، بے تعصبی، خلوص اور خدا آگاہی، ان جملہ صفات کا مجموعہ اگر کسی ایک شخص کی ذات میں یقینی طور پر بہ آسانی مل سکتا ہے، تو وہ سوامی شوانند کی ذات ہے جن کی نسبت قید ہونے کی بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ آج کل بنارس کے سنٹرل جیل میں معتکف ہیں۔''

(ایضاً، ''قید فرنگ''، ص116-117)

حسرتؔ موہانی نے اپنی زندگی کا تمام تر حصہ جنگِ آزادی کی جد و جہد اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر نو میں صرف کر دیا۔ ان کی شعری و نثری خدمات کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ حسرتؔ موہانی ملک کے ایسے سپوت تھے جن کے کردار و عمل سے سیاسی، سماجی تبدیلیوں کے ساتھ وطن عزیز سے محبت کرنے کا جذبہ عام ہوا۔ اس عظیم سیاسی رہنما و قائد نے آزادی کے محض چار برس کے بعد یعنی 1951ء میں ملک عدم کا سفر طے کیا۔

## 3.3: حسرتؔ موہانی: شخصیت و کردار

حسرتؔ نے سنہ 1903ء میں تعلیم سے فراغت کے کچھ دنوں بعد ہی کانگریس کی باقاعدہ رکنیت حاصل کر لی تھی اور اس کے جلسوں میں پابندی کے ساتھ شرکت کرنے لگے تھے۔ سنہ 1904ء کے بمبئی اجلاس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے ان کی موجودگی اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس زمانے میں کانگریس واضح طور پر دو دھڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک دھڑا شدّت پسند تھا اور دوسرا اعتدال پسند۔ شدّت پسندوں کے رہنما بال گنگا دھر تلک تھے جب کہ اعتدال پسندوں کے قیادت گوپال کرشن گوکھلے اور دادا بھائی نوروزی کے ہاتھ میں تھی۔ حسرتؔ شروع سے آخر تک شدّت پسندوں کے دھڑے میں شامل رہے اور وقتاً فوقتاً پارٹیاں بدل کر ہر اس جماعت کو آزماتے رہے جو انھیں انگریزوں کی مخالفت میں زیادہ سرگرم و پر جوش نظر آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے تا عمر بال گنگا دھر تلک اور نیتا جی شبھاش چندر بوس کے علاوہ کسی سیاسی رہنما کی غیر مشروط پیروی قبول نہیں کی۔ چناں چہ کانگریس میں رہتے ہوئے کئی بار گاندھی جی کی قیادت کو نہایت بے باکی اور پوری شدّت کے ساتھ چیلنج کیا اور جب مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو وقت

پڑنے پر کوئی طاقت انھیں مسٹر جناح کی مخالفت سے نہیں روک سکی۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو ''انقلاب زندہ باد'' جیسا ولولہ انگیز نعرہ دینے والے یہی ہمارے مولانا حسرتؔ موہانی تھے۔اس بلند آہنگ نعرے میں ان کی حریت پسندی اور شوریدہ سری کی گونج آج بھی سنی جاسکتی ہے۔

سودیشی تحریک کو عوامی تحریک بنانے میں حسرتؔ نے جس خلوص اور بے ریائی کا مظاہرہ کیا، اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔انھوں نے اپنی عوامی زندگی کی ابتدا سے اواخرِ عمر تک صرف دیسی اور موٹے کپڑے استعمال کیے اور کبھی کسی ولایتی کپڑے کو ہاتھ تک لگانا گوارا نہیں کیا۔مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ سنہ 1910ء کی سردیوں میں حسرتؔ ایک بار لکھنؤ میں ان کے مہمان ہوئے۔مولانا ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے، اس لیے انھوں نے پاس ہی کے ایک دوسرے کمرے میں جس میں کرسچین کالج کے چند طلبہ مقیم تھے، ان کے سونے کا انتظام کر دیا۔میزبانوں نے ان کی پائنتی ایک کمبل رکھ دیا تھا جو ولایتی تھا۔حسرتؔ نے پوری رات یوں ہی سردی میں کاٹ دی مگر کمبل کو ہاتھ نہیں لگایا۔

حسرتؔ نے سودیشی تحریک کو فروغ دینے کے لیے دیسی کپڑوں کی ایک دکان بھی کھول لی تھی، جس کے لیے نواب وقار الملک اور مولانا شبلی کے سفارش پر فاضل بھائی، کریم بھائی نے انھیں بہ طور قرض کپڑے کی فراہمی کی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول یہ دکان چل نکلی تھی مگر سیاست کے پے در پے انقلابات نے انھیں کبھی بنیا بن کر اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیا، اس لیے وہ نفعے سے زیادہ خسارہ ہی اٹھاتے رہے۔

ملک کی تحریکِ آزادی کی تاریخ میں حسرتؔ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انھوں نے برسرِ عام مکمل آزادی کا مطالبہ اس وقت کیا جب کہ مہاتما گاندھی جیسے رہنما بھی اسے قبل از وقت سمجھتے تھے۔ یہ دسمبر سنہ 1920ء کے اواخر یا جنوری سنہ **1921**ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس احمد آباد میں ہو رہا تھا۔حسرتؔ نے اس موقعے پر سبجیکٹ کمیٹی کی میٹنگ میں آزادیِ کامل کی تجویز پیش کی اور جب وہاں اسے منظوری نہ ملی تو اسے اجلاسِ عام میں پیش کرنے کا اعلان کر دیا۔ وقت آنے پر انھوں نے اس اعلان پر عمل بھی کر دکھایا لیکن وہاں بھی انھیں اس کی تائید کرنے والا کوئی شخص میسّر نہ آیا۔ بعد میں سنہ 1929ء میں کانگریس کے لاہور اجلاس کے موقعے پر یہی تجویز پنڈت جواہر لال نہرو نے پیش کی اور اسے منظور کر لیا گیا۔

دسمبر سنہ 1919ء میں گاندھی جی کے مشورے پر مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد وائسرائے سے ملاقات کے لیے گیا۔حسرتؔ بھی اس وفد میں شامل تھے۔گفتگو کے بعد جب وائسرائے سے وداعی ملاقات اور ہاتھ ملانے کا وقت آیا تو

حسرتؔ ان عوائدِ رسمیہ کی پروانہ کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ باہر نکل آئے۔

حسرتؔ سنہ 1946ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کان پور سے اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے اور اسی واسطے سے دستور ساز اسمبلی تک پہنچے تھے۔ جب جناح صاحب نے مسلم لیگ کے اراکین کو دستور ساز اسمبلی سے نکل آنے کا حکم دیا تو حسرتؔ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ چناں چہ وہ آخر تک پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ اس کی کارروائیوں میں حصّہ لیتے رہے لیکن جب آئین مکمل ہو گیا اور اس کا مسوّدہ اراکین اسمبلی کے سامنے دستخط کے لیے پیش کیا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر اس سے عدمِ اتفاق کا اظہار کرنے میں مطلقاً کسی تامّل سے کام نہیں لیا کہ اس میں ملک کو اشتراکی، جمہوری وفاق کا درجہ نہیں دیا گیا ہے، اس لیے یہ ہندوستانی عوام کی توقعات پوری کرنے میں کامیاب نہ ہوگا۔

اپنی عام زندگی ہی میں نہیں، دستور ساز اسمبلی کی رکنیت کے زمانے میں بھی حسرتؔ کا رہن سہن نہایت عامیانہ بلکہ درویشانہ و قلندرانہ رہا۔ سفر کے لیے ریلوے کے تھرڈ کلاس کو کوئی پر ہجوم ڈبّہ، قیام کے لیے مسجد کا گوشۂ عافیت، کھانے کے لیے خشک روٹی اور کوئی معمولی سبزی بلکہ کبھی کبھی نمک کے پانی میں ترکیے ہوئے سوکھے ٹکڑے، پہننے کے لیے موٹی کھادی کا کرتا، پائجامہ اور ایک ملگجی سی شیروانی اور دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے پرانی سی ایک چھتری اور اس سب کے ساتھ قناعت و بے نیازی کا یہ عالم کہ دستورِ عام کے برخلاف سفر خرچ اور بھتّے کے نام پر ایک پیسے کی رعایت بھی نا قابلِ قبول۔ یہ شان تھی مادرِ وطن کے اس جیالے سپوت کی جسے آج ہم صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں اور وہ بھی محض درسیات کے حوالے سے یا غزل سرائی کی اس روایت کی بدولت جسے موسیقی کے سہارے قبولِ عام حاصل ہوا ہے۔ اردو زبان سے بے اعتنائی اور اس کے نتیجے میں اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت سے بے گانگی و بے خبری ہماری نسلِ نو کو زوال کی جن پستیوں تک لے آئی ہے، یہ اس کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

مولانا حسرتؔ موہانی سب کو کھری کھری اس لیے سناتے تھے کہ ان کا دامن تمام گندگیوں سے پاک تھا۔ جنگ آزادی کے نڈر مجاہد تھے۔ سودیشی تحریک کے ہم نوا و پیروکار تھے مگر آزادی ملنے کے بعد اپنی خدمات کا صلہ کبھی نہیں مانگا اور نہ کھدر پوشی کی قیمت مانگی۔ نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا اور نہ کبھی کسی سے کچھ طلب کیا۔ وہ آزاد منش تھے اور سب لوگوں کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانا اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ ان کا سر صرف خدا کے آگے سر نگوں ہوتا تھا۔ 1950ء میں مولانا حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے واپسی میں پاکستان میں رک گئے ان کے نیاز مندوں نے خواہش ظاہر کی بلکہ آرزومندی کا اظہار کیا کہ وہ پاکستان ہی میں رُک جائیں۔ مولانا کا جواب تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو برے وقت میں بے یار و مددگار چھوڑ کر میں یہاں آرام کی زندگی بسر کروں ایسا نہیں ہو

سکتا۔ان کا خیال تھا کہ بہت سے لوگ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور دنیاوی فائدوں سے بہرہ ور ہوئے لیکن روز محشر ،لوگ ان سے پوچھیں گے کہ بتاؤ جب ہم مصیبت میں گرفتار تھے تم کیا کر رہے تھے۔مولانا حسرتؔ موہانی کے خیال میں کسی مل کا مالک ہونا، کوئی کوٹھی الاٹ کرانا، دینا وی مال و دولت حاصل کرنا زندگی کا مقصد نہیں ہوسکتا۔ان چیزوں کے بدلے میرے ذمے ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت ہے جو میں اپنے طور پر سرانجام دے رہا ہوں۔اللہ میری اس خدمت کو قبول فرمائے۔مولانا خدا ترس بزرگ تھے، سادہ اور صاف دل انسان تھے۔فریب، مکّاری اور ریاکاری ان کو چھو تک نہیں سکتی تھی۔ہمیشہ راضی بہ رضا رہتے تھے۔

حسرتؔ موہانی کی زندگی حرکت و عمل ، جرأتِ رندانہ ،اللہ اور اس کے رسول پر کامل ایمان و ایقان ، دنیاوی طاقت کے سامنے سینہ سپر ہو جانے اور آزادی تحریر و تقریر سے عبارت ہے۔ان کا ذہن باغیانہ تھا اس لیے کبھی Career بنانے کی فکر نہیں کی۔مجنوں گورکھ پوری نے لکھا ہے کہ:۔

**''کالج کے جتنے اعزاز تھے وہ سب حسرتؔ کو حاصل تھے مگر حسرتؔ کی خودداری نے ملازمت کی ذلت گوارا نہیں کی اور انھوں نے صحافت کا آزاد پیشہ اختیار کیا۔''**

حسرتؔ نے ہندوستان کے آسمانِ سیاست پر بے باکی ، جرأت رندانہ اور سامراجی قوتوں سے سیدھے سیدھے ٹکرانے کی جو روایت قائم کی اس نے ان کو اور ان کے متعلقین کو بہت اذیتیں دی ہیں اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو بیگم حسرتؔ نے مولانا کی گرفتاری کے بعد لکھا تھا:۔

**''میں نہایت رنج کے ساتھ عرض کرتی ہوں کہ کل دو پہر کو یکا یک پولیس نے حسرتؔ کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا بعد کو مکان دوکان کی تلاشی ہوئی لیکن اللہ کے فضل سے کچھ تھا ہی نہیں ،کیا نکلتا۔پھر بھی وہ بہت سے ردی خطوط مکان سے دوکان سے اس قسم کے تجارتی کاغذات لے گئے۔''**

بیگم حسرت نے اور بھی خطوط وقتاً فوقتاً مولانا عبدالباری کو لکھے ہیں۔ان خطوط نے ان کی پریشانیوں اور حسرتوں کا ذکر و بیان ہے۔متین صدیقی نے ان خطوط کے حوالے سے لکھا ہے:۔

**''ان خطوط کا یہ پہلو خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ ان کی وساطت سے بیگم حسرتؔ کی کسمپرسی کا علم ہونے کے علاوہ ہمیں اس کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس دور میں عام سماجی و سیاسی معاشرے میں بے وفائیت کی حد تک بزدلی کارفرما ہوگئی**

تھی۔ بعض بیرسٹروں نے جو حسرتؔ کے دوست بھی تھے اور آگے چل کر ملک کی قومی زندگی میں نمایاں ہوئے۔ حسرتؔ کی مسل کو ہاتھ لگانے سے گریز کیا۔ ایک صاحب نے تو صاف معذرت کر لی اور دوسروں نے لیت ولعل سے کام لیا۔ اس تاریک ماحول میں روشنی کی صرف ایک کرن مولانا آزاد کی ذات میں آتی ہے جنھوں نے خود نظر بند ہونے کے باوجود کلکتہ سے ایک بیرسٹر کا انتظام کیا اور فیس وغیرہ خود ادا کی جس نے جھانسی جا کر مقدمہ کی پیروی کی۔''

## 3.4: حسرتؔ موہانی بحیثیتِ صحافی

مولانا حسرتؔ موہانی کی صحافتی زندگی کا آغاز 1903ء میں رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' سے ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی زمانے میں ان کو وکٹوریہ کالج گوالیار میں ریاضی اور عربی کے پروفیسر کا آفر ملا مگر انھوں نے اس کو ٹھکرا دیا۔ اس طرح ملازمت کی زندگی پر صحافت کی آزاد زندگی کو ترجیح دی۔ حسرت موہانی کی ذہانت اور علمیت کا سکّہ ان کے احباب اور ہم درسوں پر بیٹھا تھا سب ان کا لوہا مانتے تھے۔ چنانچہ ان کے ہم جلیس سید سجاد حیدر یلدرم نے لکھا ہے کہ:۔

''بلا کے ذہین اور طباع تھے۔ درس کی کوئی انگریزی کتاب شاید انھوں نے دوسری مرتبہ نہیں پڑھی اور اس بارے میں مخالفین تعلیم انگریزی اور ان میں اتنا ہی فرق تھا کہ جہاں وہ قطعاً انگریزی پڑھنے کو کفر سمجھتے تھے یہ کسی صیغۂ فرنگ پر دوسری مرتبہ نگاہ ڈالنا گناہ جانتے تھے اس لیے ان کو کبھی انگریزی پڑھنا لکھنا نہ آیا تھا۔ سائنس وغیرہ علوم سے بھی ان کی طبیعت کو بیگانگی سی تھی اور گو ایک امر اتفاقی سے مجبور ہو کر انھوں نے بی۔ اے میں ریاضی پڑھی مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کا سننا نفاست پسند طبقوں کو ناگوار گذرے کہ اس موذی اور مسلمان کش مضمون کو انھوں نے صحت خانہ سے باہر کبھی بہ رضا و رغبت نہیں پڑھا۔ اس پر بھی وہ امتحان میں ناکام نہیں رہے۔''

حسرتؔ موہانی ''اردوئے معلیٰ'' کے ذریعہ انگریزی حکومت کا تختہ پلٹنے اور سودیشی کا پرچار اس دور میں کر رہے

تھے۔ اس وقت سیاست اور صحافت دونوں میں آزادی کا تصور پیش کرنا کار محال تھا۔ مگر حسرتؔ موہانی نے کالج کی ملازمت کو ٹھکرا کر اس آواز کو بلند کر رکھا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ''اردوئے معلیٰ'' ادبی اور سیاسی دونوں اعتبار سے ایک بے مثال رسالہ تھا اس کو بہت جلد شہرت مل گئی ہندوستان کے غفلت شعار لوگوں کو غلامی سے نجات دلانے اور انگریزوں کے ظلم وستم سے آزاد کرانے میں حسرتؔ موہانی اور ان کے رسالے ''اردوئے معلیٰ'' نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ حسرت موہانی نے اپنے رسالہ کے ذریعہ حکومت کی بے جا خوشامد پسندی کو بے نقاب کیا۔ اس دور میں حسرتؔ موہانی کے بے باک صحافت نے لوگوں کو نہ صرف یہ کہ تحیر میں ڈال دیا تھا بلکہ ان کو ''دیوانہ ملاّ'' اور ان کے رسالے کو ''گمراہ کن'' جیسے القاب سے نوازا جاتا تھا۔

ابھی ''اردوئے معلیٰ'' کو جاری ہوئے چار برسوں کا قلیل عرصہ ہوا تھا کہ اس پر پابندیاں عائد ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ 1908ء میں مولانا نے ایک مضمون بعنوان ''مصر میں انگریزوں کی پالیسی'' شائع کیا۔ اس مضمون کے شائع کرنے کے جرم میں ان کو دو سال قید اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی اگر چہ یہ مضمون علی گڑھ کے کسی طالب علم کا لکھا ہوا تھا مگر مولانا نے اس طالب علم کا نام پوشیدہ رکھ کر ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ مولانا نے جرمانہ ادا نہ کیا۔ نتیجتاً اس کی حصولیابی ان کے کتب خانہ سے کی گئی۔ کتب خانے میں بیش قیمت کتابوں کو محض ساٹھ روپئے میں نیلام کر دیا گیا ۔مولانا نے انگریزوں کی اس زیادتی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:۔

> ''اس جرمانے کی بدولت کتب خانہ ''اردوئے معلیٰ'' کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے جن کتابوں کو راقم الحروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہنچایا تھا جن کتابوں میں ایسے نادر و نایاب قلمی نسخے اور دواوین شعرا کے تھے جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی ان سب کو پولیس کے جاہل جوان تھیلیوں میں اس طرح بھر بھر کے لے گئے جس طرح لوگ لکڑی اور بھس لے جاتے ہیں ان کتابوں کی فہرست بنانا تو درکنار کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گذری اس کا ذکر کرتے ہوئے ہمارا دل دکھتا ہے۔ اس جبر وظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے۔''

جیل سے رہائی کے بعد مولانا نے ''اردوئے معلیٰ'' کو دوبارہ جاری کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے مخلص احباب سے مشورہ کیا۔ ان کے احباب نے مشورہ دیا کہ:۔

''اگر سیاسی مضمون ہوں تو مسلم لیگ کی مسلم پالیسی کے موافق ہوں چند دوستوں نے جو آزادانہ خیال تھے یہ رائے دی کہ اگر جمہور ہند کی ہم ہم خیالی منظور ہو تو کانگریس کے نرم فریق کی روش اختیار کی جائے۔''

مگر مولانا نے مصلحت کوشی کی اس روش کو قطعی ناپسند فرمایا اور جواب دیا:۔

''ہم پر ان نیک مشوروں اور مصلحت کوش صلاحوں کا شکریہ فرض ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔''

دوبارہ ''اردوئے معلیٰ'' جاری ہوا مگر مالی دشواریوں کی وجہ سے اس کے حجم، سائز اور سالانہ چندہ میں کمی کر دی گئی۔ اب سالانہ چندہ ایک روپیہ رکھا۔ شروع میں اس کے ساڑھے سات سو خریدار ہو گئے بعد میں کچھ لوگوں پر انگریزوں کا خوف طاری ہو گیا تو اس کے خریداروں میں کمی آ گئی اور اب تعداد پانچ سو رہ گئی۔ گویا سالانہ آمدنی پانچ سو روپئے کی ہوئی۔ اخبار کے مصارف منہا کر کے مولانا کو دس روپئے ماہانہ بچ جاتے تھے اسی میں وہ خوش رہتے تھے اور اعانت کی غرض سے وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔۔ غور طلب بات یہ ہے کہ وہ اپنے اخبار کے ذریعہ حریت پسندی اور ظلم کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے مگر کوئی ان کی مدد کو آگے نہیں آیا۔ اس کی وجہ سے شاید انگریزوں کے جبر و استبداد کا خوف ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ مطابع قانون کا پہلا حملہ بھی مولانا کے اخبار پر ہوا۔ سر جیمس مشن نے مولانا سے تین ہزار روپئے ضمانت کا مطالبہ کیا۔ غور فرمایئے کہ مولانا کا چھاپہ خانہ ایک کاٹھ کی مشین اور تین پتھر پر مشتمل تھا۔ بسا اوقات خود مولانا مزدوروں کی طرح مشین چلاتے تھے اور رسالے سے اتنی بڑی رقم بطور ضمانت طلب کرنے کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تھا پریس اور رسالے کو بند کرنا، سو پورا ہوا۔ مولانا نے ''اردوئے معلیٰ'' کو بند کر دیا اور اس کے آخری شمارے میں انگریزوں کے ذریعہ ڈھائے گئے ظلم و ستم کی طرف واضح اشارے کیے:۔

''اگرچہ ''اردوئے معلیٰ'' بند کر دیا گیا مگر میری زبان میرا دل اور میری قوت ہنوز آزاد ہے اور میں جس طرح پہلے کام کرتا تھا اب بھی خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لوں گا۔''

مولانا نے ''اردوئے معلیٰ'' میں اٹلی کے خلاف بائیکاٹ کا اعلان کیا تھا اور تقریروں وتحریروں سے وہ مسلمانوں کو اٹلی کے سامانِ آسائش خریدنے سے منع فرماتے تھے۔ حکومت نے جب ان کا پریس بند کر دیا تو مولانا کا جوش عمل اور زیادہ ہو گیا وہ تن تنہا اس تحریک کو فروغ دینے اور کامیاب کرنے میں لگ گئے چنانچہ ''اردوئے معلیٰ'' کی جگہ ''تذکرۃ الشعرا'' کے نام سے سہ ماہی رسالہ نکالا اور ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔

حسرتؔ موہانی کی صحافتی زندگی چار دہائیوں پر مشتمل ہے انھوں نے ''اردوئے معلیٰ''، ''تذکرۃ الشعرا اور مستقل رسالے ہفتہ وار، ماہنامہ اور روزنامہ جاری کیا۔ ''اردوئے معلیٰ'' رسالہ تھا ''تذکرۃ الشعرا بھی رسالہ تھا البتہ ''مستقل'' اخبار تھا اور پہلے روزانہ نکلتا تھا بعد میں سہ روزہ ہفتہ وار اور ماہنامہ ہوا اور سب سے آخر میں اس کی حیثیت ''اردوئے معلیٰ'' کے ضمیمہ کی ہوگئی۔ حسرتؔ موہانی کا مزاج ایسا تھا کہ وہ نہ مصلحت کوش ہو سکتے تھے اور نہ منافقانہ رویہ اختیار کر سکتے تھے۔ اپنے ضمیر اور دل کی آواز کی خلاف ورزی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صحافت ان کے لیے ہمیشہ خسارے کا سودا رہی۔

''اردوئے معلیٰ'' جولائی 1903ء میں جاری ہوا اور مارچ 1942ء تک جاری رہا۔ مئی 1908ء سے 1909ء تک اس کی اشاعت بند رہی اور علی گڑھ میں اس کا پہلا دور جون 1913ء میں ختم ہوا۔ دوسرا دور کانپور سے شروع ہوا اور جنوری 1925ء میں کانپور میں اس کا از سر نو احیا ہوا۔ یہ دور مارچ 1942ء تک کا ہے۔

''اردوئے معلیٰ'' جب جاری ہوا۔ اس وقت عبدالحلیم شررؔ کا رسالہ ''دلگداز'' اور سر عبدالقادر کا ''مخزن'' بہت مقبول رسالے تھے یہ دونوں بہت مقبول تھے مگر حسرتؔ موہانی نے ''اردوئے معلیٰ'' میں ایسی جدت طرازیاں کیں کہ بہت جلد یہ سب سے مقبول رسالہ ہو گیا اور انھوں نے اس کا دعویٰ بھی کر دیا:۔

**''ادبی حیثیت سے لاریب اردو کا کوئی رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''**

یہ محض حسرتؔ کا دعویٰ نہیں تھا بلکہ آل احمد سرور نے اس دعوے کی تصدیق ان لفظوں میں کی ہے:۔

**''جن رسالوں کے کارنامے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں ان میں ''دلگداز''، ''مخزن''، ''اردوئے معلیٰ''، ''زمانہ'' اور ''معارف'' ممتاز ہیں ان میں ''اردوئے معلیٰ'' کئی جہتوں سے سرفہرست ہے۔''**

''اردوئے معلیٰ'' میں ادب، سیاست، ثقافت، سائنس، جغرافیہ، تواریخ ہر موضوع پر مضامین شائع کیے جاتے

تھے اس لیے یہ ہر ذوق کے قاری کی تسکین کا سامان فراہم کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند شمارے نکلے تھے کہ اردو کے مایہ ناز شاعروں، ادیبوں، دانشوروں، اور اہل علم حضرات کا بھرپور تعاون اس کو حاصل ہو گیا۔ شاد عظیم آبادی امداد امام اثر، سجاد عظیم آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، خوشی محمد ناظر، مولانا حالی، علامہ شبلی، سجاد حیدر یلدرم، کشن پرشاد کنول جیسے شاعر ادیب، ناقد، سیاستداں اور دانشوروں نے اس میں اپنی تخلیقات بغرض اشاعت بھیجیں اور اس میں شائع ہونا اپنے لیے باعث فخر تصور کیا۔ اپنا سارا کلام اس میں شائع کرایا بعد میں انھیں دیوان کی شکل میں شائع کیا۔ ''اردوئے معلیٰ'' میں دوسرے رسائل کے مقابلہ میں صحت زبان کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ حسرتؔ موہانی کا خیال تھا کہ دبستان کا دور ختم ہو چکا ہے اور زبان و بیان کی غلطیوں پر گرفت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ پنجاب میں شعری و تنقیدی جدت طرازیوں کو تو وہ بہ نظر تحسین دیکھتے ہیں مگر زبان و بیان میں جدّت طرازی کو ناپسند فرماتے تھے۔ اس معاملہ میں انھوں نے علامہ اقبال کے خلاف بھی محاذ چھیڑ دیا تھا۔

''اردوئے معلیٰ'' میں سیاسیات عالم، جغرافیہ، پولیٹکل، سائنس، بائیلوجی، سوشولوجی، صحت عامہ، تعبیر خواب اور شطرنج کے کھیل سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ مضامین اکثر انگریزی سے ترجمہ ہوا کرتے تھے اس دور میں اردو کا کوئی دوسرا رسالہ اتنے گوناگوں مضامین شائع نہیں کرتا تھا اس کے ساتھ ہی ''اردوئے معلیٰ'' میں اردو کے اہم اور معتبر شعرا کا بیشتر کلام شائع ہوتا تھا ان میں کلاسیکی شعرا حسرتؔ موہانی کے ہم عصر شعرا اور نئے شعرا سب شامل تھے اس کے ساتھ ہی ''تذکرۃ الشعرا'' اور جو بعد میں ''اردوئے معلیٰ'' کا ضمیمہ ہو گیا تھا اس میں شعرا کے کلام کا انتخاب شائع ہوتا تھا۔ بعض اہم کتابیں قسط وار شائع ہوتی تھیں ان میں امداد امام اثر کی ''کاشف الحقائق'' بھی شامل ہے۔ رسالہ میں کس طرح عصری مسائل پر بحث چھیڑی جاتی تھی اس کا اندازہ اس اشتہار سے ہوتا ہے جو جنوری 1920ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

''ہم اپنے خیالات عام کریں گے۔''

حسرتؔ شاعر، مدبر، درویش صفت تو تھے مگر مزاج سیاسی پایا تھا۔ آغاز کار ہی سے وہ ذہنی طور پر اپنے کو کانگریس کے اصولوں سے قریب پاتے تھے۔ بال گنگا دھر تلک کے پیروکار تھے، اردوئے معلیٰ کا اجرا اسی مقصد سے کیا تھا کہ مسلمانوں کی ذہنی تربیت کریں۔ اس غرض سے برابر سیاسی مضامین شائع کرتے رہتے تھے اور کبھی کبھی مصیبت میں گرفتار بھی ہوتے تھے مگر کانگریس کی حمایت میں اس اعلان نے طوفان برپا کر دیا۔ ایم۔ او کالج کے طلبا کا ایک حلقہ حسرتؔ موہانی کا مخالف تھا اس نے طلبا کو ورغلا کر ان کے رسالے کا بائکاٹ کرایا۔ انھیں ہر طرح سے پریشان اور خوفزدہ

کرنے کی کوشش کی گئی مگر حسرتؔ تو ہر طوفان بلا کو دعوت دینا اپنا حق سمجھتے تھے وہ بھلا ان گیدڑ بھبکیوں سے کب خوفزدہ ہونے والے تھے چنانچہ انھوں نے صاف لفظوں میں اعلان فرمایا کہ:۔

''اردوئے معلیٰ کسی کے سہارے نہیں بلکہ اللہ کے سہارے نکالا گیا اس لیے انشاء اللہ بند نہیں ہوسکتا۔''

حسرتؔ پہلے مسلمان سیاسی لیڈر ہیں جو اپنے رسالے میں ایک مضمون بہ عنوان ''مصر میں انگریزوں کی پالیسی'' شائع کرنے کے

جرم میں جیل گئے۔ بہر حال انھوں نے جیل کی زندگی کو مشاہداتِ زنداں کے عنوان سے ''اردوئے معلیٰ'' میں بالاقساط شائع کیا۔ جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس ضمن میں انھوں نے لکھا:۔

''تقریباً چالیس روز کی کشمکش اور بے کار طوالت کے بعد آخر مقدمے کا وہی فیصلہ ہوا جو اس قسم کے مقدمات میں ہوتا ہے یعنی 14 اگست 1908ء سے قید سخت کا آغاز اس طور سے ہوا کہ کچہری سے واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگھیا، کرتا اور ٹوپی پہننے کے لیے ایک ٹکڑا ٹاٹ بچھانے کے لیے اور کمبل اوڑھنے کے واسطے اور ایک قدح آہنی بڑا ایک چھوٹا دیگر جملہ ضروریات کو دفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔ زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح سے راقم الحروف کے مناسب حال تھی۔ البتہ بحالت نیم برہنگی فریضۂ نماز کے ادا کرنے میں تکلف ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنی مجبوری اور بے بسی کے احساس نے اس کا خوگر بنا دیا۔ جیل کی سخت ترین مشقت چکّی سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا۔''

جس مضمون کی اشاعت کے جرم میں ان کو جیل کی سزا کاٹنی پڑی وہ ان کا لکھا ہوا نہیں تھا بلکہ ایک۔ام۔اے۔او کالج علی گڑھ کے کسی طالب علم کا لکھا ہوا تھا۔ رسالے میں شائع کرتے وقت انھوں نے اس کا نام نہیں لکھا تھا اور نہ کبھی اس راز کو ظاہر کیا۔ 1909ء میں حسرتؔ موہانی نے دوبارہ رسالے کو جاری کیا۔ ان کے مخالفین نے سازش کر کے ان سے تین ہزار کی ضمانت طلب کروادی اور رسالہ بند ہوگا۔ 1915ء کے جولائی ماہ میں انھوں نے سہ ماہی رسالہ ''تذکرۃ الشعرا'' نکالا اس کا ڈکلریشن داخل نہیں کیا تھا اس لیے اس کو کتاب کا نام دیا گیا۔ اس ضمن میں انھوں نے لکھا:۔

''1913ء میں حکومت نے اردو پریس سے تین ہزار کی ضمانت طلب کی جو ادا نہیں کی جا سکی اس لیے اردو پریس کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے ساتھ ''اردوئے معلیٰ'' بھی بند ہو گیا۔ سیاسی حیثیت سے ''اردوئے معلیٰ'' اپنا فرض پورا کر چکا تھا چنانچہ اس کا اظہار آخری شمارے میں کر دیا گیا ہے۔ البتہ ادبی حیثیت سے اس کے بہت مقاصد نا کام رہے تھے جن کی تکمیل کے لیے تذکرہ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔''

تذکرۃ الشعرا کا تیسرا شمارہ لوگوں کو بھیجا بھی نہ گیا تھا کہ سیاسی بنیاد پر حسرتؔ موہانی نظر بند کر دیے گئے۔ چوتھا شمارہ 1919ء میں شائع ہوا مگر اب پابندی سے شائع نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس کے کل سات شمارے شائع ہوئے۔

حسرتؔ سے جب پریس کی ضمانت کی گئی تو مولانا آزاد نے ہی اس کے خلاف صدائے احتجاج اپنے اخبار ''الہلال'' کے شمارے

(21 مئی 1913ء اور 28 مئی 1913ء) میں بلند کی اور حکومت ہند کی لغت و ملامت کی نیز حسرتؔ موہانی کی جرأت و ہمت کی تعریف و توصیف کی۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ حسرتؔ موہانی کے رسالے اور اخبار انگریزی حکومت کے لیے چیلنج تھے وہ خود کسی آندھی سے کم نہ تھے اور ان کی صحافت آگ کے شعلے تھے جو ایک طرف حکومت ہند کے دامن کو جلا کر خاک کیے ڈال رہے تھے اور دوسری طرف عام ہندوستانیوں کے دل میں آزادی کی آگ بھر رہے تھے۔ صحافت حسرتؔ موہانی کے لیے عبادت و ریاضت کا درجہ رکھتی تھی وہ نہ کسی سے ڈرتے تھے اور نہ کسی بات کا خوف دل میں لاتے تھے۔ وہ شمشیر برہنہ تھے جو لفظوں کے وار سے مخالف کی ہر دلیل کاٹ دیا کرتے تھے ایسی صحافت وہی کر سکتا ہے جو یہ کہنے کی جرأت اپنے اندر پاتا ہو کہ:

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

## 3.5: اپنی معلومات کی جانچ:۔

1۔ حسرتؔ موہانی کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

(الف) 1818ء میں (ب) 1918ء میں (ج) 1819ء میں (د) 1881ء میں

2۔ حسرتؔ موہانی کو للت پور جیل میں کس سنہ میں بند کیا گیا؟

(الف) 1917ء میں (ب) 1916ء میں (ج) 1817ء میں (د) 1919ء میں

3۔حسرتؔ موہانی جب جیل میں تھے تو بیگم حسرتؔ کو منی آرڈر سے رقم کس نے بھیجی؟

(الف)ڈاکٹر اصغر (ب)ڈاکٹر قمر (ج)گڈاکٹر انصاری (د)ڈاکٹر رحمت

4۔مکمّل آزادی ہند کی تجویز حسرتؔ موہانی نے کب اور کہاں پیش کی تھی؟

(الف)1921ء احمد آباد (ب)1936ء لکھنؤ (ج)1942ء کلکتہ (د)1946ء ممبئی

5۔23 جون 1908ء کو حسرتؔ موہانی کے خلاف بغاوت پر اکسانے کے جرم میں کتنے سال کی قید بامشقت کی سزا ہوئی؟

(الف)5 سال (ب)3 سال (ج)6 سال (د)2 سال

6۔''اردوئے معلیٰ'' کس سنہ میں جاری ہوا؟

(الف)1900ء میں (ب)1904ء میں (ج)1903ء میں (د)1908ء میں

7۔حسرتؔ موہانی کو جیل میں کن کاموں پر مامور کیا گیا تھا؟

(الف)صاف صفائی (ب)چکّی پیسنے (ج)پانی بھرنے (د)کھدائی کرنے

8۔کس مجاہدِ آزادی نے سودیشی اسٹور کھولا تھا؟

(الف)محمد علی جوہر (ب)ابوالکلام آزاد (ج)شوکت علی (د)حسرتؔ موہانی

9۔1908ء میں کس مضمون کے اشاعت پر حسرتؔ موہانی کو قید ہوئی؟

(الف)مصر میں انگریزوں کی پالیسی (ب)انگریزوں کے عزائم (ج)انگریزوں کی ہندوستان میں آمد (د)انگریزوں کی سازش

10۔مولانا حسرتؔ موہانی حج بیت اللہ کے لیے کس سنہ میں تشریف لے گئے؟

(الف)1946ء میں (ب)1945ء میں (ج)1950ء میں (د)1941ء میں

سوال نمبر 11۔سہ ماہی رسالہ ''تذکرۃ الشعرا'' کا رسم اجرا کب عمل میں آیا؟

(الف)جنوری 1915ء (ب)اگست 1916ء (ج)فروری 1916ء (د)جولائی 1915ء

سوال نمبر 12۔حسرتؔ کی تیسری اور آخری گرفتاری تحریکِ ترک موالات کے سلسلے میں کب ہوئی تھی؟

(الف)22 اپریل 1921ء (ب)22 اپریل 1922ء (ج)21 جنوری 1923ء (د)22 فروری 1924ء

سوال نمبر 13۔1946ء میں حسرتؔ موہانی مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کہاں کے اسمبلی ممبر منتخب ہوئے؟

(الف) کانپور (ب) جونپور (ج) لکھنؤ (د) اعظم گڑھ

سوال نمبر 14۔ حسرتؔ موہانی کی صحافتی زندگی کا آغاز کس سنہ سے ہوتا ہے؟

(الف) 1946ء سے (ب) 1945ء سے (ج) 1903ء سے (د) 1950ء سے

سوال نمبر 15۔ حسرتؔ موہانی نے اٹلی کے خلاف بائیکاٹ کا اعلان کس رسالہ کے ذریعہ کیا تھا؟

(الف) اردوئے معلیٰ (ب) تذکرۃ الشعرا (ج) لسان الصدق (د) معارف

## 3.6: خلاصہ

مولانا حسرتؔ موہانی کی شخصیت کے متعدد پہلو ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر، ادیب، صحافی اور سرفروش مجاہد آزادی تھے۔ حسرتؔ موہانی زمانۂ طالب علمی سے ہی انگریزوں کے خلاف بغاوت اور سرکشی کے علاوہ جنگ آزادی کے متوالوں کی حمایت کرنے لگے تھے۔ ان کے مجاہدانہ جوش و جذبے نے ڈپٹی کلکٹری اور کالج کی پروفیسری پر قلندری اور درویشی کو فوقیت دی اور آرام و آسائش کی زندگی کو تج کر صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور 1903ء میں ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ یہ ماہنامہ جنگ آزادی کی تحریک کو شعلۂ جوّالہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کے نتیجے میں کئی بار قید بامشقت اور جرمانے کی سزا دی گئی، چکّی کی مشقتیں برداشت کیں، ان کے کتب خانے کو تباہ برباد کیا گیا اور جرمانے کی رقم ادا کرنی پڑیں۔ حسرتؔ موہانی کانگریس کے شدّت پسند دھڑے سے وابستہ تھے۔ سودیشی تحریک کو عوامی تحریک بنانے میں حسرت موہانی نے جو کردار ادا کیا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ وہ شروع سے آخر تک دیسی اور معمولی کپڑے استعمال کرتے رہے اور کبھی بھی ولایتی کپڑے کو ہاتھ تک لگانا گوارا نہیں کیا۔ تحریک آزادی کی تاریخ میں حسرتؔ موہانی کو یہ شرف حاصل ہے کہ مکمّل آزادی کا مطالبہ سب سے پہلے انھوں نے ہی کیا تھا۔

حسرتؔ موہانی کی زندگی نہایت سادہ، بے ریا اور قناعت پسند تھی۔ آزادی کے بعد اسمبلی کی رکنیت کے باوجود درویشانہ زندگی کو ہمیشہ گلے لگایا۔

## 3.7: معروضی سوالات کے جوابات

1۔(د)، 2۔(ب)، 3۔(ج)، 4۔(ج)، 5۔(د)، 6۔(ج)، 7۔(ب)، 8۔(د)، 9۔(الف)، 10۔(ج)، 11۔(د)، 12۔(ب)، 13۔(الف)، 14۔(ج)، 15۔(الف)

## 3.8: نمونۂ امتحانی سوالات

**سوال نمبر 1۔** حسرتؔ موہانی کی حیات زندگی پر روشنی ڈالیے؟

**سوال نمبر 2۔** سودیشی اندولن کے فروغ میں حسرتؔ موہانی کی خدمات پر اظہار خیال کیجیے؟

**سوال نمبر 3۔** حسرتؔ موہانی کی قید و بند کی زندگی پر مضمون لکھیے ؟

**سوال نمبر 4۔** اردو صحافت کے فروغ میں حسرتؔ موہانی کے کردار پر روشنی ڈالیے؟

**سوال نمبر 5۔** حسرتؔ موہانی کے اخلاق و کردار پر ایک مضمون سپرد قلم کیجیے؟

## 3.9: فرہنگ

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| صعوبتیں | مصیبتیں، دشواریاں | اثاثہ | اسباب، پونجی، سرمایہ |
| ندرت | انوکھا پن | مضمرات | پوشیدہ، چھپا ہوا |
| تحفظ | بچاؤ، حفاظت، احتیاط | حمایت | طرف داری |
| آسائش | آرام، چین، راحت | انفرادیت | خودی، انانیت |
| معتدل | اوسط، درمیانی، مناسب حال | شورش | شعر و غوغا، فتنہ و فساد |
| عتاب | عذاب | تخفیف | کمی، گھٹاؤ، ہلکا کرنا |
| احتیاط | بچنا، سوجھ بوجھ | انتخاب | چُننا، پسند کرنا |
| پیشوا | رہنما | اعتماد | یقین، بھروسا |
| متزلزل | لرزنے والا، کانپنے والا | سابقہ | اگلا، اگلے زمانے کا |
| خطیر | بڑا، کثیر، بہت | منسوخ | رد کیا گیا، ترک کیا گیا |
| تصفیہ | صاف کرنا، واضح کرنا | جرأت | دلیری، شجاعت، حوصلہ |
| مستزاد | بڑھایا گیا، زیادہ کیا گیا | بہیمانہ سلوک | جانوروں جیسا برتاؤ |
| عزم | ہمت، حوصلہ | استقامت | استقلال، کسی بات پر مضبوطی سے قائم رہنا |

| | | | |
|---|---|---|---|
| نادر | کمیاب،عمدہ،عجیب | نایاب | نادر،کمیاب،کم میسر ہونے والی چیز |
| اذیت | تکلیف،دکھ | حامی | حمایتی،مددگار |
| صوم وصلوۃ | روزہ،نماز | مرقع | تصویروں کی کتاب،لاجواب |
| فراموش | بھولا ہوا | وطن پرستی | وطن |
| حرّیت پسندی | آزاد پسندی | بےتعصبی | غیر جانب داری |
| معتکف | گوشہ نشین | سفارش | کسی کے حق کلمۂ خیر |
| گوشۂ عافیت | امن کی جگہ | قناعت | تھوڑی چیز پر راضی اور خوش ہونا |
| بےاعتنائی | بے پروائی | ترجیح | فوقیت،برتری |
| موذی | ایذا دینے والا،ظالم | روش | چلن،طور،طریقہ |
| حجم | موٹائی | استبداد | خودمختاری،ظلم،دباؤ |
| مسترد | ردکیا گیا،واپس کیا | استقلال | ضبط وتحمل،ثابت قدمی |
| لغزش | غلطی،بھول چوک | الہام | قدرتی رہنمائی |
| رعایت | لحاظ،توجہ | زندانی | قیدی،گرفتار شدہ مجرم |

## 3.10: سفارش کردہ کتابیں

1۔حسرت موہانی: حیات وخدمات۔ڈاکٹر احمر لاری